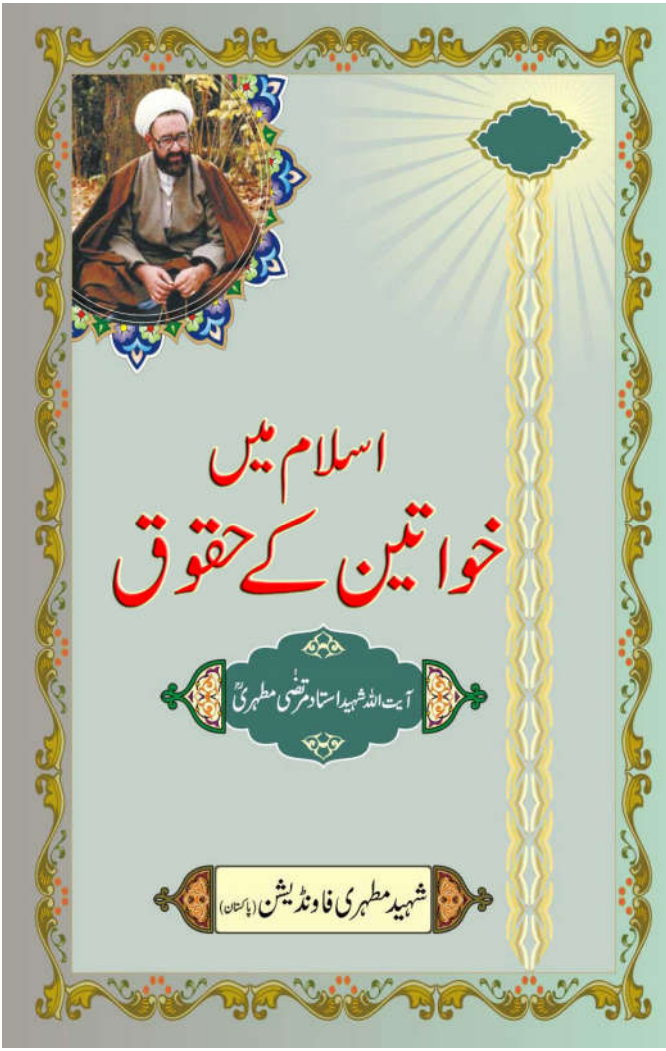
اسلام میں
خواتین کے حقوق
آیت اللہ شہید استاد مرتضیٰ مطہریؒ
شہید مطہری فاونڈیشن (پاکستان)

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب	اسلام میں خواتین کے حقوق
تالیف	شہید آیت اللہ مرتضیٰ مطہریؒ
ترجمہ	مولانا مرتضیٰ حسین صدرالا فاضلؒ
ترتیب وتصحیح	قلب علی سیال
کمپوزنگ	الحمد گرافکس لاہور۔فضل عباس سیال
ناشر	شہید مطہری فاؤنڈیشن

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

LG-3 بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرض ناشر

''شہید مطہری فاؤنڈیشن'' دینی مواد کی اشاعت کے سلسلہ میں نیا ادارہ تشکیل دیا گیا ہے۔ادارے کا مطمع نظر عوام کو بہتر اور سستے ترین انداز میں دینی مواد بذریعہ کتب اور انٹرنیٹ فراہم کرنے کا پروگرام ہے۔اللہ تعالیٰ ادارہ ھذا کو اس عظیم کام کی انجام دہی کیلئے بھرپور وسائل عطا فرمائے۔

زیرِ نظر کتاب ''اسلام میں خواتین کے حقوق'' شہید آیت اللہ مرتضیٰ مطہریؒ کی سعی جمیل کا نتیجہ ہے۔مرد کی طرح عورت بھی مختلف علوم وفنون میں موضوع بحث ہے،ادب ،تاریخ،نفسیات،فزکس،ہیومن،سائنس،معاشرہ اور قانون میں اس کی ذات اور اس کی حیثیت پر کئی زاویوں سے گفتگو ہے۔پھر مذاہب وادیان بجائے خود ایک باب ہے مشرق ومغرب ''عورت'' کی سمتیں اور دو نگاہیں اور دو نظریے لئے ہوئے حاضر بحث ہیں۔عورت کے حقوق اسلام میں کیا ہیں۔اس کا درجہ اسلام نے کیا بتایا ہے؟اس کے فرائض کیا ہیں؟ کتابِ ھذا میں ایسے ہی سوالات کے جوابات ہیں؟ قارئین حضرات اس کتاب سے بھرپور استفادہ کریں۔

معراج کمپنی'' کے پلیٹ فارم سے کتابِ ھذا مؤمنین کی خدمتِ اقدس میں پیش کی جارہی ہے۔ادارہ نے کتاب ھذا کی اشاعت میں پوری توجہ سے کام لیا ہے،تاہم اس بارے میں آپ کی ہمدردانہ آراء ہمارے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ہمیں توقع ہے کہ حسبِ سابق آپ ہماری اس مفید علمی پیشکش کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔والسلام

شہید مطہری فاؤنڈیشن

فہرست مضامین

حرف اول 18
مصنف 18
شیخ مرتضیٰ مطہری 18
کتاب 22
نظام حقوق زن در اسلام 22
تصانیف شہید مطہری: 22
جہاں بینی اسلامی بین الاقوامی میں اسلام کی نظر سے متعلق کتابیں: 23
علوم اسلامی کا تعارف 24
تعلیم و تربیت 24
خواتین کیلئے 24
کتاب کا اسلوب اور زبان 27
ترجمہ کیوں؟ 28
انقلاب اسلامی نے خواتین کو نیا کردار دیا 28
مقدمہ 29
خاندانی ذمہ داریاں اور نظام حقوق خواتین 30
قرآن کریم 44
پیش گفتار 49
عائلی روابط کے بین الاقوامی مشکلات 51

آزاد رہیں یا مغرب کی تقلید کریں؟	52
تاریخی جبر	53
اساسی قانون اور ہم	54
ایرانی معاشرے کے مذہبی رجحانات	55
آغاز کتاب	57
پہلا حصہ	57
خواستگاری	57
خواستگاری	58
کیا مرد کی طرف سے خواستگاری عورت کی توہین ہے؟	58
مرد کی فطرت طلب و نیاز عورت کی فطرت جلوہ و ناز	59
مرد خریدار وصال ہے عورت کا خریدار نہیں	61
حیثیت واحترام خواتین کے تحفظ کا دانشمندانہ و نفیس طریقہ منگنی ہے	62
چالیس قانونی نکات مرتب کرنے والے کو قانون مدنی سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی!	63
دوسرا حصہ	67
نکاح موقت (متعہ)	67
نکاح موقت (ا)	69
دائمی اور مؤقت	70
متعہ اور آج کی زندگی	72
آج کا جوان اور بلوغ و بحران جنسی کا عہد	73
وقتی رہبانیت، آزمائشی شادی یا نکاح موقت (متعہ) کون بہتر ہے	73
کیا متعہ بہتر ہے؟	75

آزمائشی شادی	75
رسل اور نظریہ ازدواج موقت	76
نکاح مؤقت (۲)	79
تاریخ عقائد نویسی	79
اعتراضات وجوابات	80
جواب	81
انتقاد۔ چالیس نکات پر	87
مضمون نگار کی نظر میں	88
نکاح موقت اور حرم سرا (۳)	90
حرم سرا سازی کے معاشرتی اسباب	91
کیا ازدواج موقت ہوس رانی کیلئے جواز مہیا کرتا ہے؟	93
آج کی دنیا حرم سرا!	64
ازدواج موقت سے خلیفہ کی ممانعت	65
حضرت علی علیہ السلام کی ایک حدیث	99
تیسرا حصہ	101
عورت اور معاشرتی آزادی	101
سرنوشت کے انتخاب میں آزادی	102
جنم سے پہلے نکاح	103
لڑکیوں کا ادلہ بدلہ:	105
رسول اللہؐ نے اپنی صاحب زادی حضرت زہراؑ کو انتخاب شوہر میں آزاد رکھا	105
اسلامی تحریک میں خواتین کا انقلاب سفید	105

باپ کی اجازت	107
اسلام کی نظر میں چند باتیں طے شدہ ہیں	107
مرد بندہ شہوت اور عورت اسیر محبت ہے	109
مضمون نگار کہتے ہیں:	112
چوتھا حصہ	116
اسلام اور بدلتی زندگی	116
اسلام اور بدلتی زندگی (۱)	117
زمانے کے تقاضے	117
اسلام اور وقت کے تقاضے	119
اعتراضات	122
خود زمانہ کس سے منطبق ہوتا ہے؟	123
انطباق یا نسخ؟	124
اسلام اور بدلتی زندگی (۲)	129
انسان، معاشرہ اور عقل	129
منجمد اور جاہل لوگ	131
قرآنی تمثیل	133
ویل ڈیورانٹ کہتا ہے:	133
اسلام اور بدلتی زندگی (۳)	138
نمبر1	138
قوانین اسلام کے جوڑ اور موڑ اور ان کے راز و اسرار	138
جسم و صورت کے اختلاف سے زیادہ روح و حقیقت پر توجہ ہے	140

مستقل ضرورتوں کیلئے پائیدار قانون اور ادلتی بدلتی ضرورتوں	141
رسم الخظ کی تبدیلی کا مسئلہ	145
ہیٹ پہننا حرام نہیں دم چھلا بننا حرام ہے۔	146
اہم اور اہم تر مسئلہ	147
’’ویٹو‘‘ کا حق رکھنے والے قوانین	148
حاکم کے اختیارات	148
اصل اجتہاد	148
پانچواں حصہ	151
قرآن کی نظر سے عورت کا انسانی درجہ	151
قرآن کی نظر سے عورت انسانی درجہ	153
عائلی حقوق کے بارے میں اسلام کا خاص فلسفہ	153
برابری یا مشابہت	155
اسلام کی جہان بینی میں عورت کا مرتبہ	157
مساوات؟ ہاں مشابہت؟ نہیں	163
حقوق انسانی کا منشور فلسفہ قانون نہیں ہے	169
فلسفہ ’’کوپن‘‘ سے ثابت نہیں کیا جا سکتا	171
یورپ میں حقوق نسوان کی تاریخ پر ایک نظر	172
انسان کی حیثیت اور حقوق	176
منشور حقوق انسانی کے اہم نکات	177
مقام واحترام انسان	179
مغربی فلسفوں میں انسان کا تنزل اور گراوٹ	180

مغرب انسان کے بارے میں تضاد وتناقض سے دوچار ہے	183
مغرب نے خود کو بھی بھلا دیا اور خدا کو بھی	186
چھٹا حصہ	188
عائلی حقوق کی فطری بنیادیں	188
عائلی حقوق کی فطری بنیادیں (۱)	189
طبیعی حقوق اور طبیعت کی مقصدیت میں ربط	190
معاشرتی حقوق	191
عائلی حقوق	193
عائلی حقوق کی فطری بنیادیں (۲)	195
خاندانی زندگی فطری ہے یا۔ باہمی مفاہمتی زندگی؟	196
چار عہدوں کا مفروضہ	197
عورت فطرت کے زاویہ نظر سے	202
ساتواں حصہ	205
عورت ومرد کے فرق	205
عورت ومرد میں فرق واختلاف (۱)	206
نقص وکمال یا تناسب	207
نظریہ افلاطون	208
ارسطو۔ افلاطون کے مقابلے میں	210
آج کی دنیا کی نظر	211
دورنگی	212
نفسیاتی فرق	213

احساسات کا تناظر 214

عورت مرد کے فرق (۲) 215

پروفیسر ریک کے نظریات 215

شاہ کار خلقت 217

خواہشات سے بلند تر رشتہ 218

زن و مرد کے باہمی نفسیات و احساسات 220

ماہر نفسیات خاتون کا نظریہ 222

جلد بازی کا انقلاب 223

ویل ڈیورینٹ کا نظریہ 224

آٹھواں حصہ 229

مہر اور زنان و نفقہ 229

مہر اور نفقہ (۱) 231

مہر کا تاریخچہ 232

مہر۔ نظام قانون اسلامی میں 234

تاریخ پر ایک نظر 235

مہر کا حقیقی فلسفہ 237

قرآن میں مہر 241

حیوانات میں احساسات کا فرق 242

غیر شرعی شادیوں میں ہدیے اور تحفے 243

فرنگی کا عشق اس کی شادی سے بہتر ہے 243

مہر اور نفقہ (۲) 245

جاہلیت کے رسم ورواج اسلام نے منسوخ کر دیے	245
مہر کا نظام خاص اسلام کا نظام ہے	249
آئین فطرت	250
نقد ونظر	252
مہر ونفقہ (۳)	258
نفقہ	258
انیسویں صدی کے آخری حصے تک فرنگی عورت کی محرومی	259
یورپ نے عورت کو اچانک اقتصادی خودمختاری کیوں دے دی	260
قرآن اور خواتین کی اقتصادی آزادی	261
ایک تناظر	263
انتقاد اور جواب	264
نفقہ کی تین قسمیں	266
کیا آج کی بیوی مہر ونفقہ نہیں چاہتی؟	267
مالی معاملات میں عورت کی نگہداشت	267
نان ونفقہ کے خلاف پروپیگنڈا	272
شوہر کی جگہ دولت	273
کیا حقوق انسانی کا منشور عورت کی توہین کرتا ہے؟	277
نواں حصہ	279
مسئلہ میراث	279
مسئلہ میراث	280
میراث سے عورت کی محرومی کے اسباب	280

منہ بولا لڑکا وارث ہوتا تھا	282
ہم پیمان کا ترکہ رضا من الجریرہ	283
بیوی، ترکہ کا حصہ تھی	283
ساسانی عہد کے ایران میں عورت کا وارث ہونا	283
اسلام کی نظر میں عورت کا حصہ میراث	285
مغرب پرستوں کا اعتراض	286
میراث کے مسئلہ پر زندیقوں کا اعتراض	287
دسواں حصہ	289
طلاق	289
حق طلاق (۱)	291
نئی زندگی اور طلاق میں اضافہ	291
ایران میں طلاق	294
امریکہ میں طلاق کی افزائش کی ہوا	295
مفروضے	297
طلاق ایک بین الاقوامی مسئلہ (۲)	302
غیر شریفانہ طلاق	304
امام حسنؑ کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈا (کردار کشی کی مہم)	230
اسلام نے طلاق کو حرام کیوں نہ کیا	311
طلاق (نظام فطرت) (۳)	313
نکاح و طلاق میں قوانین فطرت کی نگہداشت	314
گھریلو زندگی میں شوہر کا فطری درجہ	317

ماہر نفسیات فرانسیسی خاتون کا نظریہ	319
وہ عمارت جس کی بنیاد جذبات پر ہے۔	321
گھریلو زندگی کو استوار کرنے والی چیز مساوات سے بھی اہم ہے۔	323
فساد میں مساوات	325
عقد ازدواج	326
طلاق (کوشش صلح کے پس منظر میں) (۴)	327
گھریلو صلح کا مزاج ہر قسم کی صلح سے جدا ہے	330
اسلام، طلاق سے باز رکھنے والی ہر تجویز کا خیر مقدم کرتا ہے	331
خاندان کیلئے بیوی کے گزشتہ خدمات	338
طلاق، آزادی۔ اور حق (۵)	342
حق طلاق مرد کے خاص کردار کا نتیجہ ہے، اس کا تعلق عشق سے ہے۔۔۔۔	343
طلاق، اس لئے آزادی ہے کہ شادی کی فطرت حقیقت ''رفافت'' ہے	344
طلاق کا جرمانہ	346
اگر حقطلاق بیوی کو تفویض ہو؟	346
عدالتی طلاق	349
کیا بعض شادیاں سرطان ہیں، بیوی جلتی رہے اور نباہتی جائے۔	350
بند راستے	353
طلاق کا بند راستہ	355
آیت اللہ حلی کا خیال	355
آیات واحادیث	356
دوسرے دلائل وشواہد	359

شیخ الطائفہ کا نظریہ	361
گیارھواں حصہ	364
تعدد ازواج	364
تعدد ازواج	367
جنسی کمیونزم	367
افلاطون کا نظریہ	368
چند شوہری نظام	368
''چند شوہری'' نظام مشکلات	371
تعدد ازواج	371
اسلام اور تعدد ازواج	372
ایران میں تعدد ازواج	375
تعدد ازواج کے تاریخی اسباب (۱)	379
چند شوہری نظام کی ناکامی کی وجہ	381
جنسی اشتراکیت کی شکست	383
تعدد ازواج کے تاریخی اسباب جغرافیائی علل (۲)	389
جغرافیائی عوامل	389
یورپ میں چند ازواجی رسم کی صورت حال	392
ماہواری	395
خواتین کی زچگی کا سن محدود ہوتا ہے	396
اقتصادی اسباب	397
تعداد و خاندان ایک سبب	397

تحقیق 398
کئی بیویوں کی صورت میں عورت کا حق 400
شادی کے قابل عورتوں کی مردوں کے مقابلے میں عددی کثرت کے علل۔۔ 406
بیماریوں سے خواتین کی قوت مدافعت 408
کئی بیویوں کی صورت میں عورت کا حق 410
رسل کا نظریہ 412
تعدد ازواج ممنوع اور ہم جنس بازی کی اجازت 414
کیا چند ازواجی مرد کی فطری ہے؟ 416
چند ازواجی نظام یک زوجہ نظام کی پائیدار کا سبب ہے 420
بحث کی اصل صورت 421
بیسویں صدی کے مرد کی نیرنگیاں 422
بے شوہر خواتین کی محرومی سے پیدا ہونے والا بحران 425
عورتوں کی فراوانی میں مختلف ردعمل 427
چند ازواجی کے مشکلات وعیوب 429
تحقیق کا صحیح راستہ 430
روحانی زاویہ نظر 431
تربیتی نقطہ نظر 433
اخلاقی زاویہ نظر 435
قانونی نقطہ نظر 438
فلسفی نقطہ نظر 440
چند ازواجی دستور میں اسلام کا کردار 443

محدودیت	443
عدالت	444
عدل وانصاف کا خوف	448
حرم سرائیں	450
دوسرے شرائط ولوازمات	450
محترم قارئین!	452
آج کا مرد اور تعدد ازواج	452

❁❁❁❁❁

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرف اول

مصنف

اللہ، اللہ! کتنے ذہن انسان اس نے پیدا کیے ہیں وہ تند و تیز ہوا جس کے ایک جھکڑ سے تناور درخت اڑ جاتے ہیں۔ وہ تند روسیلاب جو فلک بوس ایوانوں کو بہالے جاتے ہیں۔ وہ آتش فشان دھماکے جن سے پہاڑوں کے کلیجے پھٹ جاتے ہیں۔انسان کے ایک اشارے و آدم زاد کے ایک کرشمے میں موجود ہیں۔اللہ نے ابن آدم کو تسخیر کائنات کی قوت عطا کی ہے۔ہم نے ایسے آدمی دیکھے ہیں جنہوں نے فضا، ماوراء فضا اور ستاروں پر ہاتھ ڈالا اور قدم فرسائی کی ہے۔

علم، آدمی کی میرث ہے اور معاشرے کو باغ و بہار بناتا ہے۔تسخیر کائنات ہو یا تسخیر قلب و نگاہ بشر دونوں کے لئے علم درکار ہے۔علم جلال بھی پیدا کرتا ہے، جمال بھی۔علم کا ایک نام قرآن ہے دوسرا نام نبی آخرالزمان ہے۔

ہمارے آپ کے نزدیک یہی علم، سیدھی لیکھ بتاتا اور اسی سے اللہ تک رسائی ہوتی ہے۔اس راستے پر چلنے کے آداب اور اس راستے کے رہنما امام اور ان کے دبستان سے سند فضل و شرف لینے والے علما ہیں۔کتاب و سنت کے عالموں میں ایک عالم تھے۔

شیخ مرتضیٰ مطہری

ابن شیخ محمد حسین مطہری، صوبہ خراسان ایران کے باشندے فریمان دیہات کے رہنے والے، دیہات سے نکل کر شہر مقدس مشہد وہاں سے شہر قم وہاں سے سے تہران آ کر آباد ہو گئے۔ فریمان میں الف بے پڑھی، مشہد میں، متوسطات کا درس لیا، قم میں ''اجتہاد'' کا مرتبہ حاصل کیا۔ قم کے متعدد اکابر کے حضور حاضر ہوئے، جن میں خصوصی اساتذہ یہ تھے:

آیت اللہ سید حسین بروجردی۔
آیت اللہ سید محمد محقق
آیت اللہ سید محمد حجت
آیت اللہ صدر
آیت اللہ سید محمد حسین طباطبائی، مفسر فلسفی
آیت اللہ سید روح اللہ الموسوی الخمینی

جناب مطہری، روشن فکر، عمیق نظر، نکتہ رس ذہن، دل کش گفتگو اور اعلیٰ درجے کی تقریر و تحریر کی مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے تفسیر و حدیث، فقہ و اصول میں جو کچھ پڑھا اسے اقتصادیات سیاسیات، قانون، معاشرتی علوم، اور جدید سائنس کے طویل اور عمیق مطالعات میں سمویا اور قوم کے دانشوروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی، وہ مغربی افکار کو مشرقی لہجے میں اور مشرقی افکار کی مغربی فلسفے کی روشنی میں لوگوں تک پہنچانے اور دونوں کے درمیان پل بنانے والوں میں تھے۔

تیئس (۲۳) کی عمر میں (۱۹۵۲ء) وہ تہران آ گئے، تہران میں ان کا معاشرتی اور علمی مطالعہ پھیل گیا، جوان طلبہ ان کے گرد جمع ہو گئے وہ آیت اللہ خمینی

مدظلہ العالی سے قریب ہوتے گئے۔آقای مطہری نے بہت اپنی مقبولیت کے سہارے یونیورسٹی تک رسائی حاصل کرلی، وہ دانش کدہ الٰہیات میں لیکچر دینے لگے اور طلبہ پران کافکری دباؤ بڑھنے لگا، مرکزی شہرہونے کی وجہ سے وہ بین الاقوامی تحریکوں کوقریب سے دیکھنے کے مواقع حاصل کرسکے اورجدید مسائل نیز اسلام کے خلاف زیر زمین اوراندارون معاشرہ ،خفیہ اورعلانیہ تحریکوں کے سامنے آنے لگے۔حسینیہ ارشاد ان کا مورچہ تھااورتہران یونیورسٹی اور پریس ان کی جنگاہ ۔وہ اساتذہ اورطلبہ کے ذہنوں پر چھاگئے،وہ جوان نسل کے دلوں میں سماگئے، اسلامی علم وعمل کے پرچارک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اسلامی انقلاب کے سپاہی بھی تھے وہ ہروقت دفاع کیلئے تیاراور ہر حملے کوجواب دینے کیلئے آگے نظرآتے تھے،حسینیہ ارشاد کے بعد مدرسہ سپہ سالاران کا ہیڈکواٹر ہوا جسے بعد میں ان کی یاد میں مدرسہ عالی شہید مطہری کا نام دے دیا گیا۔

۱۹۶۳ء۔ ۱۹۶۴ء۔۱۹۷۹ءتک وہ حملہ آورکا روپ اختیار کرچکے تھے،وہ سیاسی قائداورفکری رہنما بن کر، بھرپور شخصیت کی صورت میں سب کے سامنے تھے۔ امام خمینی مدظلہ کے حامی اورانقلاب اسلامی کے داعی قرارپائے،جیل گئے،حکومت کے عتاب اورشاہ پرستوں کے نشانے پررہنے لگئے۔انقلاب اپنے شباب پرآیااوررہبرانقلاب،عراق سے فرانس پہنچے توجناب مرتضی مطہری،مرجع اسلام وقائد انقلاب اسلامی سے مذاکرات کرنے پیرس تشریف لے گئے۔امام خمینی مدظلہ نے گلے لگایا،ہدایات لئے ،جناب مرتضیٰ مطہری نے واپس آکرتہرانی انقلابیوں کی قیادت سنبھال لی۔

۱۱فروری۱۹۷۹ءکوانقلاب اسلامی کامیاب ہوااورشیخ مرتضیٰ مطہری مجلس شورائے انقلاب کے رکن ورح وروان بنائے گئے۔وہ انقلاب کی اصل رفتارسمت

اور بہاؤ کے نگران تھے، وہ ٹھنڈے مزاج کے کوہ صفت رہنما تھے، وہ سمندر کی طرف نرم، گہرے مگر غلط سمت چلنے والی کشتیوں کی غرقابی کے اقتدار سے بہرہ ور تھے۔

انقلاب دشمن ،انقلاب درانقلاب کے خواہشمند افراد اورقائد انقلاب کوذہنی اذیت پہنچانے کی نیت رکھنے والوں نے ۴ جمادی الثانیہ، ۱۳۹۹ھ/ ۱۵ مئی ۱۹۷۹ء کوانہیں شہید کردیا،وہ راہ خدا میں جاں بحق ہوگئے ،وہ انقلاب اسلامی پرقربان ہوگئے اورزندہ جوانوں کواستقامت کوخون عطا کرکے،تاریخ کے زندہ بہادرعلماء دین کی صف میں کھڑے ہوگئے ان کی تاریخ پیدائش ۱۲ جمادی الاول ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ءتھی۔

ان کی بہت سی یادگاریں ہیں ۔اولاد ہے ۔قوم کے جواں سپاہی ہیں، مدرسے ہیں مسجداورامام باڑے ہیں اوران کی انمٹ تحریریں ہیں۔

کتاب

نظام حقوق زن دراسلام

شہید مرتضیٰ مطہری رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی اہمیت تضنیف ہے۔ان کا فکری افق بلند اور روشن تھا ان کے اطلاعات کا دائرہ وسیع اور ان کا نصب العین اسلام تھا۔ وہ عقلی اور منطقی لہجے اور عام فہم زبان میں بات کرتے ہیں۔ان کی تحریروں کے مجموعے اور ان کی کتابوں کے نام دیکھیے،آپ خود سمجھ لیں گے کہ مصنف کس معیار اور کس سطح کا مالک ہے۔

تصانیف شہید مطہری:

اصول فلسفہ وروش رئالیسم ۔ پانچ جلد۔

خدمات متقابل اسلام وایران

عدل الٰہی

پیامبر امیؐ

ختم نبوت

امامت

جاذبہ ودافعہ علیؑ

حماسہ کربلا

قیام وانقلاب مہدیؑ

شناخت قرآن

تفسیر سورہ حمد وبقرہ۔تین مجلد

سیری در نہج البلاغہ

ولاو ولا تیہا

بست گفتار

وہ گفتار

علل گرایش بہ ماوی گرای

امداد ہای غیبی در زندگی بشر

انسان وسرنوشت

جہاں بینی اسلامی بین الاقوامی میں اسلام کی نظر سے متعلق کتابیں:

انسان وایمان

جہاں بینی توحیدی

وحی ونبوت

انسان درقرآن

جامعہ وتاریخ

زندگی جاوید یا حیات اخروی

کتاب سوزی ایران ومصر۔

انسان کامل۔

عرفان حافظ۔

نہضتہائے اسلامی درصد سالہ اخیر

پیرامون انقلاب اسلامی

علوم اسلامی کا تعارف

فقہ واصول فقہ

کلام وعرفان

منطق وفلسفہ

تعلیم وتربیت

داستان راستان۔

منظومہ

جہاد۔

شہید

خواتین کیلئے

اخلاق جنسی

مسئلہ حجاب

نظام حقوق زن در اسلام............اسی کتاب کا ترجمہ آپ پڑھیں گے مرد کی طرح عورت بھی مختلف علوم وفنون میں موضوع بحث ہے، ادب ،تاریخ، نفسیات ،فزیکس، ہیومن، سائنس، معاشرہ اور قانون میں اس کی ذات اور اس کی حیثیت پر کئی زاویوں سے گفتگو ہے۔ پھر مذاہب وادیان بجائے خود ایک باب ہے مشرق ومغرب ''عورت'' کی سمتیں اور دو نگاہیں اور دو نظریے لئے ہوئے حاضر بحث ہیں۔

عورت کے حقوق اسلام میں کیا ہیں۔ اس کا درجہ اسلام نے کیا بتایا ہے؟ اس کے فرائض کیا ہیں؟ اس کے حقوق یعنی قوانین کیا ہیں؟

مسلمانوں سے یہ سوالات ہوتے ہیں، چونکہ مسلمان اپنے دین کو کامل ومکمل سمجھتے ہیں لہٰذا انہیں بھی جواب دینا چاہیے، ابتدائی دور، یعنی زمانہ نزول قرآن، عہد سنت نبوی، اور دور ائمہ واصحاب میں یہ سوالات اٹھے تھے اور جواب بھی دیے گئے تھے۔لیکن زمان ومکان، زبان وبیان کے ساتھ کچھ تبدیلیاں آنا ضروری تھیں۔ کچھ نہ کچھ بابت بدلتی ہے نئے حریف کھڑے ہوجاتے ہیں، منطق واستدلال کے نئے مدعی ابھر آتے ہیں، سائنس آف نیچر سائنس آف لاء، پھر قانون کے شعبے، شخصی قانون ،قومی قانون، بین الاقوامی قانون اس کے بعد قانون ،تشریحات قانون، سفارشات جیسی فلسفانہ موشگافیاں آج کی باتیں ہیں۔

مغرب کے سامنے قوموں کی سپر اندختگی ،اپنی ذات ،اپنی تاریخ ،اپنی تہذیب اپنی فکری شکست کا اقرار دراصل بارادہ واختیار بلا قیمت یا بڑے سستے داموں بلاوجہ اپنے آپ کو بیچنے کا غلط اقدام ہے۔ آزادی کے بجائے غلامی، زندگی کے بجائے موت، اور موت کے بعد بے نام ونشان رہنے کی تیاری ہے۔ جو صدا مغرب سے اٹھے

اورادھر سب دوڑ پڑے؟ خودداری ،غیرت اوراپنے وجود کے احساس سے دست برداری کے یہ طور طریقے اہل دانش وبینش کوایک نظر نہیں بھاتے ،سیاسی اور سماجی مفکراس پیش قدمی کواقدام خودکشی جیسا جرم جانتے ہیں۔

کچھ سرمایہ دار ،اپنی شان وشوکت میں سرخاب کا پرلگانے کیلئے یورپ کی یاترا کرتے ہیں وہاں سے آکر یورپین طورطریقوں کا پرچار ،پھران کے نظام کی وکالت اوراپنے نظام کی مخالفت کو پیشہ بنا لیتے ہیں۔

بدم اگرہوں گے ،توکیانام نہ ہوگا

مادر پدرآزادی یافکرونظر کی غلامی کے نتیجے میں مسلمان سماج ،اسلامی قانون پر کچھ زبردست حملے ہوتے ہیں کبھی شب خون مارتے ہیں اور پروپیگنڈے کی ایک مہم یعنی سرد جنگ تیز کردیتے ہیں:

عورت کا مرتبہ۔عورت کے حقوق۔زن ومرد میں مساوات۔نکاح ،طلاق ،میراث ،پردہ ،شہادت ود............ کے چھوٹے بڑے مسائل پرآوازیں اٹھانے اورنعرے لگانے پھرمحاذ بنانے کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔بہت سے ذہنوں میں حق طلبی ،بعض حضرات کیلئے اطمینان کاحصول ،بعض لوگوں کوبغاوت کا جواب درکارہوتاہے ،ہردورمیں علماء اسلام نے جواب دیے اوراسلامی قانون وفلسفہ قانون کے ماہرین نے وقت کے تقاضوں کاسمنا کیاہے۔ اسلام اپنی فکر،منطقی ،قانونی اورانسان دوست وانسان نوازتعلیم کی وجہ سے زندہ وپابندہ ہے۔اس زندگی کومجروح کرنے کیلئے ایران میں بھی ایک تحریک چلی تھی۔ایران میں ،عورت بحیثیت بیٹی ،بیوی اورماں کے قانون اسلام یااس سے قریبی حقوق وفرایض کی پابندتھی ،لوگوں نے چاہااس بندکوتوڑدیں ورنہ کمزوریاڈھیلاتوبنادیناضروری ہے۔اس مقصد کیلئے قانون ومعاشرے کےزاویے سے کچھ حملے کیے گئے۔

شہید مرتضیٰ مطہری نے بھی اس بحث میں حصہ لیا اور لوگوں کے اعتراضات وسوالات کے جواب لکھے۔ اس بحث اور جنگ کا میدان، تہران کا مجلہ۔ زن روز۔ تھا، زیر نظر کتاب شہید کے انہیں مضامین کا مجموعہ ہے۔

معاشرہ، تاریخ، فطرت، اور نفسیاتی جہات سے عورت کا مرتبہ، خواستگاری، نامزدگی، ازدواج، نکاح، متعہ، تعدد ازواج، نان ونفقہ اور مہر، طلاق، عدہ، میراث، اولاد۔ لڑکیاں زیادہ، لڑکے کم، ان معاشرتی مسائل کا حل اس کتاب میں زیر بحث ہے۔

جنسی بحران، دنیا کا اہم مسئلہ۔ طوائف بازی، آزاد تعلقات جنسی، جنسی کمیونزم، دوست لڑکیاں۔ دوست لڑکے۔ اولاد بے پدر۔ بے گھر زندگی۔ گھریلو زندگی۔

فلاسفہ۔ افلاطون۔ فرائیڈ۔ برٹینڈرسل۔ اقوام متحدہ کے منشور میں حقوق نسواں کا تذکرہ نہیں۔

زن ومرد کی مساوات۔ عورت کا استثمار۔ عورت سے اس کا گھر چھیننے کا مسئلہ مرد کا جنسی جنون، شادی کے قابل لڑکیاں۔ شادی کے قابل لڑکے۔ عائلی ذمہ داری سے مرد کا فرار۔ جیسے عنادین پر گفتگو آپ کو ملے گی۔

اسلامی فقہ وحدیث وقرآن کے عالم کی حیثیت سے شہد مطہری نے بڑی عمدی بحثیں اور بہت اچھی دلیلیں، نہایت شاندار تنقیحیں پیش کی ہیں۔ آج کل کے نئے مسائل ہیں، ان کے بارے میں عقل دلائل ہیں جواب ہیں اور توضیحات ہیں۔ اسلامی رویے اور غیر اسلامی رویوں کی نشان دہی ہے۔

کتاب کا اسلوب اور زبان

شہید مطہری، فارسی کے سادہ زبان اور سادہ بیان مصنف ہیں۔ وہ آج کے مسائل پر آج کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ وہ اصل میں فلسفی ہیں مگر عملی اور نتیجہ خیز فلسفے کے نقیب ہیں۔ ایران بلکہ سارے جہاں کے لوگ کیا کر رہے ہیں۔ سوچ کیا ہے، نتائج کیا ہیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اسلام کیا کہتا ہے۔ اس کیلئے فقہ، اصول فقہ، قانون اور اصول قانون کا حوالہ، اس کے اصطلاحات بھی ضروری تھے، اس لیے بعض عام قاری کو نئے معلومات اور اہم اطلاعات مہیا کرتے ہوئے شہید مطہری نے حوالے بھی دیے ہیں۔ اور ہم نے حاشیے میں کچھ توضیحات لکھے ہیں۔

چار سو سے زیادہ صفحات، اگر صرف کتابی اور خشک خاکے کی صورت میں ہوتے تو بہت سے قاری تھک جاتے۔ موجودہ حالت میں کتاب مجموعہ مقالات ہے۔ چونکہ یہ مضامین خواتین کے رسالے میں چھپے تھے اس لیے عوامی اور روزمرہ کی زباں اور زیادہ واضح اسلوب میں بیان ہوئے ہیں۔ آپ جتنا مطالعہ کرتے جائیں گے روشنیاں تیز ہوتی جائیں گی۔

ترجمہ کیوں؟

اس کتاب کا عربی وانگریزی میں ترجمہ ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اردو ترجمہ اس لئے ضروری تھا کہ ہماری وسیع زبان میں ۔خواتین کا سنجیدہ لٹریچر کم ہے۔ ہماری زبان میں اسلام اور اس کے تعلیمات پر اچھا خاصہ ذخیرہ ہے۔ اس ذخیرے میں خواتین کے مطالعے۔ تعلیم ذہنی نشوو ارتقا اور فہم وبصیرت کے مجموعے کی فراوانی ضروری ہے۔

انقلاب اسلامی نے خواتین کو نیا کردار دیا

انقلاب اسلامی ایران نے، خواتین کے اسلامی نظام فکر و عمل کے متعدد نئے پہلو نمایاں کیے ہیں۔ اور اس میں شہید مطہری کی تعلیم و تربیت و دعوت کا ہاتھ بھی تھا۔ لہذا اردو دان اور اردو خوان جوان لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے۔ خصوصاً۔ خواتین کیلئے ان کی زبان میں ان کی ضرورت کیلئے ان کے اضافہ معلومات اور اسلامی نظریات کی توضیح و تعلیم کی خاطر یہ کتاب ہدیہ کی جا رہی ہے۔

سید مرتضیٰ حسین

صدر الافاضل۔ تہران۔ ۷ شوال۔ ۱۴۰۵ھ

مقدمہ

از شہید مطہری

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ہمارے عہد کے تقاضے ،بہت سے مسائل پر دوبار نظر کرنا ضروری قرار دیتے ہیں، یہ مسائل پرانی قدروں کے بجائے نئی قدروں کے طلب گار ہیں۔ان میں سے ایک مسئلہ ہے۔

خاندانی ذمہ داریاں اور نظام حقوق خواتین

آج فرض کیا جا چکا ہے کہ موجودہ ماحول میں اصل موضوع ہے۔''آزادی نسوان''اور''قانونی مساوات زن ومرد'' باقی مسائل انہیں دونوں کے ذیل میں آتے ہیں۔اس پرزور دینے کے اسباب وعلل پر گفتگو آگے ہوگی۔

''نظام حقوق خاندان'' کے ضمن میں ہمارے نقطہ نظر سے اصل بنیادی۔یا بنیادی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ''عائلی نظام''،نظام ہائے معاشرت میں کوئی جداگانہ نظام ہے؟اس کی منطق یا اس کا معیار دوسری منطقوں اور معیاروں سے کسی خصوصیت کی بنا پر خاص اہمیت رکھتا ہے؟ وہ عقل دلائل جو معاشرے کے بہت سے اداروں میں کارآمد ہیں، یہاں ان کی حیثیت بدل جاتی ہے؟ یا اس معاشرتی گروپ میں دوسرے گروپوں سے کوئی اختلاف نہیں ہے؟ اس

یونٹ میں وہی منطق اور وہی معیار کام آتے ہیں جو دوسرے معاشرتی اداروں (یونٹوں) میں بروے کار ہیں؟

اس پریشانی کی اصل یہ ہے کہ ایک تو اس کے ادارے دورکنی دوجنسی ہیں۔ دوسری طرف والدین اور اولاد کا نسلی تسلسل ہے۔ کارخانہ خلقت نے اس یونٹ کی وضع باہمی مشابہت کے فقدان، اور عدم یکسانیت پر رکھی ہے۔ ان دونوں کے کیفیات میں اختلاف موجود ہے۔

خاندانی معاشرہ ''طبیعی۔ باہمی مفاہمت'' کا معاشرہ ہے۔ اور دو معاشرتی یونٹوں کی درمیانی کڑی ہے جیسے شہید کی مکھی اور مماکھی، جن کے تمام قانون، قاعدے طبیعت وحلیت کی جہت سے معین ہیں۔ اس سے سرتابی ممکن نہیں۔ اور ایک مفاہمتی معاشرتی یونٹ جیسے انسانی مدنی معاشرہ کہ اس میں طبیعی وجبلی پہلو کا دخل کم ہے۔

چنانچہ ہم جانتے ہیں۔ ماضی بعید کے فلاسفہ خاندانی فلسفہ حیات کو ''حکمت عملی'' کا ایک مستقل باب مانتے تھے اور وہ معتقد تھے کہ اس یونٹ کی منطق اور معیار انسانی زندگی کے دوسرے شعبوں سے مختلف ہے۔ افلاطون نے ''رسالہ جمہوریت'' اور ارسطو نے ''کتاب سیاست'' اور بوعلی سینا نے ''کتاب الشفاء'' میں موضوع کو اس زاویے سے دیکھا ہے۔

معاشرے میں ''حقوق زندن'' پر گفتگو میں بھی طبعی طور پر یہ بحث ہے کہ طبیعی وانسانی جہت سے مردوزن کے حقوق یکساں وہم آہنگ ہیں؟ یا ایک دوسرے سے الگ الگ اور ہم آہنگی سے دور ہیں؟ یعنی، خلقت وفطرت نے جو حقوق انسان کو عطا کیے ہیں وہ خلقتاً یک جنسی ہیں یا دوجنسی؟ آیا حقوق وفرائض معاشرہ میں۔ ''مردانگی'' اور ''نسوانیت'' کا عمل دخل ہے؟ یا تکوین وتخلیق کی منطق میں دونوں طبیعی زاویے سے ایک جنس ہیں؟

مغربی دنیا نے سترھویں صدی عیسوی کے بعد علمی وفلسفی تحریکیں شروع کیں۔جس کے نتیجے میں ''حقوق بشر'' کے نام سے معاشرتی میدان میں بھی ایک تحریک نے جنم لیا۔سترھویں اٹھارویں صدی میں مفکروں اورادیبوں نے اپنا فکری اثاثہ عوام میں تقسیم کرکے انسان کے نا قابل سلب وانتقال فطری حقوق کی بحث عام کردی۔اورقابل تعریف محنت کی۔

جون جوک روسو۔والٹیر۔مان ٹسکو۔اسی گروپ کے مفکروادیب تھے۔ان لوگوں کا انسانی معاشرے کی تعلیم وتربیت پرحق بھی ہے۔یہ دعویٰ کرنا بے جانہیں کہ انسانی معاشرے پران کا حق ان لوگوں سے کم نہیں جنہوں نے دنیا میں اہم ایجادات وانکشافات کیے ہیں۔

ان لوگوں کا مرکز خیال یہ نکتہ بن گیا کہ انسان فطرتاً اورخلقت وطبیعت کی بنیاد پرکچھ حقوق اورکچھ آزادیاں رکھتا ہے۔یہ آزادیاں اوریہ حقوق کوئی فرد یاجماعت یاقوم کسی بھی عنوان اورنام سے کسی فرد یاقوم سے نہ چھین سکتی ہے نہ صاحب حق خوداس کوکسی دوسرے کی طرف منتقل کرسکتا ہے۔تمام انسان: حاکم ومحکوم۔سفید وسیاہ،سرمایہ داروغریب،سب آزادی اورحقوق انسانی مساوی ہیں۔

یہ فکری ومعاشرتی تحریک ابھری اوراس کے نتائج پہلے انگلستان پھرامریکہ اس کے بعد فرانس میں انقلاب کی صورت میں برآمد ہوئے۔انقلاب آئے،نظام بدلے۔قراردوں پردستخط ہوئے پھردنیا کے دوسرے نقاط پراس کا اثر پڑنے لگا۔

انسانی حقوق کے فلسفے نے انیسویں صدی میں کچھ نئے فکری زاویے پیدا کیےان کا تعلق اقتصادی،اجتماعی اورسیاسی مسائل سے تھے،ان افکار نے حالات میں مزید تبدیلی پیدا کی جس کی ایک شکل ہے سوشلزم۔مزدور طبقہ کا نفع پراستحقاق۔سرمایہ داروں سے مزدوروں کے حامیوں کوحکومت کا انتقال۔

انیسویں صدی کے آخراور بیسویں صدی کے آغاز میں ''انسانی حقوق'' پر جو بحث یا عملی اقدامات ہوئے تھے۔ان میں سے اکثر حکومت کے مقابلے میں قوم یا مالک وکارخانہ دار کے مقابلے میں محنت کش طبقے سے مربوط تھی۔ بیسویں صدی میں ''مردوں کے حقوق'' اوران کے مقابلے میں ''عورتوں کے حقوق'' کا مسئلہ اٹھا۔ ۱۹۴۸ء میں جنگ عظیم دوم کے بعد جب ''ادارہ اقوام متحدہ'' قائم ہواتواس نے مساوات حقوق مردوزن کا کھلا منشور شائع کردیا۔

یورپ کے تمام معاشرتی انقلابوں میں۔سترھویں صدی سے موجودہ صدی تک اصلی محور دو تھے:

آزادی۔ مساوات۔ اوربس، بات اس سے آگے نہیں بڑھی ۔اس لحاظ سے کہ تحریک حقوق مغرب میں دوسری تحریکوں کے زیراثر تھی اس کے علاوہ یہ تحریک یورپ کے مزاج سے موفق نہ تھی، اس وجہ سے اس تحریک میں آزادی اورمساوات کے عنوان کے آگے بات نہ بڑھی۔

انقلابی رہنماؤں نے یہ طے کرلیا کہ آزادی نسواں اوراس کے حقوق کی مردوں سے یکسانیت ،جس کا چرچا سترھویں صدی سے شروع ہوا تھااس نکتہ پرختم ہوگیا۔ انہوں نے کہاجب تک عورت کی آزادی اوراس کے حقوق مرد کے برابر نہیں مانے جاتے۔آزادی اور حقوق انسانی ۔ پربحث بے معنی ہے۔تمام خاندانی مشکلات صرف اس لئے ہیں کہ عورت نہ آزاد ہے نہ اس کے حقوق مرد کے حقوق کے برابر ہیں۔اس پہلو کو روشن کردیا جائے تو خاندانی مشکلات حل ہوجائیں گے۔

اس تحریک میں جس کو ہم نے ''نظام حقوق خاندان کا بنیادی مسئلہ قراردیا یعنی آیا فطری طور پرنظام کوئی مستقل نظام ہے؟ کیااس کی منطق اوراس کے معیار دوسرے سماجی اداروں سے جداہیں؟ لیکن یہ سوال فکرفلاسفہ سے دور رہے۔ ان

کا فکر ونظر کا رخ ایک طرف رہا وہ ہے ''اصل آزادی'' اور اصل مساوات'' زن ومرد

دوسری لفظوں میں : حقوق نسوان کے موضوع بحث کا زاویہ یہ کلمہ رہا۔ ''طبیعی وفطری حقوق جو چھینے نہیں جاسکتے۔'' اسی مرکز پر سارے دائرے بنتے رہے۔ انسانیت میں عورت مرد کی شریک ہے۔ عورت ایک مکمل اور معیاری انسان ہے۔ اس لیے اسے مرد کی طرح ان حقوق سے بہرہ ور ہونا چاہیے جو''' فطرت انساں کو دیئے ہیں اور وہ چھینے نہیں جاسکتے۔''

''طبیعی حقوق'' کی دریافت کن مصادر سے ہوتی ہے؟ ہم نے اس کتاب کے ابواب وفصول کی نسبتاً کافی مکتفی بحث کی ہے۔ ہم نے ثابت کیا کہ خود طبیعت ''طبیعی وفطرت حقوق'' کا سرچشمہ وماخذ ہے۔ یعنی اگر انسان کو ایسے حقوق حاصل ہیں جو گھوڑے اور بکری یا مرغ وماہی کو حاصل نہیں تو اس کی تہہ میں طبیعت وخلقت کا ہاتھ ہے۔ اور اگر تمام آدم زاد ''طبیعی حقوق'' میں مساوی ہیں اور سب کو آزاد زندگی حاصل ہے تو یہ فرمان متن خلقت سے صادر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری دلیل موجود نہیں ہے مساوات وآزادی کو فطری حق ماننے والے دانشوروں کے پاس بھی صرف یہی دلیل ہے۔ نظام خاندان کے بنیادی مسئلہ میں بھی ''طبیعت'' کے علاوہ کوئی ماخذہ مصدر نہیں۔

''نظام حقوق خاندان'' میں ہم جسے بنیادی مسئلہ مانتے ہیں اس پر مفکرین کی توجہ نہ ہونے کا سبب کیا ہے؟ آیا موجودہ علوم نے ثابت کردیا ہے کہ زن ومرد کا اختلاف چند اعضا کا معمولی سا اختلاف ہے اس سے جسمانی ڈھانچے اوران نفسیات میں کوئی فرق نہیں پڑتا جن سے حقوق کا تعلق ہے:؟اور اس سے ذمہ داریاں قبول کرنے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ موجودہ معاشرتی فلسفے میں اسی وجہ سے کوئی نیا گوشوارہ حساب نہیں کھلتا؟

اتفاقاً معاملہ برعکس ہے ۔حیاتیاتی ونفسیاتی علوم کی ترقی نے جوانکشافات کیے ہیں ان سے دونوں جنسوں کے فرق نمایاں اور بہت زیادہ روشن ہوئے ہیں۔ ماہرین حیاتیات ، فیزیالوجی ،اور سائیکالوجی جاننے والوں کے تحقیقات کا حوالہ آگے دیا جائے گا۔حیرت ہے کہ ان باتوں کے باوجود ایک بنیادی مسئلہ زینت طاق نسیاں کردیا گیا۔

اس غفلت و بے توجہی کا شاید یہ سبب ہو کہ تحریک تیزی سے ابھری لہٰذا جہاں اس نے عورتوں کی بہت سی بدبختیوں کو دور کیا وہاں کچھ مجبوریاں اور بدنصیبیاں اس کو تحفہ میں دیں اور انسانی معاشرے کو بھی اس لپیٹ میں لے لیا۔آئندہ ابواب میں ملاحظہ کیجئے گا کہ یورپ کی عورت بیسویں صدی عیسویں کے آغاز تک معمولی اور روزمرہ کے حقوق سے بھی محروم تھی۔اسی زمانے میں اہل مغرب کو تلافی مافات کا خیال آیا۔

مساوات وآزادی کے نام سے متعدد تحریکیں وجود میں آچکی تھیں۔انہیں میں مسئلہ زیر بحث بھی تھا۔آزادی ومساوات ،دولفظوں سے معجزہ آفرینی کی امید لگانے والے سب مسائل انہیں سے حل کرنا چاہتے تھے۔وہ یہ بھول گئے کہ مساوات وآزادی کا رشتہ خود ''انسان کے بحیثیت انسان'' کے زاویے سے پیدا ہونے والے تعلقات کا پابند ہے۔منطقی زبان میں ۔مساوات وآزادی انسان حق ہے اس حیثیت سے کہ وہ انسان ہے عورت چونکہ ایک حیثیت سے انسان ہے۔لہٰذا ہرانساں کی طرح آزاد پیدا ہوئی ہے اور مساوی حقوق کی مالک ہے لیکن عورت چند مخصوص کیفیات کی حامل انسان ہے۔عورت ومرد انسانیت میں ''برابر'' ہیں۔لیکن یہ دوطرح کے انسان ہیں۔ان کی خصلتیں دوالگ الگ طرح کی ہیں۔ان کے نفسیات دوقسم کے ہیں اور یہ دوئی جغرافیائی ،تاریخی یا معاشرتی بنیاد پرنہیں بلکہ ان کی اساس عین تخلیق

کے اندر رکھی گئی ہے۔اس دوئی سے طبیعت کا ایک مقصد وابستہ ہے اور جو عمل طبیعت وفطرت کے خلاف ہوگا اس کے عوارض ناپسندیدہ رونما ہوں گے جس طرح ہم نے آزادی اور انسانوں میں مساوات ۔ان میں سے عورت مرد کا مسئلہ ۔طبیعت کے سرچشمے سے حاصل کیا ہے۔اسی طرح کیفیتوں کی اکائی یا دوئی میں عورت مرد کے حقوق کا سبق حاصل کرنا ہوگا۔ یونہی ''خاندان معاشرہ ۔کم ازکم ایک نیم طبیعی چیز ہے یانہیں؟اس کا جواب بھی طبیعت وفطرت سے لینا چاہیے۔کم ازکم یہ مسئلہ بھی قابل بحث ہے کہ حیوانات کی ''دوجنسی'' جن میں سے ایک جنس انسان ہے ۔اتفاقی عمل ہے یا تخلیق منصوبے کا حصہ ہے؟ آیا دونوں جنسوں کا اختلاف صرف سادہ عضوی اختلاف ہے یا بقول اللسیس کارل انسانی جسم کے سر خلیے میں اس کی جنسیت کے علامات موجود ہیں؟ کیا منطق وز باب فطرت میں مرد وزن دونوں الگ الگ فرائض ہیں یانہیں؟ کیا حقوق قانون بھی یک جنسی ہیں یا دوجنسی؟ اخلاق وتربیت دوجنسی ہے یا ایک جنسی؟ سزاؤں کے بارے میں کیا رویہ ہے؟اور ذمہ داریوں اور فرائض کی صورت کیا ہے؟

اس تحریک میں یہ نکتہ نظر انداز ہو گیا کہ مساوات وآزادی کے علاوہ بھی کچھ مسائل ہیں ۔مساوات وآزادی ایک لازمی شرط ضرور ہے مگر فقط یہی کافی نہیں ۔قانون وحقوق کی مساوات اپنی جگہ اور دونوں میں مشابہت بھی تو کوئی حقیقت ہے۔عورت مرد کو حقوق میں برابری مادی وروحانی طور پر ایک بات ہے اور دونوں میں مماثلت اور صورت میں مشابہت دوسری بات ہے ۔اس تحریک میں عمداً یا سہواً ''مشابہت'' کی جگہ مساوات اور مماثلت کی جگہ ''برابری'' کو مان کر ایک بنا دیا گیا ''کیفیت'' کمیت'' کے تحت الشعاع میں آ گئی ۔عورت کا ''انسان'' ہونا اس کے ''عورت'' ہونے کو نظر انداز کرنے کا سبب بن گیا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس بے توجہی کو فقط ایک ایسی فلسفی غفلت کا مہم نہیں

دیناچاہیے جو عجلت کی بنا پر ہوئی۔ اس میں دوسرے عوامل بھی تھے جو آزادی اورمساوات زن کے ذیل میں قابل استفادہ تھے۔

اس مہم کے پس پردہ سرمایہ داروں کے منافع بھی کام کررہے تھے۔کارخانہ دارجوعورت کوگھر سے کارخانے میں لاناچاہتے تھے۔ وہ اس سے اقتصادی فائدے اٹھانے کی فکر میں تھے ان لوگوں نے نعرہ لگایا۔عورت کے حقوق ۔عورت کی اقتصادی آزادی۔عورت کی آزادی۔مردوعورت کے حقوق مساوی ہیں۔ان لوگوں کی بدولت مطالبات نے قانونی صورت اختیار کی۔

ویل ڈیوارنٹ ’’لذت فلسفہ‘‘ نویں فصل میں ۔ارسطو ،نطشے،شوپن ہاوراور یہودیوں کی مقدس کتابوں سے عورت کے بارے میں حقارت آمیز رائے نقل کرتااور کہتاہے۔ انقلاب فرانس میں عورت کی آزادی کا مسئلہ موجود تھالیکن کوئی عملی تبدیلی نہیں ہوئی۔انیسویں صدی تک عورت کے پاس ایک قانون تھاجس کی رو سے مردکوعورت کے احترام کا پابند ہونا پڑتا تھا۔اس کے بعد بیسویں صدی میں عورت کے حالات میں تبدیلی آنے کے اسباب وعلل سے بحث کرتے ہوئے کہتاہے۔

عورت کی آزادی ،صنعتی انقلاب کے بدولت ہے............عورت ،سستی مزدورتھیں ،کارخانہ دارسرکش اورگراں قیمت مرد، مزدوروں پرانہیں ترجیں دیتے تھے۔ ایک صدی پہلے انگلستان میں مردوں کوکام ملنا مشکل تھا۔لیکن مردوں سے اشتہاروں میں درخواست ہوتی تھی کہ بچوں اورعورتوں کوکارخانوں میں بھیجیں۔ آزادی خواتین کیلئے پہلا قدم ۱۸۸۲ء کا قانون تھا،جس نے۔عظیم برطانیہ۔کی عورت کووہ اعزاز دیا جس کی مثال پہلے موجودنہ تھی۔یعنی ،عورت جوروپیہ کمائے گی وہ اسے اپنے لئے محفوظ رکھنے کاحق رکھتی ہے۔اس اعلیٰ اخلاقی قانون کوانگلستان کے مجلس عوام کے کارخانہ والوں نے وضع کیااوراس طرح انگلستان کی عورتوں کوکارخانوں میں کھینچ

لیااس سال سے اب تک جان لیوا محنت کی مزدوری نے ان کو گھر بار کے جھنجٹ سے چھٹکارا دلا دیا اور دوکانوں اور کارخانوں میں خون پسینہ بہانے کا عادی بنا دیا۔[1]

مشینی دور کی روز افزوں ترقی صنعتی پیداوار میں ضرورت سے زیادہ اضافہ پھر مصنوعات استعمال کرنے اور خریدنے والوں کو ہزار افسوں وتیزنگ سے مائل کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کی خاطر سمعی بصری ،فکری وجذباتی ،ذوق وہنر ،فن اورآرٹ حتی کہ جنسی عوامل درکار تھے جوگاہکوں کو بلاارادہ چیز یں خریدنے پر مجبور کریں۔ یہ نئ ضرورت مجبور کررہی تھی کہ سرمایہ دارعورت کے وجود سے فائدہ اٹھائے۔ اس مرحلے میں عورت کواستعمال کرنے کا انداز کچھ اور تھا۔ اب عورت جسمانی قوت کام کرنے کی صلاحیت معمولی کاری گریا پیداوار میں مرد کا شریک مساوی کی حیثیت سے نہیں دیکھی جارہی تھی۔ اس کی جاذبیت ۔مقناطیسی کشش ،فکروخیال کوقابو میں لانے کی قوت ارادے بدل دینے کی طاقت اورکرامت رہن رکھنے ،آبرو بیچ ڈالنے کے امکانات سے فائدہ اٹھانے کا زاویہ سامنے آیا۔ اب پیداوار ،صارف کے سرتھوپنے کی بات تھی۔ موٹی سی بات ہے اس کاروبار کیلئے ۔آزادی اورمساوات مردزون ۔کارآمد مہم تھی۔

---

[1] ڈاکٹرعلی شایگان شرح: قانون مدنی ایران ص ۳٦٦ میں ہے: عورت اپنی ملکیت پر جوحق رکھتی ہے اورشیعہ فقہ نے اسے شروع ہی میں تسلیم کیا وہ کچھ عرصہ پہلے اکثر قوانین مما لک میں تسلیم نہیں کیا گیا تھا اس میں یونان ۔روم ۔جرمن بھی داخل ہیں کہیں اس حق کا نام ونشان نہ تھا۔یعنی نابالغ دیوانے اور مجبورّ جس کی ملاک زیرتحویل حکومت ہو) کی طرف اپنی دولت خرچ کرنے کا حق نہ رکھتی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے عورت کی شخصیت ،شوہر کی ذات میں فنا تھی۔ ۱۸۷۰ءاور ۱۸۸۲ء میں ''ملکیت زن'' کے نام سے دوقانون بنے اورعورت کی ملکیت سے کستوڈین شپ ختم ہوئی۔

سیاست بھی اس عامل کو استعمال کرنے سے غافل نہ تھی۔ اخبارات میں روزانہ ایسے قصے آپ بھی پڑھتے اور دیکھتے ہوں گے۔ یہ سب عورت کے وجود سے فائدہ اٹھانے کی مہم ہے۔ اور مرد اپنے مختلف مقاصد کیلئے اسے استعمال کر رہا ہے مگر آزادی و مساوات کے پردے میں۔

ظاہر ہے، بیسویں صدی کا جوان اس قیمتی لمحے سے غافل نہیں۔ شادی کے بارے میں وہ خاندانی رسم رواج سے فرار کرنا چاہتا تھا اور مفت، کم قیمت، شکار ہاتھ آئے تو اسے خسارہ کیا ہے۔ جوانوں نے عورتوں کی آزادی و مساوات کی خاطر اس کی مظلومیت اور حقوق تلفی پر سب سے زیادہ مگر مچھ کے آنسو بہائے۔ وہ اس جہاد مقدس میں آگے تھے اس نے اس کام کیلئے اپنی شادی کو چالیس سال پیچھے ڈھکیل دیا۔ کبھی کبھی تو اس نے ''مجرد'' زندگی گزارنے کی ٹھان لی۔

بے شک ہماری صدی نے عورت سے بدنصیبوں کا ایک طومار واپس لے لیا۔ لیکن یہ بات بھی ضرور ہوگی کہ اسے نئی بدبختیوں کا تحفہ پیش کیا۔ کیوں؟ آیا عورت پابند ہے اس دو میں سے ایک بات ماننا ہوگی؟ یا وہ کسی کی پابند نہیں، اسے اختیار ہے، وہ اپنی پرانی بدنصیبیاں بھی دور کرسکتی ہے اور نئی بدبختیوں کو بھی روندنے کا اختیار رکھتی ہے؟

حقیقت تو یہ ہے کہ عورت پر کوئی جبر نہیں ہے پرانی بدنصیبیاں تو اس علت سے پیدا ہوئیں کہ عورت کا انسان ہونا بھلا دیا گیا تھا اور نئی بدبختیاں اس سبب سے پیدا ہوئیں کہ عمداً یا سہواً اس کا عورت ہونا، اس کی طبیعی، فطری، ذمہ دارانہ حیثیت، مرکزیت، اندرونی تقاضے، خصوصی صلاحتیں طاق نسیاں پر رکھ دی گئیں۔

عجیب بات ہے کہ جب مرد و عورت کے فطری اور طبیعی اختلاف کی بات چھڑتی ہے تو ایک گروپ اسے عورت کے نقائص اور مرد کے امتیازات کا قصہ لے بیٹھتا ہے آخر کا عورت کی محرومیوں اور مرد کا مرانیوں پر تان ٹوٹتی ہے۔

محرومی وکامیابی، نقص وکمال کا مسئلہ نہیں، کارخانہ قدرت نے ایک کو ناقص دوسرے کا کامل، ایک کو کامیاب وکامران دوسرے کو محروم ونا کام نہیں پیدا کیا۔

یہی گروپ اس منطقی وفلسفی مفروضے کے بعد کہتا ہے۔اچھا،فطرت نے توعورت پر یہ ظلم ڈھادیا، وہ ناقص وکمزور پیدا ہوئی،توکیا ہم بھی اس نیا سبب بنیں اور ظلم پر ظلم کا اضافہ کریں؟اگرعورت کی طبیعی حالت کو بھلا دیں تو کیا زیادہ انسانی عمل نہیں ہوگا؟

اتفاقاً معاملہ برعکس ہے۔عورت کی فطری وطبیعی وضع سے بے توجہی اس کے حقوق پائمال ہونے کا بڑا سبب بنی۔اگر مرد محاذ لگائے اورعورت سے کہے: ہم تم برابر۔کام کاج ،ذمہ داریاں ،فائدہ ،نتائج ،سزائیں سب ملتی جلتی ہوں گی۔ بھاری اورمشکل کاموں میں شریک رہو، برابر کھڑی ہو،اپنی طاقت کے مطابق کام کرواوراسی کی بنیاد پرمزدوری۔ہم سے احترام ونگہداشت کی توقع نہ رکھو۔اپنے روزمرہ اخرجات خودمہیا کرو۔اولاد کے اخراجات میں اپنا حصہ دو۔خطرے میں اپنی حفاظت خود کرو۔ہم تم پرخرچ کرتے ہیں تم ہم پر اپنے پیسے خرچ کرو۔......توعورت،معرکے میں پھنس جائے گی کیونکہ اس کی قوت کارکردگی طبیعی طور پرکم اورروپے کاخرچ زیادہ ہے ۔ماہواری روگ، زمانہ حمل کی بے چینی، وضع حمل کی سختی،شیرخوار کی دیکھ بھال،عورت کوایسی صورت حال سے دوچار کرنے والی چیزیں ہیں جہاں اسے مرد کی سربراہی درکار رہوتی۔ذمہ داریاں کم اورآمدنی زیادہ چاہیے۔ یہ سب کچھ انسان ہی میں نہیں جوڑے جوڑے زندگی بسر کرنے والے ہرجاندار کا معاملہ یہی ہے۔تمام حیوانات میں غریزہ وفطرت کے زیراثر مادہ کی حمایت نرکافریضہ ہے وہ مادہ کی حفاظت پر کمر بستہ وحملہ آوار رہتا ہے۔

مردوزن کی طبیعی وفطری ساخت کوسامنے رکھاجائے۔انسان ہونے میں مساوی سمجھا جائے،انسانی حقوق کومشترک ماناجائے،تو''عورت'' کونہایت مناسب مقام

مل سکتا ہے، ایسا مرتبہ جہاں نہ اس کی ذات کچلی جائے نہ اس کی شخصیت کو نقصان پہنچے۔

زن ومرد کی فطری وطبیعی حیثیت کو فراموش کرنے اور صرف آزادی ومساوات پر اکتفا کریں۔ نتائج سے آگاہی کیلئے کچھ اخباری جائزہ لیتے ہیں، اور یہ جائزہ بھی ان کو جو ہم سے پہلے اس راستے سے گزرے بلکہ منزل تک پہنچ چکے ہیں۔ دیکھیے وہ کیا کہتے اور کیا لکھتے ہیں:

رسالہ ''خواندنیہا'' شمارہ ۹۷، ۱۳۳۴خ، ۴۔ تیرماہ ۱۳۵۳ش (مطابق جولائی ۱۹۷۴ء ماہ نامہ ''شہربانی'' کا مقالہ ہے۔ سرگزشتہای اززنان کارگردرجامعہ امریکہ۔ امریکی معاشرے میں محنت کش عورتوں کی سرگزشت۔ رسالہ ''کرنٹ'' کے مضمون کا ترجمہ

مقالہ پڑھنے کے قابل ہے شروع میں ایک خاتون کا درددل نقل ہے، نیز زن ومرد کی مساوات کا تذکرہ اوران رعایتوں کا بیان جو گزشتہ زمانے میں مزدور عورتوں کو دی جاتی تھیں۔ مثلاً

۲۵ پونڈ سے زیادہ وزن نہ اٹھائیں جبکہ مردوں کو یہ رعایت حاصل نہ تھی۔

آج عورت اس رعایت سے محروم ہے۔ صبوہ اھایو کی ورکشاپ ''جنرل موٹر'' عورتوں کو سزا کا مرکز کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ ڈھائی ہزار خواتین یہاں کام کرتی ہیں...... یہ خاتون ایک بڑے گیس پلانٹ کی دیکھ بھال پر متعین اور کبھی انہیں ایک بھٹی کی صفائی کرنا پڑتی ہے یہ فولادی بھٹی ۲۴ پاونڈ کی ہے جسے قوی ہیکل مرد نے سیٹ کیا ہے۔ خاتون زیرلب کہتی میں اندر سے چورا چور اور باہر سے زخمی ہو چکی ہوں...... میرا کام تھا کہ ہر لحہ ایک ہتھوڑا اٹھاؤں جس کا طول پچیس سے پچاس انچ تک اور وزن پینتیس پاؤنڈ، یہ ہتھوڑا ایک کانٹے میں لٹکانا پڑتا تھا۔ میرے ہاتھوں پر ہمیشہ ورم اور ہڈیوں میں درد رہنے لگا۔

مضمون میں ایک اور خاتون کا درد دل ، پریشانی و بے چینی کی داستان ہے۔اس کا شوہر بحریہ میں قلی تھا۔ ایک مرتبہ بحریہ کے افسر اعلیٰ نے مردانہ جہاز میں کچھ عورتوں کی بھرتی کا اعلان کیا۔لکھتی ہے ان دنو بحریہ کے ایک جہاز میں چالیس عورتیں اور چار سو اسی مرد ڈیوٹی پر بھیجے گئے۔ جب یہ جہاز اپنے مخلوط سفر سے واپس آیا تو معلوم ہوا کہ قلیوں کی بیویوں کا خوف و ہراس بے جا نہ تھا کیونکہ انہیں تھوڑی سے مدت میں معلوم ہوا کہ یہاں خالی خولی عشق کی داستانیں ہی نہیں بلکہ عورت کئی کئی اشخاص کے ساتھ جنسی آمیزش میں ملوث ہوئی ہے۔

مقالہ نگار لکھتا ہے۔''فلورائیڈ'' میں آزادی کے بعد بیوہ عورتوں کو عجیب پریشانیوں کا سامنا ہے یہاں قانون کے مطابق ہر بیوہ کا پانچ سوڈالر تک ٹیکس معاف تھا۔ایک جج ''ٹامس ٹسٹاؤ'' نے اس قانون کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ اور کہا کہ یہ قانون مردوں کے حق میں مداخلت کرتا ہے (ۃ اور صرف عورتوں کو رعایت دیتا ہے)

آگے لکھتا ہے:''مسز میک ڈانلڈ کے ہاتھوں میں سوزش (جلن) تھی،مسز انٹون (جن کے شوہر قلی تھے)اضطراب اور تشویش سے دو چار ہوتی ہے،صوبہ فلوارئیڈ میں بیوہ عورتوں پر نقد جرمانہ ہوا ہے۔اب ہر ایک آزادی کا مزہ چکھے گی۔ بہت لوگوں کے ذہن میں یہ سوال آرہا ہے کہ خواتین نے جن حقوق سے فائدہ اٹھایا تھا کیا اس سے زیادہ نقصان برداشت نہیں کر رہی ہیں؟ خیر یہ بحث بے فائدہ ہے کیونکہ کھیل شروع ہو چکا،تماشائی اپنی اپنی کرسیاں حاصل کر کے بیٹھ چکے اب کی سال طے ہوا ہے کہ امریکہ کے آئین کا ستائیسواں'' ترمیم شدہ پیراگراف'' منظور ہو جس کے مطابق جنسی اختلافات کی ہر برتری خلاف قانون قرار پائیں...... اور یوں ان بیانات کی تصدیق ہو جائے جو ہارورڈ یونیورسٹی کے استاد قانون رسکو باؤنڈ نے دیے تھے۔ امریکہ میں عورتوں کی آزادی عورت کے قانونی خصوصیات کی بنا پر افسوسناک نتائج کا باعث ہے۔

کیرولین شمالی کے سنیٹر'' مسز خانم میکڈانلڈ'' کے بقول ،ایک خاتون بھاری بوجھ اٹھانے کی وجہ سے سیلان خون کی شکایت میں مبتلا ہے۔ ہم اپنی پرانی صورت حال میں واپس جانا چاہتے ہیں ۔ہم چاہتے ہیں کہ مرد عورتوں سے عورتوں کا سلوک کریں،مزدور جیسا نہیں ۔آزادی نسواں کے حامیوں کی نظر میں یہ بات بہت معمولی ہوگی کہ اپنے شاندارڈرائینگ روم میں بیٹھ کر کہیں ۔عورت مرد برابر ہیں۔ان حضرات نے اب تک کارخانوں کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ انہیں خبر نہیں کہ اس ملک کی اکثر مزدور خواتین کارخانوں میں کام کرتے کرتے جان پر کھیل رہی ہیں۔ہمیں یہ برابری نہیں چاہیے ہم سے مردوں کے کام نہیں ہوتے ۔مرد جسمانی لحاظ سے ہم سے زیادہ مضبوط ہیں۔اگر یہ طے ہوجائے کہ ہم ان کے مقابلے میں کام کریں اور ہمارے کام کاان کے کام سے موازنہ ہو،تو ہم اپنی حد تک مستعفی ہیں۔'' صوبہ اھایو'' میں مزدوروں نے قانون تحفظ حقوق سے جو کچھ پایا ہے،اس سے زیادہ کھویا ہے ہم نے اپنی نسوانی شخصیت ضائع کردی ۔ہمیں آزادی کے بعد نہیں معلوم کہ فائدہ کیا ہوا۔ ہوسکتا ہے گنتی کی چند عورتوں نے بہتر حالات دیکھے ہوں لیکن ہم بہر حال ان میں نہیں ہیں۔''

یہ تھا اس مقالہ کا خلاصہ۔مضمون کے اندراجات سے صاف نظر آتا ہے کہ خواتین ''آزادی ومساوات'' کے نام سے جن مشکلوں اور پریشانیوں سے دوچار ہوئیں اس کے نتیجے میں انہیں ان دونوں لفظوں سے چڑھ ہوگی۔ وہ بھول میں ہیں ان دونوں لفظوں کا گناہ کوئی نہیں۔زن ومرد،دو الگ الگ مداروں کے دوستارے ہیں۔دونوں کو اپنے اپنے مداراور اپنے اپنے دائروں میں گردش کرنا چاہیے۔

لَا الشَّمْسُ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ ......[1] سورج کو حق نہیں کہ چاند پر جا پکڑے اور نہ رات دن سے آگے جاسکتی ہے ہرایک اپنے اپنے فلک میں گردش کررہاہے۔"مردوزن کی اصل سعادت اسی میں ہے کہ وہ انسانی معاشرے میں دوجنس رہ کر اپنے اپنے دائرکارمیں سفرجاری رکھے۔آزادی وبرابری کا فائدہ اسی وقت حاصل ہوگا، جب ہرایک اپنی فطری وطبیعی راہ پرچلتارہے۔ معاشرے میں خلفشار پیدا ہونے کا سبب فطرت وطبیعت کے فرمان سے سرتابی ہے۔اس کے علاوہ کوئی بات نہیں۔

"نظام حقوق خواتین،خاندان اورمعاشرے میں"ہم مدعی ہیں کہ یہ مسئلہ اساسی مسئلہ ہےاوراس پرنئے سرے سے نظرکرناچاہیے ۔گزشتہ اقدارپراکتفانہ کی جائے،ازسرنواقداردریافت ہوں۔اس بارے میں سب سے پہلے طبیعت وفطرت کورہنمااصول بنائیں۔دوسرے مرحلے میں گزشتہ اورموجودہ صدیوں کے تلخ وشیرین تجربے سامنے رکھیں اوران سے فائدہ اٹھائیں۔اس وقت تحریک حقوق خواتین صحیح معنی میں کامیاب طورپرآگے بڑھ سکتے گی۔

قرآن کریم

دوست،دشمن دونوں کے نزدیک"حقوق خواتین" کااحیاءکرنے والا۔ مخالفین کم ازکم اتناتواقرارکرتے ہی ہیں کہ زمانہ نزول میں قرآن نے"خواتین کے فائدے"اورحقوق انسانی کیلئے بڑے بڑے اقدام کیے۔لیکن قرآن مجید نے انسان کے عنوان سے"احیاءزن"اوراسے مرد کے شریک انسانیت وحقوق انسانی کے نام

---

[1] سورہ یٰسن کی چالیسویں آیت ہے:لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ۝۴۰

عورت کے عورت ہونے اور مرد اور مرد ہونے کو طاق نسیاں کے سپرد نہیں کیا۔

دوسرے لوگوں میں:

قرآن مجید نے عورت کو اسی زاویے سے دیکھا جو اس کی جبلت وطبیعت کا زاویہ ہے لہذا فرمان قرآن وفرمان طبیعت میں ہم آہنگی ہے۔قرآن میں جو عورت ہے وہی عورت طبیعت میں ہے۔اللہ کی یہ دو بڑی کتابیں۔ایک کتاب تکوین دوسری کتاب تدوین۔ایک دوسرے پر منطبق ہیں۔

مقالات کے اس سلسلے میں اگر کوئی مفید بات دکھائی دے گی تو وہ اسی انطباق وہم آہنگی کی توضیح ہوگی۔

محترم ناظرین کے سامنے مقالات کا ایک مجموعہ ہے جو ایک خاص موقع پر (۴۵،۴۶س مطابق ۱۹۶۷ء۱۹۶۶ء) کے رسالہ زن روز کیلیئے لکھے گئے تھے۔موضوع تھا ''قانون اسلام میں خواتین'' (زن در حقوق اسلامی) مقالات نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔جن حضرات کو گزشتہ معاملات سے رابطہ نہیں یا اس ماجرے میں موجود نہ تھے، ان کو حیرت ہوگی۔یہ مقالات پہلی مرتبہ اس رسالے میں چھپے تھے! میں نے مقالات کے اس سلسلے کیلیئے اس رسالے کو کیسے منتخب کیا؟ وہ رسالہ بھی انہیں چھاپنے کے واسطے کیونکر آمادہ ہوا اس بنا پر ''شان نزول'' مقالات کا بتانا ضروری ہے۔

۱۳۴۵ خورشیدی (۱۹۶۶ء) میں ''قوانین مدنی'' کا ''حقوق خانوادگی'' بدلا جانے والا تھا، رسائل کی سطح پر، خصوصاً، خواتین کے رسائل مسئلے کو لے اڑے، چونکہ اکثر تجاویز، جو تھے وہ کھلم کھلا آیات قرآن کے برعکس تھے۔اس کے نتیجے میں مسلمانان ایران میں بے چینی دوڑ گئی۔مرحوم ابراہیم مہدوی زنجانی، جج اس ہنگامے میں سب سے زیادہ خاک اڑا اور گرمی دکھا رہے تھے۔موصوف نے چالیس نکاتی منشور تیار کیا، اور مجلہ ''زن روز'' میں شائع کیا۔مذکورہ رسالے نے جدول دار صفحات

میں۔اس دور کی زبان میں ''کوپن'' بنا کر چھاپا اور اپنے پڑھنے والوں سے ان نکات پر رائے طلب کی۔ ادھر قانونی منشور لکھنے والے نے مخالف رائے دینے والوں کا جواب لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔

انہی دنوں تہران کے ایک عالم جلیل ومحترم نے مجھے ٹیلیفون کیا ادارہ کیھان وادارہ اطلاعات کے مدیر حضرات سے انہوں نے ملاقات کی اوران دونوں اداروں سے نکلنے والے زمانے رسائل میں جومضامین چھپے ہیں۔ان پر اظہار خیال فرمایا۔ دونوں حضرات نے کہا کہ اگر آپ رائے دیں تو ہم اسے بعینہ چھاپنے کا وعدہ کرتے ہیں۔

موصوف محترم نے واقعہ بیان کرنے کے بعد مجھ سے فرمایا کہ اگر وقت اورفرصت اجازت دے تو یہ کام انجام دوں۔ یعنی ہر شمارہ پڑھوں اورضروری نوٹ لکھوں میں نے کہا کہ اگر میری بات پر رسالے میں جوابی حاشیہ نہ لکھا جائے تو میں تیار ہوں لیکن جناب مہدوی نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ رسالہ ''زن روز'' میں اپنے چالیس نکات کی حمایت کے سلسلے میں اسی رسالے کیلئے مقالات لکھیں گے میں بھی تیار ہوں کہ اسی مجلہ میں مقابل کے صفحے پر بحث کروں یوں دونوں نظریوں کے دلائل افکار عوام کے سامنے آجائیں گے۔

موصوف مکرم نے کچھ دن کی مہلت مانگی وہ ان لوگوں سے دوبارہ رابطہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔اس کے بعد مجھے ٹیلیفون پر رسالے کی طرف سے میری پیش کش منظور ہونے سے مطلع فرمایا۔اس واقعے کے بعد میں نے اس رسالے کو خط لکھا،جس میں ''قوانین مدنی[1]'' جہاں تک فقہ اسلام کے مطابق ہوں گے میں ان کا دفاع کروں گا۔مگر میرے اور جناب مہدوی کے مقالات آمنے سامنے اور برابر برابر اسی

---

[1] CIVILLAW

رسالہ میں شائع ہوں ۔ ضمنی طور پر یہ بھی لکھا تھا کہ اگر مجلہ کو میری تجویز منظور ہے تو میرا اصل خط مع علامت منظوری رسالے میں شائع کر دیں۔ رسالے نے یہ بات منظور کر لی اور متن خطب شمارہ ۸۷۔ مجریہ ۷/۸/۴۵ ش (۲۹ اکتوبر ۱۹۶۶ء) میں چھاپ دیا اور میرا پہلا مضمون شمارہ نمبر ۸۸ میں شائع ہو گیا۔

مطالعات کے دوران ''حقوق زن'' پر مہدوی صاحب کی کتاب پڑھ چکا اور ان کی منطق و نظائرے باخبر تھا۔ اس کے علاوہ مجھے بذاتہ ''اسلام میں عورت کے حقوق'' کے موضوع سے گہری دل چسپی تھی اور بہت سی یادداشتیں لکھ رکھی تھی۔ مہدوی صاحب کے مقالات اور یہ مقالات آمنے سامنے چھپنے لگے۔ ظاہر ہے میں نے بات وہیں سے شروع کی جہاں سے موصوف نے بات چھیڑی تھی ۔ ان مقالات کے سلسلے نے موصوف کو سخت مشکل میں ڈال دیا۔ ابھی چھ ہفتے سے زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ان کا ہارٹ فیل ہو گیا اور جواب نویسی سے فراغت مل گئی ۔ ان چھ ہفتوں میں یہ مقالات کے تسلسل کو براہ راست جاری رکھنے کا مطالبہ کیا۔ اور میں اس خیال سے متفق ہو گیا۔ اور تینتیس قسطوں تک یہ سلسلہ جاری رہا ان مقالوں کی تحریر کا یہ پس منظر تھا۔

میرے پیش نظر جو مسائل تھے ان میں سے کچھ مباحث ان تینتیس مقالوں میں لکھ سکا۔ اس سے زیادہ حقائق لکھنا باقی ہیں ۔لیکن میں اپنی تھکن اور مصروفیات کی بنا پر انہیں لکھنے اور مرتب کرنے سے رکا رہا۔ اور دلچسپی رکھنے والے حضرات کا مطالبہ اس وقت اب تک یہی رہا کہ انہیں دوبارہ کتابی صورت میں چھاپا جائے۔ میں وقت کا منتظر تھا کہ اس کام کو مکمل طور پر ''اسلام میں عورت کے حقوق'' کے نام یکجا چھپواؤں ،لہٰذا مکرر اشاعت پر تیار نہ ہوا۔ آخر کار جب یہ محسوس ہوا کہ اب مجھ سے خود مجھے یہ امید رکھنا ٹھیک نہیں تو جو کچھ موجود تھا، اسی کو کافی سمجھا۔

سلسلہ وار مقالات میں جو مسائل زیر بحث آئے ہیں ان کی سرخیاں

خواستگاری (منگنی) ازدواج موقت (متعہ)۔عورت اورمعاشرتی استقلال۔اسلام اورزندگی میں جدیدیت۔قرآن میں عورت کا درجہ۔حیثیت وحقوق انسانی۔خاندانی حقوق کی طبیعی بنیادی۔زن ومرد میں فرق۔مہرونفقہ۔میراث۔طلاق۔تعددازواج۔

جومسائل رہ گئے اور یادداشتیں تیار ہیں:

خاندان میں مرد کا حق حکومت۔حق پرورش اولا۔عدہ اوراس کا فلسفہ۔ عورت اوراجتہادوفتویٰ۔عورت اورسیاست۔عورت عدالتی ضوابط۔عورت اورسزا کے دستور۔عورت کے اخلاق وتربیت۔عورت کالباس۔جنسی اخلاق۔غیرت۔عفت۔حیاوغیرہ۔ ماں کے مراتب۔عورت اورباہر کے کام کاج نیز دوسرے معاملات۔

اگرخدانے توفیق عنایت فرمائی تو یہ حصہ بھی جمع وتدوین کے بعد جلددوم کی صورت میں چھپے اورشائع ہوگا۔

میں اللہ سے توفیق وہدایت کی دعا کرتا ہوں

۲۸ شہریور ماہ ۱۳۵۴ ہجری شمسی

بمطابق ۳۔رمضان المبارک ۱۳۹۴ ہجری قمری۔(۱۹۔دسمبر ۱۹۷۴ء)

مرتضیٰ مطہری

پیش گفتار

عائلی روابط کے بین الاقوامی مشکلات

آزاد رہیں یا مغرب کی تقلید کریں۔

تاریخ کا جبر۔

ایرانی معاشرے میں مذہبی رجحانات

خلاصہ از مولف

مجھے خوشی ہے۔ رسالہ ’’زن روز‘‘ نے میری خواہش قبول کی اور رسالے میں شائع شدہ عائلی قوانین کے بارے میں چالیس نکاتی منشور پر میرے ان مقالات کو شائع کرے گا جو ’’قانون مدنی ایران‘‘ میں ترمیم و تنسیخ سے مربوط ہیں۔ میں نے ایک خط میں اپنی آمادگی کی جو شرط لکھی تھی، رسالے نے خط کی اشاعت کے ساتھ اسے منظور کرلیا ہے۔

میں نے اپنے خط میں یاددلایا ہے، میں ’’قانون مدنی‘‘ کا دفاع کرنا نہیں چاہتا نہ یہ کہنا ہے کہ وہ قانون جامع وکامل ومکمل اور سوفی صد قانون اسلام اور صحیح معاشرتی اقدار کے مطابق ہے۔ بلکہ مجھے بھی اس پر اعتراضات ہوسکتے ہیں۔ نیز میں اپنے عوامی اکثریت کا رویہ بھی صحیح ومطابق انصاف نہ جاننے کی بات بھی نہیں کرنا چاہتا۔ ان باتوں کے برخلاف خاندانی تعلقات میں بدنظمی وسراسیمگی بہرحال دیکھ رہا ہوں، اور اس سلسلہ میں اساسی اصلاحات کا قائل ہوں۔

’’کتاب انتقاد برقوانین اساسی ومدنی[۱]‘‘ اور ’’پیان مقدس یا میثاق ازدواج[۲]‘‘ کے جیسے مصنفین کی طرح ایرانی مردوں کو سوفیصدی بری نہیں سمجھتا نہ سارے عیب قانون مدنی کے ذمہ لگاتا ہوں نہ میری رائے میں اصلاح کی صرف ایک تدبیر ہے، قانون مدنی کے دفعات کی مکمل تبدیلی نہ میرے نزدیک قانون مدنی کا فقہ اسلام کے زیر ہونا کوئی عیب ہے۔ اور یہ صحیح ہے کہ قانون مدنی کے دفعات کی تبدیلی

---

[۱] منوچہریاں، بانومہرانگیز۔ ’’انتقاد برقانون اساسی ومدنی ایران۔‘‘

[۲] زنجانی، ابراہیم مہدوی۔ ’’پیان مقدس یا میثاق ازدواج‘‘ نام بتاتا ہے کہ مصنف عیسائی فکر سے متاثر ہے اور اسلام کے فلسفے کو نظرانداز کررہا ہے۔

کے علاوہ اصلاح کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ میں قوانین اسلام کے ان دفعات پر گفتگو کروں گا جس کا تعلق ''حقوق زن وشوہر'' سے ہے اوران کے روابط یااولاد یاباہر کے افراد سے تعلقات پر نظر ڈالوں گا۔ جہاں جہاں اشارہ کیااوران کی تبدیلی کی تجویز رکھی گئی ہے ۔میں ایک ایک نکتے کوان مقالات میں زیر بحث لاکر ثابت کروں گا کہ یہ قوانین گہری نظر ڈالنے سے نفسیاتی ،طبیعی ومعاشرتی تقاضوں کے مطابق ہیں اورعورت ومرد کی حیثیت اور انسانی شرافت کاان میں لحاظ رکھا گیا ہے۔ اگران پر عمل کیاجائے اوراچھی طرح نافذ کیے جائیں تو خاندانی روابط میں خوبیوں کے ضامن ہیں۔

محترم پڑھنے والوں کی اجازت سے بحث میں داخل ہونے سے پہلے چند نکتے پیش کرتا چلوں:

عائلی روابط کے بین الاقوامی مشکلات

خاندانی اورعائلی تعلقات کی مشکل کا حل اتنا آسان نہیں ہے کہ جیسے آج کل لڑکے لڑکیوں کوسوالنامے دیدے جاتے ہیں کہ انہیں پر کردیں یا ایسے سمینار منعقد کیے جائیں جوہم روزانہ دیکھتے سنتے رہتے ہیں اورہمیں ان کی فکری سطح معلوم ہے۔ پھر یہ کہ ان مسائل کا حل ہمارے ہی ملک کا کام نہیں اسے دوسرے ممالک بھی حال نہیں کر سکے ہیں، نہ کسی حقیقی حال کا کسی نے دعویٰ کیا ہے [1]

''ویل ڈیورانٹ'' تاریخ تمدن پر مشہور فلسفی ومصنف کہتاہے: فرض کریں ہم 2000ء میں ہیں۔ اورمعلوم یہ کرنا چاہتے ہیں کہ بیسویں صدی کے ربع اول میں سب سے بڑاواقعہ کیاہواتھا؟ اس وقت ہمیں اندازہ ہوگا کہ وہ واقعہ جنگ

[1] یہ تجربہ ایران ہی میں کیوں کیا جائے۔مترجم۔

یا انقلاب روس نہیں ، بلکہ بڑا واقعہ خواتین کی وضع میں تبدیلی ہے۔ ایسا ن چھٹکا لگانے والا واقعہ اور وہ بھی مختصر سی مدت میں تاریخ نے بہت کم دیکھا ہوگا۔ ہمارا مقدس گھر، جو ہمارے معاشرتی نظم وترتیب کا بنیادی پتھر تھا درہم برہم ہوگیا۔ میاں بیوی کا وہ رویہ نہ رہا جو ہوس رانی اور انسانی ہیت کی تبدیلی کیلئے رکاوٹ تھا۔ وہ پیچیدہ اخلاقی ضابطے ختم ہوگئے، جنہوں نے ہمیں جنگلی زندگی سے تمدن وآداب معاشرت سے آگاہ کیا تھا۔ اوراب کھلم کھلا ہم اس اخلاق کو چھور کر ایسے عالم میں منتقل ہو چکے ہیں، جہاں زندگی کی صورت وشکل اور فکر و ذہن سب کچھ ایک شکنجہ میں ہے۔

خاندانی نظم ونسق کی بربادی ،ازدواجی رشتہ کی کمزوری ، جوانوں کا شادی کے بوجھ اٹھانے سے فرار، مادری رشتے سے نفرت ۔اولاد سے ماں باپ کے رابطے کی نااستواری خصوصاً مادری تعلق (کاانقطاع) آج کی عورت کا شرافت سے دست بردار ہوکر گھٹیا قسم کی عشق بازی پراتر آنا۔ روزافزوں طلاق کا زور،میاں بیوی میں خلوص ومحبت کی نایابی اس صدی کے آخری ربع میں بڑے زوروشور کے ہنگامے اورفریادیں سنائی دے رہی ہیں۔

آزادرہیں یا مغرب کی تقلید کریں؟

افسوس کی بات ہے۔ کچھ بے خبر لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ گھریلو زندگی کے مسائل ایسے ہی ہیں جیسے ٹیکسی ،بس ،ٹریفک کنٹرول ، واٹر پمپ بجلی کی لائن کا کام، مدت ہوئی یورپ میں ختم وآسان ہو چکا ہے اسی طرح یہ مسائل بھی ہماری نالائقی کی وجہ سے حل نہیں ہوئے ۔ہمیں یورپ کی تقلید و پیروی کر لینا چاہیے۔

دراصل یہ خام خیالی ہے، یورپ والے ان مسائل میں زیادہ مجبور، زیادہ جکڑے ہوئے ہیں، ان کے سمجھ دار لوگ بری طرح سے چیخ رہے ہیں، تعلیم نسواں کے

مسائل سے لے کر تمام معاملات میں اہل مغرب کی پریشانیاں ہم سے کہیں زیادہ ہیں۔اور گھریلوی خوش نصیبی تو انہیں نصیب ہی نہیں ہے۔

تاریخی جبر [1]

کچھ لوگ سمجھتے ہیں، گھریلو زندگی میں بدنظمی وکمزوری اوراندروں خانہ فسادوتباہی کا باعث، عورت کی آزادی ہے،اورخواتین کی آزادی نتیجہ ہے،علم وتمدن کے فروغ،اور صنعتی ترقی، یہ ایک تاریخی جبر ہے جسے برداشت کرنا پڑے گا۔ بدنظمی اور پرانے زمانے کی خاندانی خوش حالی سے رخ موڑنے پر تیار ہونا چاہیے۔

اگر ہماری یہ سوچ ہے تو بڑی سطحی اور گھٹیا سوچ ہے۔ٹھیک ہے صنعتی زندگی بہرحال گھریلوتعلقات پراثرانداز ہوئی ہے اور یہ اثر پڑتا رہے گا لیکن یورپ کے اندرخاندانی روابط کی ٹوٹ پھوٹ میں دواور چیزوں کا دخل ہے:

ایک وہ رسم ورواج جوظالمانہ قانون اور جاہلانہ ضابطوں کے طور پر اس صدی سے پہلے ان کے یہاں رائج تھے،اورانہیں بالادستی حاصل تھی، حد یہ ہے کہ عورت پہلی مرتبہ مالکیت کے حق سے انیسویں صدی یا بیسویں صدی کے اوائل میں بہرہ مند ہوئی، یورپ میں اسے مالک ماننے کا زمانہ اب آیا۔

دوسری بات اصلاح احوال کی ہے۔ جولوگ خواتین کے مسائل میں بہتری پیدکرنے اٹھے وہ ایسی راہ چلے جوآج کل ہمارے روشن خیالوں نے اختیار کررکھی ہے، اوراس کانمونہ چالیس نکاتی قانونی منشور یا مسودہ ہے۔ یہ لوگ خاتون کی بھویں بنانے سنوارنے اٹھے اور کی آنکھیں پھوڑ بیٹھے۔

مشینی زندگی کی ذمہ داری سے زیادہ ذمہ داری اوراس تباہی بربادی کا بوجھ

---

[1] تاریخ جبر یعنی.HISTORICAL DETERMINISM

یورپ کے پرانے قوانین اور پھر جدیدیت پرست لوگوں پر ہے جنہوں نے نئے اصلاحات کا ڈھونگ رچایا۔لہٰذا ہم مشرق کے رہنے والوں کو اس کی ضرورت ہی نہیں کہ ہم بھی اسی راستے پر چلیں جو رہ وہ چل چکے ہیں اور جس دلدل میں وہ پھنسے ہم بھی پھنسیں۔ہمیں یورپی زندگی کا مطالعہ بڑی ہوشیاری سے کرنا چاہیے علوم صنعت تکنیک اور معاشراتی ضابطے جو بھی قابل تعریف ہوں، انہیں غور سے دیکھیں۔ انہیں قبول کرنے ان کی تقلید کرنے اور ان کے رسم ورواج اور قانون قاعدوں کو اپنانے میں ان ہزاروں بدنصیبیوں پر بھی نظر رکھیں جن سے اہل یورپ دوچار ہیں۔خود قانون مدنی ایران اور گھریلو تعلقات پر یورپ کے قوانین کا انطباق بھی قابل احتیاط ہے ہم کو اہل یورپ کی تقلید سے بہت احتیاط کرنا چاہیے۔

اساسی قانون اور ہم

۲۔اس سے قطع نظر کہ یہ تجاویز خانہ برانداز ہیں اور نفسیاتی طبیعی و معاشرتی تقاضوں سے ان کو جوڑ بھی نہیں ...... تفصیل آگے لکھیں گے......خود اساسی قانون سے ان کی تطبیق کیسے ہوگی؟ دستور تو یہ ہے کہ ......جو قانون شریعت اسلامی کے خلاف ہوگا اسے ''قانونیت'' ہی حاصل نہ ہوگی۔ وہ اسمبلی میں پیش ہی نہیں ہوسکتا۔ اور ان تجاویز کے اکثر دفعات واضح طور پر مخالف قانون اسلام ہیں۔ کیا مغرب کے باشندے اسی طرح اپنے آئین سے کھیلتے ہیں جیسے ہمارے مغرب زدہ ان کی اندھی تقلید میں ان کے پیچھے دوڑ لگانا چاہتے ہیں؟

مذہب سے قطع نظر، ہر ملک کا قانون اساسی اس ملک والوں کیلئے مقدس ہوتا ہے۔ایران کا قانون اساسی بھی تمام ملت ایران کیلئے قابل احترام ہے کیا نام نہاد سمینار، سوالناموں کی اشاعت اور اسمبلی کے ممبروں کی اٹھک بیٹھک سے قانون

اساسی کو روندا جا سکتا ہے؟

ایرانی معاشرے کے مذہبی رجحانات

۳۔ تجویزوں کے عیوب اوران کی قانون اساسی کے خلاف ہونے کونظرانداز کرنے کے بعد، ہر چیز کا انکار ممکن ہے مگر یہ بات جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ ملت ایران پرجس رجحان واحساس کا غلبہ وحکومت ہے ان میں سے سب سے بڑا جذبہ مذہبیت اسلامی ہے ان معدودے چند کو چھوڑیے جنہوں نے سب کچھ چھوڑ رکھا ہے۔ ہر چیز کی پابندگی سے آزاد اور ہر شوروشر کے طرفدار ہیں۔ ہمارے عوام کی اکثریت مذہبی اصولوں کی پابند ہے۔

پیش بندی کے باوجود تعلیم اور تعلیم یافتگی سے یہ نہ ہوسکا کہ وہ عوام اور اسلام کو الگ الگ کردے۔اس کے برعکس صحیح قسم کی مذہبی تبلیغ کمزور ہونے کے باوجود کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ جواں مذہب کی طرف دن بہ دن زیادہ مائل ہورہے ہیں۔ حالانکہ استعماری طاقتیں مذہب کے خلاف زیادہ سے زیادہ پروپیگنڈے میں مصروف ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس قسم کے نفسیاتی ماحول میں --جو بہرحال بن چکا ہے ۔کیسے موزون ہوگا کہ رائج الوقت قانون ایسا بنایا جائے جوعوام کے نزدیک شریعت اسلام سے مطابقت نہ رکھتا ہو؟ ایسے سوال نامے سے کیا نتیجہ حاصل ہوسکتا ہے؟

فرض کریں، غصے اوراختلاف کے نتیجے میں ایک عورت عدالت سے رجوع کرکے شوہر کی رضا کے برعکس طلاق حاصل کرلیتی ہے۔اورکسی دوسرے کے عقد میں چلی جاتی ہے۔ رائج قانون کے مطابق وہ میاں بیوی کہلاتے ہیں،مگران کے مذہبی وجدان کی گہرائی کوبھی دیکھیے وہ دونوں ایک دوسرے کوغیر سمجھتے ، وہ جنسی عمل کو

غیر شرعی جانتے اور اپنی اولاد کو زنا زادہ اور مذہبی نقطہ نظر سے گردن زنی فرض کرتے ہیں۔

اس صورت حال میں ذرا غور تو کریں کسی قدر سنگین اور نفسیاتی لحاظ سے پریشان کن مشکل میں وہ گرفتار ہوں گے۔ان کے مذہبی دوست اور رشتے دار، انہیں کس نظر سے دیکھیں گے؟ ہم وضع قانون سازی کے ذریعہ لوگوں کے مذہبی احساسات تو نہیں بدل سکتے خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اکثیریت بلکہ قریب قریب سب ہی لوگ مذہبی احساسات سے شرشار، ورنہ اس جذبے سے خالی تو بہر حال نہیں ہیں۔

اگر آپ بیرون ملک سے کسی ماہر کو بلا کر مشورہ کریں ان سے پوچھیں کہ ہم اس قسم کے قوانین وضع کرنا چاہتے ہیں۔مگر ہمارے عوام کا مذہبی ماحول یہ ہے، اور ان کے نفسیات یہ ہیں۔ پھر دیکھیے وہ ایسے ماحول میں آپ کے حق میں رائے دیتا ہے؟ وہ یہ نہ کہے گا کہ ایسا اقدام ہزاروں روحانی اور سماجی پریشانیاں پیدا کرنے کا سبب ہوگا؟

اس قسم کے قوانین کا، قوانین سزا سے مقابلہ غلط ہے۔اس کے نتائج بہت برے نکلیں گے ۔دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے ۔قوانین سزا کی ترمیم تنسیخ سے سماج کا ایک حصہ متاثر ہوا ہے اور اسی پر چوٹ پڑتی ہے منحرف گروہ جری ہو جاتا ہے۔لیکن ''میاں بیوی کے رشتے'' اور اولاد کی نجی زندگی سے متعلق قوانین کی نوعیت یہ نہیں اس سے فرد اور افراد کی نجی زندگی کا تعلق ہے۔ یہ بات براہ راست آدمی کے شخصی مذہبی جذبے سے جنگ ہے۔اس طرح کے قانون یا اس لیے بے اثر ہو جائیں گے کہ مذہب و مذہبی رجحانات کا غلبہ ہے۔ یا خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے ان قوانین سے بدامنی پیدا ہوگی ۔پھر یا تو یہ قانون عملاً بے کار ہو جائیں گے یا اندرونی وجذباتی ونفسیاتی جانکاہی کے بعد مذہبی طاقت کو کمزور بنا دیں گے۔

آغاز کتاب

پہلا حصہ

خواستگاری

کیا مرد کی طرف سے خواستگاری، عورت کی توہین ہے؟
مرد کی فطرت، طلب و نیاز۔ عورت کی فطرت جلوہ و ناز ہے۔
مرد خریدار وصال ہے عورت کا خریدار نہیں ہے۔
حیثیت واحترام خواتین کے تحفظ کا دانشمندانہ اور نفس طریقہ منگنی ہے۔
قانون مدنی کے چالیس نکات کے مصنف کی غلط فہمی

خلاصہ از مؤلف

خواستگاری

ہم اپنی گفتگو کا آغاز ''چالیس'' نکات میں اسی نقطے سے کررہے ہیں جواس پیش نہاد میں حرف آغاز ہے ''قانون مدنی'' کی ترتیب کے مطابق پہلی بات سے منگنی اورنام زدگی۔

باوجودیکہ قانون مدنی میں خواستگاری (منگنی) اورنام زدگی کا تذکرہ ہے لیکن چونکہ اس کاتعلق براہ راست اسلام سے نہیں ہے ،یعنی ''نص'' اورصریحی حکم اسلام اس سے مربوط ہم تک نہیں پہنچاہے اورقانون مدنی نے اس بارے میں جوکچھ کہاہے وہ اسلام کےقواعدکلیہ سے ایک استنباط (نتیجہ اخذکرنے کی کوشش) ہے اس بناپرہم ''قانون مدنی'' کے دفاع کے ذمہ دارنہیں ہیں۔ہم تجویزیں پیش کرنے والے کے جزئیات نظرسے بحث میں حصہ نہیں لیں گے۔ حالانکہ تجویزکنندہ اس بارے میں بڑی بڑی غلط فہمیوں میں مبتلا ہوئے ہیں۔حتیٰ کہ موصوف چندسادہ دفعات کے صحیح مفہوم سمجھنے سے بھی قاصر رہے۔

ہاں،دومقصدایسے ہیں جنہیں نظراندازنہیں کرسکتے۔

کیامردکی طرف سےخواستگاری عورت کی توہین ہے؟

۱۔تجاویزپیش کرنے والے کابیان ہے:

''ہمارے قانون سازنے موجودہ دفعات (خواستگاری ونامزدگی) میں بھی اپنے رجعت وغیرانسانی نکتے کونہیں بھولاکہ مرداصل ہےاورعورت اس کی ضمن اسی خیال کے زیراثردفعہ نمبر ۱۰۳۴ کوکتاب نکاح وطلاق

میں ''پہلی دفعہ قرار دیا اور یوں لکھا ہے --''دفعہ ۱۰۳۴ موانع نکاح سے خالی عورت کی خواستگاری ہوسکتی ہے'' آپ نے ملاحظہ فرمایا بموجب دفعہ مذکورہ باوجودیکہ کوئی پابندی بیان نہیں کی گئی ہے۔لیکن ''ازدواج'' کے معنی ہوتے ہیں،مرد کا'' عورت لینا'' مرد خریدار و مشتری تسلیم کیا گیا ہے اور اس کے مقابل عورت کو ایک ''سواد'' ظاہر کیا ہے '' معاشرتی قوانین میں ایسی تعبیر انتہائی ناگوار اور برے تاثرات پیدا کرتی ہے ۔قانون ازدواج میں ،زن و مرد کے تعلقات پر خاص طور سے برا اثر ڈالتی ہے اس میں مرد کو'' آقائی'' اور مالکیت ،عورت کو مملوک یا کنیزہ کا درجہ دیا گیا ہے۔''

اس گہری نفسیاتی نظر کے بعد! تجاویز کے مرتب نے''خواستگاری کے ذیل میں جو دفعات لکھے ہیں ۔ان میں ''خواستگاری'' کو خواتین اور مردوں کیلئے یکساں قرار دیا ہے۔تا کہ ''عورت لینا'' جو یک طرفہ بات ہے اسے ختم کردیں ''زن گرفتن'' کے مقابلے میں ''مرد گرفتن'' بھی ہونا چاہیے۔یا پھر نہ ''عورت لینا'' کہا جائے نہ ''مرد لینا'' --اچھا اگر ''عورت لینا'' کہیں یا لڑکی کا رشتہ مانگنا مرد کا فریضہ قرار دیں تو گویا عورت کی حیثیت گرادی،اور اسے قابل خرید سواد بنا دیا۔

مرد کی فطرت طلب و نیاز عورت کی فطرت جلوہ و ناز

اتفاقاً بڑی غلط فہمیوں میں سے ایک غلط فہمی یہ بھی ہے۔اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ زیر نظر تجاویز میں ''مہر ونفقہ'' کو ختم کر دیا گیا ہے۔مہر ونفقہ پر ہم تفصیل سے بحث کریں گے۔

عہد قدیم سے مرد عورت کے گھر جاتے اور لڑکی کا رشتہ مانگتے ہیں یہ رسم حیثیت و احترام عورت کا بہت بڑا سبب ہے ۔فطرت نے مرد کو طلب و عشق و تقاضا کا مظہر بنایا اور عورت کو مطلوب مدعا اور معشوق ۔۔عورت کو فطرت نے گل ۔ مرد کو بلبل عورت کو شمع مرد کو پروانہ پیدا کیا۔ یہ حکیمانہ تدبیر اور خلقت کا شاہ کار ہے۔ کہ مرد کی طبیعت (غریزے) میں طلب و نیاز اور عورت کے غریزے میں جلوہ و ناز قرار دیا۔ عورت کی جسمانی کمزوری، مرد کی قوت جسمانی کے اس پہلو سے ہموار کر دی۔

عورت کا مرد کے پیچھے دوڑنا اس کے وقار و شخصیت کے خلاف ہے۔ مرد کسی عورت کے بارے میں منگنی کو جائے اور لڑکی والے رشتہ ٹھکرا دیں تو مرد برداشت کر سکتا ہے وہ دوسرے گھر اور وہاں سے تیسرے گھر جا کر درخواست کر سکتا ہے تا آں کہ اس کی درخواست قبول ہو اور کوئی خاتون اس کی رفیق زندگی بننے پر تیار ہو عورت جو محبوب و معشوق بن کر اپنی پو چا کراتی اور مد کے دل میں جگہ حاصل کر کے مرد کے پورے وجود پر حکومت کرنا چاہتی ہے اس عورت کی فطرت میں یہ نہیں ہے کہ ایک مرد سے شادی کی درخواست کرے اور اتفاقاً نفی میں جواب سن کر دوسرے مرد کے سراغ میں نکلے۔

مشہور امریکی فلسفی ''ولیم جیمز'' کے خیال میں: حیا اور حسین خودداری عورت کی فطرت میں نہیں ہے۔ حوا کی بیٹیاں پوری تاریخ سے سیکھتی رہی ہیں کہ مردوں کے پیچھے نہ دوڑنے ہی میں ان کی عزت و احترام ہے وہ اپنے تئیں نہ گرائیں اور مردوں کی دسترس سے دور رہیں۔ خواتین نے تاریخ سے یہ سبق سیکھا اور اپنی بٹیوں کو یاد کرایا۔

جنس انسان ہی کو خصوصیت نہیں دوسرے جانوروں کا رویہ بھی یہی ہے۔ نر کی جنس پابند ہے کہ وہ جنس مادہ کیلئے نیاز و دیوانگی لطف اور خودداری اور پر لطف بے نیازی کا اظہار کرے، اور سخت دل ہم جنس کو جتنا زیادہ ہو سکے، اپنے قابو میں لے تا کہ

وہ قلبی جذبات اور اپنی ارادہ واختیار سے خدمت گزاری کیلئے تیار ہو۔

مرد خریدار وصال ہے عورت کا خریدار نہیں

تعجب ہے۔فرماتے ہیں:۔ قانون مدنی نے ایسا لہجہ کیوں اختیار کیا جس سے یہ معلوم ہو کہ مرد عورت کا خریدار ہے؟ --پہلے تو اس کا تعلق قانون مدنی سے ہے نہیں۔یہ تو قانون تخلیق سے متعلق بات ہے۔دوسرے ہر خریداری، چیز کو مالکیت وملکیت ہی کیلئے ہوتی ہے؟ ہنر دوست، ہنرور کا خریدار ہوتا ہے کیا اس کی تعبیر ملکیت سے ہو سکتی ہے؟ اس عمل کا نام مالکیت رکھتا جائے؟ اور عالم وصاحب فن کی حیثیت کے خلاف قرار دیں؟ مرد وصال زن کا خریدار ہے۔اس کی ذات کا گاہک نہیں ہے کیا سچ مچ آپ حافظ شرین سخن، حافظ کو، اہانت جنس خواتین کا مجرم سمجھتے ہیں؟ وہ کہتا ہے:

شیراز معدن لب لعل است وکان حسن
من جوہر مفلس ازآں رومشوشم
شہریست پرکرشمہ وخوباب زشش جہت
چیز یم نیست ورنہ ''خریدار'' ہر ششم

شیراز خزانہ لب لعلیں اور مرکز حسن ہے وہ خود شیزاز کا جوہری ہے مگر مفلسی کی بنا پر تشویش ہے کہ شہر کی شش جہت میں حسین ہیں اور ناز وانداز۔ہائے، اس کے پاس کچھ نہیں ورنہ وہ چھ کی چھ سمتیں خرید لیتا۔حافط کو حسرت ہے اس کے ہاتھ خالی ہیں ورنہ وہ سب کچھ حسینوں پر قربان کر دیتا، ان کی نگاہ التفات حاصل کر لیتا۔ یہ مرتبہ نسوانیت کی توہین ہے؟ یا زندہ وجذبات دل میں عورت کے بلندی مرتبہ کا اظہار کہ مردانگی ودلیری کے باجوود بارگاہ حسن وجمال خاتون میں عاجزی وانکساری کا اظہار کر رہا ہے۔خود نیاز مند اور اسے بے نیاز بتا رہا ہے۔

عورت کی ہنرمندی کی انتہا یہ ہے کہ وہ جہاں اور جس جگہ بھی ہے، مرد کو اپنے آستانے پر بلائے۔

غور کیا آپ نے حقوق خواتین کے نام سے عورت کے کتنے بڑے اعزاز وشرف اور اس کی حیثیت کو داغدار کیا جاتا ہے؟

یہی بات میں نے کہی تھی کہ محترم حضرات بے چاری عورت کی بھوؤں کو آراستہ کرنے کے بہانے اندھا بنانا چاہتے ہیں۔

حیثیت واحترام خواتین کے تحفظ کا دانشمندانہ ونفیس طریقہ منگنی ہے

میں نے عرض کیا، قانون تخلیق میں مرد کو مظہر نیاز وطلب قرار دیا گیا ہے عورت مظہر مطلوبیت وجواب بنائی گی ہے یہی نکتہ عورت کی شخصیت واحترام کی ضمانت مہیا کرتا ہے جو مرد کی قوت جسمانی کے مقابلے میں اس کی کمزوری تخلیق کو متوازن کرتا ہے۔اسی سے مشترک زندگی میں توازن وبرابری پیدا ہوتی ہے۔یہ جذبہ ایک قسم کا طبیعی امتیاز ہے جو عورت کو عطا ہوا ہے اور ایک قسم کا تقاضائے خمیر ہے جو مرد کے حوالے کیا گیا ہے۔

جب انسان قانون بنانا چاہیں۔دوسری لفظوں میں جب قانونی انتظامات کی ضرورت ہو تو عورت کے اس امتیاز کو عورت کیلئے اور مرد کی اس ذمہ داری کو مرد کیلئے ملحوظ رکھنا چاہیے۔زن ومرد کی یکسانیت پر مبنی قوانین میں ذمہ دری وادب کے زاویے خواستگاری کا دستور۔عورت کے نفع اور احترام کو نقصان نہ پہنچائے اور دونوں میں برابری کے معنی یہ ہیں کہ دونوں میں توازن رہے، چاہے دیکھنے میں مرد کی رعایت

ہولیکن درحقیت طرفین کی بھلائی پائی جائے۔

اس بنیاد پر ''چالیس نکات'' پیش کرنے والے نے جو دفعہ عورت کوخواستگاری کا پابند کرتی ہے بے وزن ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں اس سے انسانی معاشرے کو نقصان پہنچے گا۔

چالیس قانونی نکات مرتب کرنے والے کو قانون مدنی سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی!

اس پیرگراف میں جس دوسرے نکتے پر متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ جناب مہدوی کی ایک غلط فہمی ہے۔موصوف نے زن روز کے شمارہ نمبر ۸۶ صفحہ ۲۷ پر لکھا ہے:

''دفعہ نمبر ۱۰۳۷ کے بموجب جن دو کے درمیان رشتہ طے ہوجائے۔اس بعد معقول سبب کے بغیر اسے توڑ دیا جائے تو فریق مقابل یا اس کے والدین یا تیسرے افراد نے رشتے کو بنیاد پر جو تحفے اور سوغاتیں دی تھیں۔واپس کرنا ہوں گی۔اور اگر اصل تحفے یا ہدیے اتفاقاً ضائع ہو گئے ہوں تو ان کی قیمت ادا کریں مذکورہ دفعہ کی توضیح کے بعد ہمارے قانون بنانے والے کی نظر میں نامزدگی بھی وعدہ نکاح کی طرح قانونی طور پر موثر نہیں، نہ اسے اجرا کی ضمانت حاصل ہے۔اور طرفین میں اس سے کوئی معاہدے کی شکل نہیں دی جاسکتی۔صرف اتنا اثر پڑتا ہے انکار کرنے والا فریق بقول قانون ساز۔۔''معقول وجہ'' کے بغیر رشتے کو توڑنے پر اصل یا قیمت اس فریق کو واپس کرے جس نے بہ امید نکاح وہ چیزیں دی تھیں۔اگر واقع یہ ہے کہ اس وقت تحفوں کی لین دین میں نکاح ہونے کا خیال پیش نظر نہیں ہوتا۔ان غیر معمولی اخراجات

کا سبب تو براہ راست ''نامزدگی'' کی تقریب ہی ہوتی ہے............''

ملاحظہ فرمایا آپ نے جناب مہدوی کا اس ''دفعہ'' پر اعتراض یہ ہے کہ یہ دفعہ نام زدگی پر کوئی قانونی اثر نہیں مرتب کرتی اور اس کے اجرا کی ضمانت نہیں دیتی۔ اس کا اثر صرف اتنا ہے کہ رشتہ توڑنے والا اصل تحفے یا ان کی قیمت دوسرے فریق کو واپس کرے۔ حالانکہ نامزدگی کے سلسلے میں اس شخص کے نقصانات اس کے علاوہ ہیں، مثلاً جشن اور مہمان داری، نام زد کو لے کر پھرنا اور سلسلے میں بھاری اخراجات میں تو کہتا ہوں کہ اس دفعہ پر ایک اور اعتراض بھی ہوسکتا ہے۔ قانون کہتا ہے کہ ''رشتہ توڑنے والا'' اگر معقول وجہ کے بغیر رشتہ توڑ دے تو حاصل کردہ اصل تحفے یا ان کی قیمت دوسرے فریق کو دے۔'' اعتراض یہ ہے کہ قاعدے کے مطابق اگر رشتہ توڑنے والا معقول وجہ کی بنا پر بھی رشتہ توڑ دے جب بھی اسے کم از کم فریق ثانی کے مطالبے پر تحفے تو واپس کرنا ہی چاہیے۔

حقیقت میں دونوں اعتراض ٹھیک نہیں ہیں۔ قانون مدنی کی دفعہ ۱۰۳۶ ہے: ''دو نام زد افراد میں رشتے کی منظوری کے بعد کوئی فرد ''علت موجہ'' (معقول سبب) کے بغیر رشتہ توڑ دے حالانکہ فریق مقابل یا اس کے والدین یا دوسرے افراد نکاح ہونے کی خیال میں (مغرور) ہوں انہوں نے اخراجات بھی کیے تھے۔ تو جس فریق نے رشتہ توڑا ہے وہ نقصان کی تلافی کرے گا مگر یہ تلافی عام دستور کے اخراجات کی بنیاد پر ہوگی۔''

اس دفعہ نے اسی بات کی پیش بندی کر رکھی ہے جس کے بارے میں جناب مہدوی کے بقول ''قانونی پیش بندی نہیں کی گئی'' دفعہ میں ''بدون علت موجہ'' کی شرط ہے معقول وجہ ہے بغیر اس دفعہ کی رو سے رشتہ توڑنے والا فریق ثانی کے اخراجات بضمن نامزدگی ہی کا دین دار نہیں بلکہ والدین یا دوسرے افراد کے اخراجات کا بھی

دین دار قرار پاتا ہے۔

اس دفعہ میں ''مغرور شدہ'' (فریب میں مبتلا) کا جملہ قانی کلیہ ''غرور'' ۔ فریق کی طرف اشار کرتا ہے۔

اس کے علاوہ قانون مدنی میں ''تسبیب'' ۔ ایک ہے فریب دینا، نقصان پہنچانا دوسرے ہے فریب یا نقصان کے اسباب فراہم کرنا ۔یعنی اسباب نقصان مہیا کرنے پر جبری ضمانت مہیا کی گئی ہے۔ دفعہ نمبر ۳۳۲ تسبیب سے متعلق ہے۔ یہ دفعہ بھی منحرف فریق کے خلاف قابل استفادہ ہے۔

بنابریں قانونی مدنی یہی نہیں کہ ''خسارت ہائے نامزدگی (نامی زدگی کی ضمن میں ہونے والے نقصانات) کے بارے میں خاموش ہے بلکہ اس نے اس بات کو دو دفعات میں سمیٹا ہے۔

''خسارت ہائے نامزدگی'' کو منشور لکھنے والے نے ''خود نامزدی'' سمجھ لیا۔؟ قانون مدنی کی دفعہ ۱۰۳۷ ہے:

> ''ہر ایک نام زد کو حق ہے کہ منظور شدہ رشتے کو توڑ دینے والے (لڑکے یا لڑکی) سے منظوری رشتہ کے موقع پر اپنی طرف سے یا اپنے والدین کی طرف سے دیے جانے والے تحفے واپس مانگ لے اگر اصل تحفے موجود نہ ہوں تو مطالبہ کرنے والا قیمت کا حق دار ہوگا۔مگر بطور رسم ایسے تحفے محفوظ رکھے جاتے ہیں ۔سوائے اس صورت کے کہ وہ چیزیں کسی کوتاہی کے بغیر فریق ثانی سے تلف ہوگئی ہوں۔

یہ دفعہ ان چیزوں سے متعلق ہے جو فریقین ایک دوسرے کو دیتے ہیں آپ نے دیکھا کہ اس دفعہ میں کسی قسم کی قید نہیں ہے کہ ایک فریق بغیر ''علت موجہ''

(معقول سبب) کے رشتے کوتوڑ دے۔ ’’بدون وعلت موجہ‘‘ ایک بے جا استنباط ہے جس کے مرتکب مہدوی صاحب ہوئے۔

تعجب ہے جولوگ قانونی سادہ فقرات (ودفعات) سمجھنے سے معذور ہیں۔ان میں یہ داعیہ کیسے پیدا ہو گیا کہ وہ ان آسمانی قوانین کو بدل دیں جن میں ہزاروں باریکیاں اور گہرائیاں کام میں لائی گئی ہیں--(یہ صاحب وہ ہیں جن کی زندگی انہیں قانونی نکات کوحل کرنے میں گزری ان کا کام ہی یہی رہا۔اسی فنی مہارت کے نام سے موصوف نے ملک کا ایک بجٹ صاف کیا ہے۔

یہ نکتہ بھی واضح رہے کہ جناب مہدوی پانچ سال پہلے تک کہ جب ’’ پیمان مقدس یا میثاق ازدواج‘‘ کی تالیف میں مصروف تھے۔اس جملے (بدون علت موجھی) کو’’بدون علت وموجی‘‘ پڑھتے رہے۔ چنانچہ مذکورہ کتاب میں ایک طویل فصل اسی دادوفریاد پر لکھ ڈالی --ہائے کیا دنیا میں کوئی کام بے علت وسبب کے بھی ہوا ہے۔ لیکن بہت بعد یہ خیال آیا کہ برسوں یہ جملہ غلط پڑھا کیے۔اصل عبارت ’’بدون علت موجہی‘‘ تھی۔

خواستگاری کے ضمن جو مزید اعتراضات ’’منشور‘‘ نگار نے کیسے میں ہم سردست ان سے قطع نظر کرتے ہیں۔

دوسرا حصہ

نکاح موقت (متعہ)

متعہ اور آج کی زندگی

آیا نکاح موقت رہبانیت عملی ہے؟

کونسا طریقہ؟ موقت رہبانیت، جنسی کمیونزم یا نکاح موقت؟

آج کے جوان کم عمر میں شادی نہیں کر سکتے، لہٰذا بلوغ اور جنسی ہیجان میں کیا کریں؟

اگر متعہ کا منصوبہ یورپ سے آیا ہوتو جدت پسند اسے سب سے زیادہ ترقی یافتہ قانون سمجھتے۔

آج کی زندگی میں کل سے زیادہ متعہ ضروری ہو چکا ہے۔

آزمائشی شادی۔

متعہ کے بارے میں رسل کا نظریہ۔

خواتین کی راہ میں بیسوی صد کے مرد کے جال

بیسوی صدی کی عورت کی شرافت یورپ و امریکہ کی سرمایہ دار کی خدمت میں۔

کونسی عورت کرایے کی عورت، یا اِس کی اُس کی؟

قرآن،عورت کا سچا حامی اور حق گو ہے۔

متعہ پر اعتراض اور جواب۔

متعہ اور مسئلہ آبادی حرم سرا۔

بیسوی صدی کے مردوں نے خواتین سے ذات اندوزی کے مقابلے ہارون رشید و فضل برمکی سے سیکھے ہیں۔

بیسویں صدی کے مرد نے صرف بے بہا دولت لٹائی ہے۔

''لذت پرست'' مرد اسلام میں ملعون سمجھا گیا ہے۔

خلاصہ از مولف مرحوم

نکاح موقت (۱)

بہت سے افراد کے برعکس اسلامی مسائل میں لوگوں کے شکوک وشبہات ایجاد کرنے سے کبھی تکلیف محسوس نہیں کرتا۔ باوجودیکہ میرا تمام تر رابطہ واعتقاد صرف اسلام سے ہے۔ میں سچے دل سے خوش ہوتا ہوں۔ کیونکہ میرا عقیدہ ہے، اور زندگی میں تجربہ ومشاہدہ کیا ہے کہ یہ آسمانی مقدس آئین، وہ ہے جس کے محاذ پر بہ شدت حملہ آور اسے مضبوط تر بنا دیتے ہیں۔ جس رخ پر حملہ کیا جائے اس رخ پر زیادہ طاقت سربلندی وجلوہ نمائی اور زیادہ آب وتاب آجاتی ہے۔

حقیقت کی خوبی یہی ہے کہ شک اور تردد اس سے روشن کرنے اور چمکانے میں زیادہ مدد دیتا ہے شک یقین کی تمہید اور تردید۔ تحقیق کی سیڑھی ہے۔ ''زندہ بیدار'' [۱] نامی رسالے میں غزالی کی ''میزان العمل'' سے نقل ہے کہ:

> ''ہماری گفتگو کا یہی فائدہ بہت ہے کہ تمہیں تمہارے موروثی اور پرانے عقدا کے بارے میں مبتلائے شک کر دیا، کیونکہ شک تحقیق کی اساس ہے۔ جو شک نہیں کرتا وہ صحیح طور پر توجہ نہیں دے رہا ہے جو شخص باریک بین نہیں ہے وہ اچھی طرح دیکھتا ہی نہیں ایسا آدمی اندھے پن اور سرگردانی میں گزارے گا۔''

آزادی دیجئے، لوگ بولیں، لکھیں، سمینار کریں، اعتراض کریں، نتیجہ میں ان کی خواہش کے برعکس اسلام کے منور ہونے کا وسیلہ بنیں۔

---

[۱] زنداہ بیدار۔ حی بن یقظان کی کتاب کا ترجمہ از بدیع الزمان فروزاانفر۔

اسلام کے تابناک قوانین میں سے، نگاہ فقہ جعفری میں شادی دوطرح کی ہے۔

دائمی اور مؤقت

مذہب جعفری ہی ہمارے ملک کا رسمی مذہب ہے۔نکاح موقت ونکاح دائمی چند باتوں میں یکساں اور چند معاملات میں علیحدہ ہیں۔

سب سے پہلی جگہ جہاں یہ دونوں الگ ہوتے ہیں وہ زن ومرد کا معین وقت کیلئے نکاح کرنا، جب مدت معین ختم ہوجائے اور دونوں متفق ہوں تو مدت بڑھا سکتے ہیں اور اگر دونوں مائل نہ ہوں تو الگ ہوجاتے ہیں۔

دوسری بات شرائط کی ہے،متعہ میں دونوں کو زیادہ آزادی ہے، جو شرائط ومعاہدہ چاہیں کرلیں مثلاً نکاح دائمی میں مرد بہرحال روزانہ کے اخراجات، پوشاک ،مکان کا ذمہ دار ہے اس کے علاوہ بیوی کے دوسرے ضروریات، جیسے دوا علاج ،معالج وغیرہ کا انتظام بھی شوہر کرے گا۔لیکن نکاح موقت۔متعہ۔ان ذمہ داریوں اور آزادیوں کا تعلق معاہدہ پر ہے ممکن ہے مرد نہ چاہے یا اخراجات ادا کرنے کے قابل نہ ہو۔یا عورت اپنے شوہر کی دولت سے فائدہ نہ اٹھانا چاہے۔

نکاح دائمی میں، بیوی بہرحال شوہر کو سردار خاندان ماننے کی پابند ہے۔ اور گھریلو بھلائی کی حد تک مرد کے احکام کی تعمیل کرے گی۔لیکن نکاح منقطع میں باہمی معاہدے کے مطابق عمل ہوگا۔

نکاح دائمی میں میاں بیوی بہرحال ایک دوسرے کا ترکہ پائیں گے۔نکاح منقطع میں یہ نہیں ہے۔

دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ نکاح منقطع ،حدود اور پابندیوں سے

آزاد ہے ہر قسم کی قید طرفین کے معاہدے سے وابستہ ہے، فریقین جس قرارداد پر راضی ہوں گے وہی عمل میں آئے گی حتیٰ کہ زمانے کی پابندی میں دونوں کو آزادی ہے اور مدت نکاح بھی طرفین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے۔

نکاح دائمی میں میاں بیوی ایک دوسرے کی رضامندی کے بغیر مانع حمل کوئی کام نہیں کر سکتے لیکن نکاح منقطع میں ایک دوسری کی رضامندی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی زن وشوہر کو آزادی دی گئی ہے۔

اس شادی کے نتیجے۔یعنی اولاد۔اور نکاح دائمی کے نتیجے میں کوئی فرق نہیں --مہر، نکاح دائمی میں بھی ضروری ہے اور نکاح منقطع میں بھی لازم ہے۔فرق یہ ہے کہ نکاح منقطع میں اگر مہر کا ذکر نہ ہو تو عقد باطل ہوگا۔اور نکاح دائم میں مہر کا تذکرہ نہ کرنے سے نکاح باطل نہیں ہوتا مگر ''مہر مثل'' معین ہوگا (مہر مثل سے مراد وہ مہر ہے جو بیوی کی قرابت دار خواتین کا مہر تھا وہی مہر اس خاتون کا قرار پائے گا)

جس طرح عقد دائم میں، شوہر پر بیوی کی ماں اور بیٹی اور بیوی پر شوہر کے باپ اور بیٹے حرام ہیں۔اسی طرح عقد منقطع میں بھی یہی صورت ہے۔جیسے دائمی زوجہ سے دوسروں پر خواستگاری حرام ہے اسی طرح متاعی بیوی سے رشتہ کی درخواست ہر شخص پر حرام ہے۔ یا دائمی زوجہ سے زنا کرنے والے پر وہ عورت ہمیشہ کیلئے حرام ہو جاتی ہے یہی حکم متاعی زوجہ کیلئے ہے۔طلاق کے بعد دائمی نکاح والی عورت عدہ رکھنے کی پابند ہے۔متاعی بیوی بھی مدت نکاح معاف یا ختم ہونے کے بعد عدے کی پابند ہے۔البتہ عدے کی مدت میں اختلاف ہے: نکاح دائمی والی بیوی تین ماہواری تک اور متاعی بیوی دو ماہواریاں یا پینتالیس دن کا عدہ رکھے گی۔۔نکاح دائمی میں دو بہنوں کو بیک وقت بیوی نہیں بنایا جا سکتا، متعہ میں بھی یہی حکم ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو ''ازدواج موقت'' یا نکاح منقطع کے نام سے شیعہ فقہ میں مذکور اور ایران کے

قانون مدنی میں بعینہ اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہم اس قانون کے ان خصوصیات کے ساتھ حامی ہیں۔ رہا یہ کہ ہمارے افراد نے اس قانون سے ناجز فائدہ اٹھائے اور اٹھاتے ہیں۔ اس کا قانون سے کیا تعلق ہے؟ اس قانون کے بدلنے سے ناجائز فائدے نہ اٹھائے جانے کی ضمانت کون دے سکتا ہے۔ صرف شکل بدل جائے گی۔ بلکہ قانون کے مسترد کرنے سے سینکڑوں فساد اور پیدا ہوں گے۔

اگر عوام کی اصلاح اور ان کو آگاہ نہ کر سکیں تو اپنی ناتوائی اور عوام کی اصلاح نہ کرنے کی لیاقت کو ہمیشہ قانون کی خرابی پر ڈالتا غرض انسان کو بری الذمہ قرار دینا اور قوانین کو ذمہ دار ٹھہرنا نامناسب ہے۔

اب یہ دیکھتے ہیں کہ نکاح دائمی کے ہوتے ہوئے ''ازدواج موقت'' کے نام قانون بنانے کی ضرورت کیا ہے۔ آیا بقول مضمون نگاران رسالہ ''زن روز'' متعہ خواتین کی نسوانی شخصیت اور اعلامیہ حقوق بشر کے خلاف ہے؟ کیا متعہ کی ضرورت تھی بھی تو پرانے زمانے میں تھی، آج کی زندگی اور آج کے جدید تقاضے اس سے ہم آہنگ نہیں ہیں؟

ہم اس موضوع کو دو عنوانوں سے زیر بحث لائیں گے:

الف: متعہ اور آج کی زندگی۔

ب: متعہ کے نقصانات وعیوب۔

متعہ اور آج کی زندگی

ہم مذکورہ بالا گفتگو سے یہ سمجھ چکے ہیں کہ نکاح دائمی میاں بیوی کیلئے بہت سی ذمہ داریاں اور فرائض پیدا کرتا ہے۔ اسی دلیل کی بنیا پر لڑکی یا لڑکا، طبعی بلوغ کو پہنچتے

ہی جنسی جذبات سے مغلوب ہونے کے باوجود نکاح دائمی پر تیار نہیں ہوا۔عہد جدید کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے طبیعی بلوغ اور معاشرتی بلوغ (خاندان کی تشکیل کے امکان) میں فاصلے بڑھا دیے ہیں۔اگر گزشتہ، سیدھے سادھے زمانے میں ایک کم سن لڑکا اوائل بلوغیت میں کسی کام لگا دیا جاتا تھا تو زندگی بھر اسے انجام دیتا تھا۔

مگر آج کی دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے۔ایک کامیاب لڑکا،اسکول ،کالج ،اور یونیورسٹیوں کے امتحانات پاس کرتا ہے،کبھی اسے اعلیٰ ترین سند کیلئے کچھ مدت یونیورسٹی میں گزارنا پڑتی ہے پچیس سال میں دانگاہ سے فراغت ہوئی ،یقینی طور سے تین چار سال اس فکر میں گزارنا ہیں کہ تھوڑی بہت آمدنی اور کچھ سروسامان ہو تو نکاح دائمی کی سوچے یہی حال اس لڑکی کا ہے جو تعلیمی دور مکمل کرنا چاہتی ہو۔

آج کا جوان اور بلوغ وبحران جنسی کا عہد

جنسی ہیجان میں آئے۔آج کے کسی اٹھارہ سالہ لڑکے سے شادی کی بات کر کے دیکھے۔وہ آپ پر ہنسے گا اور یہی ردعمل سولہ برس کی لڑکی دکھائے گی۔عملاً ممکن نہیں،اس طبقے کے لوگ اس سن وسال میں نکاح دائمی کر کے اس بوجھ تلے نہیں آسکتے جس میں ایک دوسرے کی ذمہ داریاں اٹھانا پڑتی ہیں اور کچھ دن بعد ہونے والی اولاد کو مسئلہ اس پر مستزاد بن جاتا ہے۔

وقتی رہبانیت، آزمائشی شادی یا نکاح موقت (متعہ) کون بہتر ہے

ہم آپ سے پوچھتے ہیں،اس صورت حال میں اس مزاج اور اس خمیر کے

ساتھ کیا رویہ ہونا چاہیے؟ آج کی دنیا میں، زندگی کے حالات ہمیں سولہ اور اٹھارہ برس کی عمر میں شادی کی اجازت نہیں دیتے کیا فطرت بلوغ کا دور آگے بڑھا سکتی ہے؟ اور جب تک تعلیمی زمانہ مکمل نہ ہو جنسی جذبات ہم سے دست بردار ہو سکتے ہیں؟

''وقتی رہبانیت'' ترک دینا، ترک لذات، کا چلہ کھینچنے کیلئے آج کے جوان تیار ہیں؟ کچھ عرصہ ریاضت کریں اور شادی کے امکانات حاصل ہونے تک ذرا سختی جھیل لیں؟ فرض کرلیا کہ '' وقت'' رہبانیت کیلئے کچھ جواں تیار ہو گئے۔ کیا ان کا خمیر بھی راضی ہے؟ کیا ان میں خطرناک نفسیاتی بیماریاں پیدا نہ ہوں گی؟ یہ بیماریاں ان کی جنسی خواہشات کے اثر سے پیدا ہوتی ہیں۔ان کا سراغ آج کے ماہرین نفسیات لگا چکے اور ان کی حقیقت بتا چکے ہیں۔ کیا اس پہلو کو نظرانداز کر دیا جائے؟

اب دو راستے ہیں، جوانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور ان کے معاملے کو سامنے رکھیں ہی نہیں۔ ایک لڑکے کو چھوٹ دے دیں کہ سو لڑکیوں سے کام نکالے ۔ایک لڑکی کو ڈھیل دے دیں وہ جائے اور دس لڑکوں سے ناجائز طریقے پر تعلقات قائم کرے اور کئی مرتبہ اسقاط کرالے۔ یعنی عمل طور پر جنسی کمیونزم قبول کرلیں۔۔ ہم لڑکے لڑکی کو برابری دے ہی چکے ہیں ''منشور حقوق انسانی'' کی روح سے خوشی ہو چکی ہے۔ آخر بہت سے کوتاہ خیال افراد کی نظر میں ''اعلامیہ حقوق بشر'' کی روح یہ ہے کہ اگر مرد و زن جہنم کے کسی درے میں داخل ہونا چاہیں تو دوش بدوش اور ہاتھ میں ہاتھ ملا کر، خلاصہ یہ کہ ''برابرابر'' گریں۔

سوچیے ،ایسے لڑکے لڑکیاں جنہیں طالب علمی میں اتنے زیادہ تعلقات حاصل ہو چکے ہوں مستقل شادی کے بعد مرد زندگی اور خاتون خانہ بننے کے قابل رہیں گے؟

کیا متعہ بہتر ہے؟

دوسرا راستہ ہے ،ازدواج موقت وآزاد۔متعہ پہلے مرحلے میں عورت کو پابند کرتا ہے کہ بیک وقت دومردوں کی بیوی نہ بنے۔صاف یہ بات ہے ،جب عورت ایک مرد کی پابند ہوگی تومردکوبھی خواہ مخواہ ایک عورت کا پابندرہنا پڑے گا۔جب ایک عورت ایک معین مرد کی پابند ہوتی ہوتومردبھی مجبوراً اسی ایک عورت کا ہورہے گا۔سوائے اس کے کہ عورتیں (لڑکیاں) فراواں ہو(اوران کی طرف سےلڑکوں پر دباؤ زیادہ ہو)

یہی ایک راستہ ہےجس وقت رہبانیت اوراس کےنقصان دہ اثرات سے بچاؤ ہوتا ہےاورجنسی کمیونزم میں بھی نہیں پھنسنا پڑتا۔

آزمائشی شادی

زمانہ طالب علمی ہی نہیں دوسرے حالات میں بھی ضرورت پیش آسکتی ہے ،اصولاً ممکن بھی ہے کہ ''زن ومردنکاح دائمی کرنا چاہیں مگر باہمی اعتماداور مکمل بھروسے کے واسطے آزمائشی طورپر کچھ دنوں کیلئے عقدکرلیں،اس مدت میں اعتمادحاصل ہوجائے تونکاح دائمی سے منسلک ورنہ مدت ختم ہوجائے اوردونوں جدا ہوجائیں۔

میں آپ سے پوچھتاہوں : اہل مغرب جوبدکارعورتوں کی معین تعدادکو ہرشہرمیں حکومت کی نگرانی میں رکھنے کالازم اورضروری سمجھتے ہیں اس کا مقصدکیا ہے؟ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ بے شادی شدہ افراد جودائمی شادی نہیں کرسکتے

،کوخاندانی اورگھریلوزندگی بسرکرنے والوں کیلئے خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ [۱]

رسل اورنظریہ ازدواج موقت

''برٹرنڈرسل'' مشہورانگریزفلسفی نے [۲] اخلاق اورخانگی تعلقات زن وشوہرمیں لکھاہے:

''سنجیدگی سے دیکھیں تومعلوم ہوگا کہ فاحشہ عورتیں، ہماری گھریلوزندگی ہماری خواتین اورعصمت دختران کی حفاظت کرتی ہیں ''ملکہ وکتوریا'' کے زمانے میں ''لکی'' نے یہ بات کہی تواخلاق کے طرفدار بہت ناراض ہوئے وہ اس کی علت نہ سمجھ سکے اور''لکی'' کے نقطہ نظرکی غلطی ثابت کرنے میں ناکام رہے،اخلاق پرست طبقے کی زبان حال اوراستدلال تھا'' یہ اگرعوام ہمارے تعلیمات کوقبول کرتے توفحاشی ناپید ہوجاتی۔لیکن وہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ ان کی بات پرکوئی توجہ نہیں دیتا۔''

فرنگیوں کا یہ فارمولا، ان مردوں ،عورتوں کیلئے جونکاح دائمی نہیں کرسکتے ،اوروہ تھافارمولا جواسلام نے تجویز کیاہے۔سوچنے کی بات ہے اگرفرنگی فارمولے پرعمل کیاجائے اورکچھ بدنصیب عورتیں اس معاشرتی ذمہ داری کیلئے مخصوص کردی جائیں توکیاعورت کاحقیقی رتبہ اوراس کی انسانی حیثیت برقراراور''اعلامیہ حقوق انسانی'' کی روح خوش ہوجائے گی؟

---

[۱] بیسویں صدی میں حکومت کی طرف سے لائسنس دارفاحشہ عورتوں کے اڈے مغرب سے ایران میں آئے اورپہلوی حکومت نے اس کی بڑے پیمانے پرسرپرستی وہمت افزائی کی۔

[۲] رسل کی کتاب کانام ہے:''MARREGE AND MORALS''

برٹرنڈ رسل نے اپنی کتاب میں آزمائشی شادہ کے عنون سے ایک باب الگ لکھا ہے اس کی رائے ہے:

جسٹس لیڈزے جوڈینور کے طویل المیعاد جج تھے موصوف نے اپنے مشاہدات اورمطالعہ حقائق کے بعد تجویز رکھی تھی کہ ''فرینڈشپ میرج''۔ازدواج رفاقتی کا پروگرام شروع کیا جائے ۔افسوس ،انہیں اپنی سرکاری ملازمت ''امریکہ'' میں چھوڑنا پڑی۔لوگ دیکھ رہے تھے کہ وہ نوجوانوں کی خوش حالی اورسعادت کی فکرکوان میں سیاہ کاری کی حس کو بیدار کرنے سے زیادہ حامی تھے۔کیتھولک اورکالوں کے مخالف گرپوں نے جج صاحب کو برطرف کرنے کی مہم چلادی۔

فرینڈشپ میرج کی معتدل تجویز ایک دانشمند نے کی ہے۔وہ جنسی روابط میں استحکام پیدا کرنا چاہتے تھے لینڈزے سمجھ گیا کہ شادی کی راہ میں بنیادی رکاوٹ مفلسی ہے ،پیسے کی ضرورت صرف اولاد کے ہونے پر ہی نہیں، اصل بات بیوی کا معاشی سہارا نہ دینا ہے۔لہٰذا، رفاقتی شادی جوانوں کیلئے ہوسکتی ہے۔اس میں عام شادی سے تین اختلاف ہیں

۱۔شادی سے بچے پیدا کرنا مطلوب نہ ہوں گے۔

۲۔جواں عورت جب تک ماں نہ بنے گی، حاملہ نہ ہوگی،طرفین سے طلاق پر رضامندی آسان ہوگی۔

۳۔طلاق کی صورت میں عورت کواپنے آزوقے کیلئے کچھ امداد کی ضرورت ہوگی۔

......میں لینڈزے کی تجویز کے مفید اورموثر ہونے میں کوئی شک نہیں

رکھتا۔اگرقانون اسے منظور کر لیتا تو اخلاقی فلاح وبہبود میں اچھا اضافہ ہوتا۔

لینڈزے اور رسل جسے ''ازدواج رفاقتی'' کہتے ہیں اگرچہ اسلامی ''ازدواج موقت'' سے اس میں کچھ فرق تو ہے لیکن یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ مفکرین اس نکتہ کو دریافت کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ تنہا ''ازدواج دائمی'' تمام معاشرتی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے کافی نہیں۔

نکاح مؤقت (۲)

قانون متعہ کے خصوصیات اس کے وجود کی ضرورت اور فقط نکاح دائمی تمام انسانوں کی ضرورت پوری نہیں کرتا۔ خاص کر موجودہ زمانے میں یہ تھے وہ نکات جن پر بحث وتحقیق کی گئی ۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ متعہ کے ممکنہ نقصان کیا ہو سکتے ہیں ۔ تمہید میں ایک بات یاد دلاتے چلیں:

تاریخ عقائدنویسی

انسان جن موضوعات وسائل ومباحث پر اظہار رائے کرتا چلا آ رہا ہے ان میں تاریخ علوم وعقائداور رسم ورواج اور انسانی آداب (جیسے موضوعات سب سے زیادہ نامفہوم اور مشکل ہیں)

چنانچہ کسی موضوع پر انسان نے اس موضوع سے زیادہ بے معنی باتیں نہیں کی ہیں۔ اتفاق سے کسی اور موضوع پر اظہار رائے کا اتنا شوق بھی نہیں رہا۔

مثال کے طور پر اگر کسی کو اسلامی فلسفہ وتصوف وعرفان وعلم کلام سے واقفیت ہے اور اس نے آج کے مصنفین کی تحریریں پڑھی ہیں۔ یہ تحریریں عموماً یا بیرونی مصنفین سے ماخوذ یا اصل گفتگو کی نقل ہیں۔ بہر حال ان سے باخبر حضرات میری بات کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے ،یعنی اورینٹلسٹ ان کے پیروکار اور دم چھلے ان مسائل پر گفتگو ضروری جانتے ہیں لیکن براہ راست موضوع کو شاید ہی گہرائی کے ساتھ جانتے پہچانتے ہیں۔

اسلامی تصوف کے ایک مسئلہ کو لیجے ''وحدت وجود'' اب یہ مسئلہ زبان زد ہے کیا کیا باتیں نہیں کہی گئی ہیں۔ بس ایک بات تشنہ گفتگو ہے اور وہ ہے ''وحدت

وجود'' کیا ہے اور اسلامی تصوف وعرفان کے بڑے بڑے مفکر جیسے محی الدین ابن عربی اور صدالمتالھین شیرازی کا تصور وحدت وجود کیا ہے؟

رسالہ ''زن روز'' میں چھپنے والے مضامین جن میں نکاح منقطع پر اظہار رائے کی گئی پڑھتے وقت مجھے ''مسئلہ وحدت وجود یاد آتا رہا۔ یہ محسوس ہوا کہ سب باتیں زیر بحث آئیں لیکن اصل روح مسئلہ جو یہ قانون بناتی ہے اور قانون ساز نے اس کو پیش نظر رکھا ہے تشنہ بحث ہے۔

دراصل یہ قانون چونکہ ''مشرقی ترکہ'' ہے لہٰذا ب توجہی کا مستحق ہے اگر یہی ''مغربی تحفہ'' ہوتا تو بحث یوں نہ ہوتی۔

یہ قانون سرزمین مغرب سے آیا ہوتو آج اس پر کانفرنسوں اور سمینار کا سلسلہ جاری ہوتا۔قراردادیں پاس ہوتیں کہ بیسویں صدی کے آخر پچاس سال میں ماحول اتنا بدل گیا ہے کہ فقط نکاح دائمی کو شادی قرار دینا مطابق حالات نہیں ہے موجودہ نسل نکاح دائمی کے فرائض برداشت کرنے کی قوت سے محروم ہے۔آج کا جوان ان ذمہ داریوں کو نہیں اٹھا سکے گا اسے آزادی چاہیے۔آزاد زندگی میں آزاد نکاح کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔آزاد نکاح میں آج کا جواں لڑکا اور لڑکی آزادی سے شرطیں طے کرتی ہے۔..................اور اسی دلیل کی بنیاد پر مغرب سے ایک زمزمہ اٹھا کر ''دوستانہ شادی'' وقت کی ضروت ہے اور ''برٹرنڈ رسل'' جیسے مفکر اس میں شریک ہو گئے۔حالات بتاتے ہیں کہ مستقبل میں اسلام کی صوابدید کو مغرب والے پسند کریں گے اور ہم ازدواج دائم کے خلاف مہم کا دفاع اور اس کا پروپیگنڈ کرنے پر مجبور ہوں گے۔

اعتراضات وجوابات

متعہ پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان کی نوعیت یہ ہے:

ا۔شادی کی بنیاد دوام پر ہونا چاہیے۔میاں بیوی جب یہ بندھن قبول کریں تو ہمیشہ کیلئے پابند رہیں اور جدائی کا خیال ذہن میں نہ آنے دیں ،اور متعہ میاں بیوی میں دوامی قول وقرار ہی نہیں لہٰذا وہ نکاح بھی نہیں۔

ازدواج کو مستحکم بنیاد قائم ہونے کی بات بہت صحیح بات ہے لیکن متعہ پر اعتراض اس وقت ہوسکتا ہے جب نکاح دائم کو منسوخ کر کے متعہ کو اس کی جگہ رکھ دیا جائے۔ بے شک فریقین دائمی نکاح پر متفق ہوں دونوں کو مکمل اطمینان ہو دونوں پکا ارادہ کرلیں تو نکاح دائمی کا قانون موجود ہے۔ازدواج موقت کا قانون تو بنا ہی اس لئے ہے کہ فقط ازدواج دائم ، ہر حالت یا ہر صورت حال اور ہر وقت ممکن نہیں نہ انسان ضروریات کا پورا کرنا نکاح دائمی کے دائرہ کار میں ہے۔ایک دائمی نکاح کی محدودیت نے افراد کو جز وقتی رہبانیت یا جنسی کمیونزم قبول کرنے پر مجبور کردیا ہے۔سامنے کی بات ہے جب لڑکی اورلڑکے میں دائمی نکاح کی زمین ہموار ہوتو وہ ہرگز نکاح منقطع پر تیار نہ ہوں گے۔

۲۔ایرانی عورتوں اورلڑکیوں نے نکاح منقطع کو پسند نہیں کیا، حالانکہ وہ شیعہ ہیں ان کے خیال میں یہ توہین کی بات ہے اسی بنیاد پر شیعہ مرد بھی اسے مسترد کرتے ہیں۔

جواب

یہ ہے کہ عورتوں میں متعہ کی ناپسندیدگی ہوس پیشہ مردوں کے غلط رویہ سے ہے قانون کو اس رویے پر بند باندھنا چاہیے۔ہم اس قانون کے غلط استعمال پر آگے بحث کریں گے۔دوسری بات یہ ہے کہ متعہ کے بارے میں اس پسندیدگی کی توقع جونکاح دائمی کے بارے میں ہے--غلط ہے، کیونکہ قانون متعہ ہے ہی اس موقع کیلئے

جب فریقین نکاح دائم کیلئے تیار و متفق نہ ہوں۔

۳۔نکاح منقطع عورت کی شخصیت واحترام کے خلاف ہے اس کے معنی ہیں انسان کو کرایہ پر لینا یا جسم فروشی کا شرعی جواز ،عورت کی شخصیت اور انسانی حیثیت سے گری ہوئی بات ہے کہ مرد سے ،کچھ پیسے لے کر اپنا وجود اپنا جسم اس کے حوالے کر دے۔

یہ اعتراض سب سے زیادہ تعجب خیز ہے۔

ا۔ازدواج موقت کے بارے میں جو امتیازات ہم گزشتہ سطور میں لکھ چکے ہیں ان کے ہوتے ہوئے اجارے اور کرایے کا ربط کیا ہے آیا مدت ازدواج کی محدودیت نے اسے نکاح (ازدواج) کی صورت میں خارج کر دیا اور کرایہ واجارہ کی ہیئت دے دی؟ یا،مہر کے قطعی تعین کی وجہ سے کرایہ واجارہ کی شکل بن گئی ہے؟ یعنی اگر مہر کے بغیر ہو اور مرد کوئی چیز عورت پر نچھاور نہ کرے تو عورت اپنی انسانی حیثیت واپس لے لیتی؟

مہر کے بارے میں آگے گفتگو کریں گے۔

اتفاقاً علماء فقہ نے تصریح کر دی اور ''قوانین مدنی'' نے اسی بنیاد پر اپنے دفعات مرتب کیے ہیں کہ ازدواج موقت وازدواج دائم دونوں میں معاہدے کی حیثیت ایک ہی ہے ان میں کسی طرح کا کوئی فرق نہیں ہے نہ کوئی فرق کرنا چاہیے ۔دونوں ''ازدواج'' ہیں دونوں مخصوص الفاظ CODE WORDS سے ''ازدواج'' کی صورت حاصل کرتے ہیں اگر نکاح منقطع اجارہ وکرایہ کے ''مخصوص صیغوں'' سے پڑھا جائے تو باطل ہے۔

۲۔انسان کا اجارہ وکرایہ کب اور کس تاریخ سے کینسل ہوا ہے؟ درزی ،حجام ،ڈاکٹر اور تمام ماہرین اور ملازمین سرکار۔وزیر اعظم سے لے کر چپراسی تک تمام

کاری گر، کارخانے کے سب کارکن کرائے کے انسان ہیں۔

جوعورت اپنے ارادہ واختیار سے کسی معین مرد سے ''عقدازدواج موقت'' کرتی ہے کرایہ کی آدم زادنہیں بنتی۔ نہ اس نے انسانی حیثیت وشرافت کے خلاف کوئی قدم اٹھایا ہے۔ اگر آپ کوکرائے کی عورت دیکھنا اوراگر آپ عورت کوفروخت اورکنیزی کی جائزہ لینا چاہیے تویورپ اورامریکہ چلے جائیں۔ وہاں ایک مرتبہ فلم کمپنیوں کودیکھ لیں توآپ معلوم کوہوگا کرائے کی عورت کیاہوتی ہے؟ کمپنیاں عورت کی ایک ایک جسمانی حرکت، اس کی نسوانی ساخت، نسوانی عادتیں، اس کے جنسی آرٹ کس کس طرح بیچے جاتے ہیں سینمااورتھیٹر کے جوٹکٹ آپ خریدتے ہیں دراصل وہ عورتوں کے اجارے اورکرائے کے پیسے ہیں۔ غورتو کیجئے، بدنصیب عورت صرف دولت کیلئے اپنا جسم کیونکر پیش کرتی ہے؟ تجربہ کارشرفاً سے ZAST حصول لذت کی تڑپ، جنسی مٹک تھڑک سیکھتی ہے، اپنا جسم روح اورشخصیت ایک سرمایہ وارکمپنی کے حوالے کرتی ہے، مقصد ہے اس کمپنی کے خریدارزیادہ بنائے اوراس کیلئے پیسے زیادہ فراہم کرائے۔

کیبرے اورہوٹل بھی دیکھیے عورت نے کیا شرافت وعزت حاصل کی ہے۔ تھوڑی سی مزدوری، تھوڑا سا معاوضہ اوروہ بھی (مالک) سرمایہ دارکی جیب میں مزید سرمایہ انڈیلنے کیلئے اپنی شخصیت وشرافت کا مہمانوں سے سوادکرتی ہے۔

کرائے کی عورتیں وہ مالکن۔ تنخواہ دار دیکھیے جو''شاپنگ سنٹروں'' ۔ اقتصادی کمپنیوں میں خریداروں کادل موہنے اورگاہکوں کوبھیڑجمع کرنے کیلئے، ٹیلویژن پررنگارنگ چہرے بناتی ہیں۔ ان کا کام کسی تجارتی سامان (مصنوعات) کی شہرت کا باعث بن کرسرمایہ دارکی جیب بھریں۔

کون نہیں جانتا، آج امریکہ اوریورپ میں عورت کاحسن عورت کی دل کش

،عورت کی جنسی کشش ،عورت کی آواز امریکہ اور یورپ کے سرمایہ داروں کی خدمت گزاری کا عام اور حقیر وسیلہ ہے؟ افسوس ہے کہ آپ دانستہ یا نادانستہ طور پر ایران کی شریف ومعزز خواتین کو مذکورہ بندھوں میں جکڑنا چاہتے ہیں ۔میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک عورت آزادانہ وشریفانہ شرائط کے ساتھ ''ازدواج موقت'' کرنے کے بعد اسے کرائے کی عورت کہا جائے اور ایک گلوکار کسی کی شادی یا محفل شب میں ہزاروں لالچی مردوزن کی آنکھوں کے سامنے فقط ان کی جنسی حس کو آسودہ کرنے کیلئے اپنا گلا پھارتی اور ایک ہزار ایک نغمے الاپنی اور طے شدہ مزدوری لیتی ۔کرائے کی عورت شمار نہیں ہوتی ۔

وہ اسلام جو عورت سے مرد کو اس قسم کے فوائد حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتا جو عورت کو اس جال میں پھنسنے سے روکتا اور اس اسیری اور اس روزی سے روکتا ہے کیا وہ اسلام عورت کا مقام گراتا ہے یا بیسویں صدی کا نصف دوم کو یورپ؟

جس دن عورتوں کو یہ حقیقت معلوم ہوئی اوروہ خواب غفلت سے بیدار ہوئیں اور انہیں یہ نظر آتا کہ بیسویں صدی کے مردوں نے ان کے راستے میں کیسے کیسے جال بچھائے ہیں اسی دن وہ انقلاب کا نعرہ بلند کریں گی اور یہ بھی مانیں گی کہ فقط قرآن کی پناہ گاہ ان کی واقعی حامی اوران کے معاون سامنے میں حق گو ہے ۔یقیناً وہ دن دور نہیں (انقلاب اسلامی آیا اوروہ دن لایا خواتین نے آقائے مطہر کی پیش گوئی سچ کردکھائی)

رسالہ زن روز شمارہ ۸۷ صفحہ ۸ میں ایک رو پوتا ژ چھپی ہے عنوان ہے زن کرایہ ای مرضیہ ورضا نامی دو کردار ہیں ۔مرضیہ نے عورتوں میں محرومیوں کا تذکرہ کیا ہے۔

رضا کا بیان ایک لڑکی سے منگنی پر شروع ہوتا ہے فارمولا نمبر ۴۰ کے مطابق پہلا اقدام ہوا۔اور لڑکی ،لڑکے سے شادی کی خواہش ظاہر کرے گی ۔واضح ہے جب

خواستگاری لڑکی سے شروع ہوگی تو انجام داستان اس سے بہتر کیا ہوسکتا تھا۔

مرضیہ کے اظہار کے مطابق ایک ہوس ران، سنگ دل مرد نے نکاح دائمی کے نام لے کر بات کی اس کے بچوں کی نگہداشت اور سرپرستی کا وعدہ کیا۔ پھر ان باتوں کے برخلاف بدنصیب عورت کی اطلاع میں لائے بغیر اس سے متعہ کیا اور اپنا مطلب نکالنے کے بعد اس سے لاپروائی شروع کردی۔

اگر اس عورت کا اظہار دعویٰ صحیح ہے تو نکاح باطل تھا جس سنگ دل مرد نے ایک عورت کو شرع وعرفی قانون سے بے خبری کی بنا پر دست درازی کا نشانہ بنایا لہٰذا اس کو سزا ملنا چاہیے۔

''رضا'' جیسوں کو سزا ملنے سے پہلے، تربیت ملنا چاہیے اور رضا جیسوں کو سزا تربیت سے پہلے ''مرضیہ'' جیسی خواتین کو باخبر بنانا چاہیے۔

مرد کی سنگ دلی اور عورت کی بے خبری وغفلت کے ہاتھوں رونما ہونے والا جرم قانون سے کیا تعلق رکھتا ہے؟ جو رسالہ ''زن روز'' میں رضا کو حق پر بتایا اور اپنی تلوار قانون پر سیدھی کرتا ہے، کیا اگر ''قانون ازدواج موقت'' نہ ہوتا تو سنگ دل رضا، بے خبر وغافل مرضیہ کو خاموش چھوڑ دیتا؟

عورتوں کی تربیت اور ان کی باخبر بنانے کی ذمہ داری سے بچنے کی کوشش کیوں ہے مرد وزن کے حقوق وفرائض شرعی کو چھپاتے ہیں۔ عورتوں کو غافل بنا کر اس قانون کو بطور دشمن تعارف کراتے ہیں جو تن تنہا، عورت کے بارے میں حق گو اور ان کا حامی ہے۔ کیوں اس قانون کو خواتین کے ہاتھ کچلوانا چاہتے ہیں جو ان کی پناہ گاہ ہے؟

۴۔ نکاح منقطع چوں کہ تعدد زوجات کی قسم ہے اور تعدد زوجات غلط ہے لہٰذا نکاح منقطع غلط چیز ہے۔

نکاح منقطع کس قسم کے افراد کیلئے ہے؟ ہم اسی موقع پر اور تعدد ازدواج

بات ۔ بہ امداد خدا۔ الگ اور بہ تفصیل لکھیں گے۔

۵۔نکاح منقطع چونکہ ناپائیدار ہے لہٰذا ان بچوں کیلئے ناموزوں آشیانہ ہے جو اس نکاح کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بچے حمایت پدر اور سرپرست سے محروم اور مادر سرگرمیوں سے بے نصیب رہتے ہیں۔

یہ اعتراض، رسالہ ”زن روز“ کا وہ نکتہ ہے جس پر پورا زور صرف کیا گیا ہے ۔ہم نے جو توضیحات پیش کیے ہیں ان کے بعد کسی اعتراض کی گنجائش نہیں ہوگی۔ ہم گزشتہ مقالے میں ازدواج دائم وازدواج موقت کے فرق بتا چکے ہیں اور کہا ہے کہ ایک فرق تولید نسل سے متعلق ہے۔

ازدواج دائمی میں زن وشوہر باہمی رضامندی کے بغیر ضبط تولید نہیں کر سکتے۔ ازدواج موقت اس کے برخلاف ہے یہاں میاں بیوی دونوں اس معاملے میں آزاد ہیں۔ متعہ میں عورت، مرد کو استمتاع سے تو نہیں روک سکتی مگر مرد کے اس حق کو رکاوٹ ڈالے بغیر مانع حمل عمل ضرور بجالا سکتی ہے۔اس دور کے مانع حمل وضبط تولید کے منصوبوں سے نکاح منقطع ہم آہنگ ہے۔

اس بنا پر متعہ میں میاں بیوی دونوں چاہیں تو بچہ پیدا کریں اور ہونے والے بچے کے نگہداشت وتربیت کی ذمہ دری اٹھائیں تو بچہ پیدا کریں۔ظاہر ہے جذباتی وفطری لحاظ سے نکاحی اور متاعی اولاد میں کوئی فرق نہیں۔ بالفرض اگر ایسا عمل کیا جائے تو قانون پابند ومجبور کرے گا اور حقوق اولاد تلف کرنے سے روکے گا۔ ہاں اگر تولید فرزند نہ چاہیں اور ان کا مقصد نکاح منقطع جنسی تسکین حاصل کرنا ہو تو ضبط تولید کریں۔

ہمیں معلوم ہے ،کلیسا، مانع حمل عمل کو ناجائز قرار دیتا ہے لیکن اسلام کی نظر میں اگر زن وشوہر پہلے سے ضبط تولید کی بات کرلیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔لیکن اگر نطفہ قائم ہوجائے اور بچہ کی پہلی تخلیقی منزل شروع ہوجائے تو اسلام اسے ضائع

ہونے کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔

شیعہ فقہا جو کہتے ہیں کہ ازدواج دائم کا مقصد تولید نسل اور ازدواج موقت کا مقصد استمتاع اور جنسی تسکین کا حصول ہے اس سے اسی قانونی نکتے کی تشریح ہوتی ہے۔

انتقاد۔ چالیس نکات پر

چالیس نکاتی منشور (تجاویز) کے منصف نے ''زن روز'' کے شمارہ ۸۷ میں نکاح منقطع کو نشان نقد ونظر قرار دیا ہے:

پہلے فرماتے ہیں ''موضوع قانون نکاح یا ازدواج منقطع اس قدر تکلیف دہ ہے کہ خود قانون کے واضعین بھی اس کی شرح تفصیل نہ لکھ سکے۔ جیسے وہ اپنے کام سے خوش نہیں تھے جو کچھ کیا ظاہر داری کیلئے تھا۔ دفعات ۱۰۷۵ و ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷ کی لفظیں لکھ کر فقرے جوڑ کر چھوڑ دیے۔

قانونی دفعات مرتب کرنے والے ''نکاح منقطع (متعہ)'' سے متعلق کام سے خوش نہ تھے، نتیجہ یہ کہ انہوں نے بنیادی بات۔ مذکورہ عقد کی تعریف کی تعریف ہی نہیں کی۔ نہ ان کے لوازم وشرائط کی توضیح دی............''

محترم مقالہ نکار اس کے بعد قانون مدنی کے اس نقص کو خود دور فرماتے ہیں اور نکاح منقطع کی تعریف کرتے اور لکھتے ہیں ''نکاح مذکور کے معنی ہیں۔ بے شوہر عورت معین اجرت ومزدوری۔ معلوم معین اور محدود وقت کے ساتھ۔ خواہ چند لمحوں یا گھنٹوں کیلئے ہو۔ جنسی خواہش اور تمتع اور جنسی عمل کیلئے مرد کے حوالے کردے۔

پھر فرماتے ہیں نکاح مذکور میں ایجاب وقبول کے خاص عربی الفاظ ہیں۔ جو شیعہ کتب فقہ درج ہیں۔ قانون نے مدتوں سے ادھر توجہ نہیں کی، جیسے قانون ساز کی نظر میں جو لفظ بھی مدعا، مذکور پر دلالت کرے (یعنی مفہوم ومعنی) کرایہ ومزدوری کے

معنی دے) چاہے وہ عربی نہ بھی ہو۔نکاح منقطع واقع ہوجاتا ہے۔

مضمون نگار کی نظر میں

الف: قانون مدنی نکاح منقطع کی تعریف نہیں کرتا اور شرائط کی توضیح نہیں دیتا۔

ب: نکاح منقطع کی ماہیت یہ ہے کہ عورت اپنے تئیں معین مزدوری کیلئے مرد کو کرایے پر دے۔

ج: قانون مدنی کی روشنی میں عورت کیلئے کرایے (اجارے) کے معنی دینے والے الفاظ، ایجاب وقبول نکاح منقطع کیلئے کافی ہیں۔

میں منصف کو دوسری مرتبہ ''قانون مدنی'' پڑھنے کی دعوت دیتا ہوں مگر ذرا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔رسالہ ''زن روز'' کے متحرم مطالعہ کرنے والوں سے بھی درخواست ہے ذرا زحمت کرکے ''قانون مدنی'' کی ایک کاپی حاصل کرکے مطلوبہ حصوں پر نظر ڈالیں۔

قانون مدنی، چھٹی فصل کتاب نکاح، نکاح منقطع کے بارے میں مخصوص ہے اس میں صرف تین سادہ جملے ہیں۔پہلا یہ ہے کہ نکاح وقتی منقطع ہے یہ معین مدت کیلئے واقع دوسرا یہ ہے کہ نکاح منقطع کی مکمل طور پر مدت معین ہونا چاہیے۔

تیسرا جملہ یہ ہے کہ مہر ومیراث میں نکاحمنقطع کا وہی قانون ہے جو مہر میراث سے مربوط فصلوں میں بیان ہوا ہے۔

چالیس نکات کے محترم منصف کا خیال ہے کہ کتاب نکاح کی پانچ فصلوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نکاح دائم سے مربوط ہے اور فقط یہ تین دفعات نکاح منقطع کے بارے میں ہیں ۔اور یہ بھول گئے کہ پانچوں فصلوں کے تمام قانونی دفعات

بجز تصریح شدہ مقامات کے جیسے دفعہ ۱۰۶۹ یا طلاق سے متعلق بات ۔نکاح دائم ونکاح منقطع میں مشترک ہے مثلاً دفعہ ۱۰۶۲ ہے:

''نکاح واقع ہوتا ہے ان الفاظ کے ذریعے ایجاب وقبول سے جو صاف صاف ارادہ ازدواج کے معنی بتائیں۔''

یہ دفعہ نکاح دائم سے مختص نہیں ہے۔ دونوں نکاح اس کے ضمن میں ہیں۔ عقد کرنے والے عقد یا میاں بیوی کے بارے میں جو شرائط مذکور ہیں ان کا تعلق بھی دونوں نکاحوں سے ہے۔اگر قانون مدنی میں نکاح موقت کی تعریف نہیں تو اس کی وجہ تعریف کی ضرورت کا نہ ہونا ہے۔ نکاح دائم کی تعریف بھی اسی نا پر موجود نہیں ہے۔ اسے تعریف سے بے نیاز سمجھا گیا ہے ''قانون مدنی'' میں ہر اس لفظ کو موثر مانا گیا ہے جو نکاح دائمی اور نکاح منقطع کے معنی وضاحت سے ادا کردے۔لیکن اگر زوجیت کیلئے کسی لفظ کا مفہوم زوجیت کے علاوہ دوسرے معنی دے، جیسے معاوضہ لین دین اجارہ اور کرایہ تو وہ لفظ یا الفاظ، نکاح دائم اور نکاح منقطع دنوں کیلئے کافی نہیں۔

میں اس مضمون میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر چند فاضل جج صاحبان اور واقعی تجربہ کار قانون دان حضرات ۔خوش قسمتی سے ایسے حضرات عدالتوں میں کثرت سے ہیں۔ یہ کہہ دیں کہ مذکورہ اعتراضات قانون مدنی پر واقعاً کیے جا سکتے ہیں۔تو میں آپ ہی سے ''زن روز'' میں اپنے تمام انتقادی مضامین روک لوں گا۔

نکاح موقت اور حرم سرا (۳)

مشرق کے خلاف ،مغرب کے پاس ایک شوشہ ہے جسے بار وہ دکھاتا،فلم بناتا اورتھیٹرکرتے ہیں وہ بات ہے حرم سرا۔افسوس ناک بات یہ ہے کہ مشرق کی سرزمین پر حرم سراؤں کے نمونے کچھ زیادہ ہی دکھائی دیتے ہیں۔

مشرقی خلفاوسلاطین میں کچھ لوگوں کی زندگی ان داستانوں کا بھرپور نمونہ تھی ۔ان کی حرم سراسازی ان کی ہوس رانی وہوس پرستی کی تصویر تیار کرتی ہے۔

کہتے ہیں۔ متعہ کو جائز سمجھا،حرم سرابنانے کی اجازت ہے۔ یورپ کے مقابلے میں ایشیا کا کمزور پوائنٹ ہے ۔متعہ کا جواز ہوس رانی کا جواز ،ہوس رانی کا جواز،اورشہوت پرستی وہوس رانی جس شکل وصورت میں،خلاف اخلاق وترقی ہے۔ ذلت وتباہی کا باعث ہے۔

تعدداز دواج کے بارے میں بھی یہی بات دہرائی جاتی ہے۔ یہ توایوان عشرت وحرم سرابنانے کا جواز ہے۔

تعدداز دواج کی بحث ہم آگے کریں گے سردست تواز دواج موقت ہی سے بحث کرنا ہے۔

اس موضوع کادوطرح سے جائزہ لینا چاہیے ،ایک اس زاویے سے حرم سرا کی تشکیل کا عامل معاشرتی لحاظ سے کیا تھا؟ کیا قانون از دواج موقت تشکیل حرم سراءمشرق میں کوئی موثر ہے یانہیں؟

دوسری بات یہ ہے کہ ’’قانون از دواج موقت‘‘ کے بنانے کا مقصد ضمنی طور پر ہوس رانی اور چندافراد کے لئے حرم سرابنانے کا جواز مہیا کرنا تھا، یانہیں؟

حرم سرا سازی کے معاشرتی اسباب

پہلا حصہ۔حرم سرا کی ایجاد دو عوامل کا نتیجہ ہے:

ا۔حرم سرا سازی کا پہلا عامل،خواتین کی پاکدامنی وتقویٰ ہے۔یعنی ماحول کے اخلاقی ضابطے اور معاشرتی اصول ایسے ہوں جہاں عورت کو اجازت نہ دی جائے کہ جب کسی مرد سے جنسی رابطہ پیدا کر لے تو وہ دوسرے مردوں سے تعلقات قائم کریں۔معاشرے کے اس دباؤ کی بنا پر عیاش آدمی کیلئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ عورتوں کا ایک ٹولہ جمع کرے اور حرم سرا تعمیر کرے۔

سادہ سی بات ہے۔اگر اخلاقی ومعاشرتی نقطۂ نظر سے عورتوں پر پاک دامنی وتقویٰ کی پابندی نہ ہوتی اور عورت مفت یا بلا زحمت اپنے تئیں مرد کے سپرد کرسکتی اور مرد بھی ہر وقت ہر عورت سے ہوس رانی کر سکتے تو مردوں کی مذکورہ صنف لمبی چوڑی حرم سرائیں نہ بناتے اور ان کے بھاری اخراجات اور انتظامات نہ کرتے۔

دوسرا عامل: اجتماعی عدالت کا فقدان۔جب اجتماعی عدالت معدوم ہو۔ایک سمندر میں ڈوب رہا ہو۔نعمت ودولت کے سمندر میں۔دوسرا کشتی میں پھنسا ہو۔فقروافلاس،معذوری وبے چارگی کی کشتی۔مردوں کی وافر تعداد خاندان سازی وشادی سے محروم رہتے ہیں اس سے غیر شادی عورتوں کو تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔اس پس منظر میں حرم سرا کی تعمیر کیلئے زمین ہموار ہوجاتی ہے۔

اگر اجتماعی عدالت ہو خاندان کی تشکیل ممکن ہو وسائل موجود ہوں اور ہر شخص شادی کرسکتا ہو تو لازمی طور پر ہر عورت کیلئے ایک مرد ہوتا اور عیاشی ہوس رانی وحرم سرا کی تعمیر کا ماحول نہ بننے پاتا۔

عورتوں کی تعداد مردوں سے کتنی زیادہ ہوگی،یعنی اگر تمام بالغ مرد شادی

کرلیں تو اس کا امکان کہاں رہتا ہے کہ ہر آدمی حرم سرا بنوا سکے یا ہر دولت مند آدمی ایک حرم سرا کا مالک ہو؟

تاریخ اپنی عادت کے مطابق درباروں اور خلفاء وسلاطین کی حرم سراؤں کا تذکرہ کرتی ہے ان کی کامرانیوں عیش وعشرت کی تفصیل لکھتی ہے۔ اور محلوں کی دیوار تلے ناکامیوں محرومیوں، مردہ حسرتوں اور آرزوں کے ساتھ مرنے والوں کا ذکر نہیں کرتی۔ ان کے بارے میں چپ رہتی ہے جن کو معاشرے کے تقاضوں نے رفیق حیات ڈھونڈنے کی مہلت نہیں دی۔ بیسیوں اور سینکڑوں عورتوں حرم سرا میں زندگی بسر کر چکی ہیں مگر ایسی عورتوں کی تعداد بھی کم نہیں جن کو فطرت حق سے محروم رکھا گیا اور انہیں ایک شوہر بھی نصیب نہ ہوا وہ بیچاریاں تنہا زندگی کے دن کاٹ کر گزر گئیں۔

طے شدہ بات ہے اگر معاشرے پر پاک دامنی کا راج ہو۔ عورت کیلئے تقوی کی پابندی لگ جائے، جنسی کامیابی کا کیڈر نکاح بنا دیا جائے (دائم ہو یا منقطع) اور کوئی صورت ممکن نہ رکھی جائے۔ اقتصادی عدم توازن اور معاشرتی ناہمواری ختم کردی جائے ہر بالغ شخص انسانی طبیعی حق یعنی رفیق حیات حاصل کرنے کا اہتمام ہو تو حرم سرا کی تشکیل محال و ناممکن بن جائے۔

تاریخ پر سرسری نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ قانون ازدواج موقت کا ذرہ برابر بھی دخل حرم سرا کی تعمیر و تشکیل میں نہیں تھا عباس خلفا یا عثمانی سلاطین جو اس ضمن میں سب سے زیادہ بدنام ہیں۔ کبھی شیعہ مذہب سے وابستہ نہ تھے کہ قانون ازدواج منقطع سے استفادہ کرتے۔

شیعہ وسلاطین باوجودیکہ اس قانون سے فائدہ اٹھا سکے اور نکاح موقت کر سکتے تھے مگر وہ اسمیں عباس خلفاء اور عثمانی سلاطین کی تعداد و حالات کے برابر

نہیں پہنچ سکے۔ یہ قصہ بھی خاص حالات اور خاص معاشرتی رجحان کی بنا پر ہے صاحبان دانش اس کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔

کیا ازدواج موقت ہوس رانی کیلئے جواز مہیا کرتا ہے؟

بحث کا دوسرا حصہ۔ آدمی ہر چیز میں شک کرسکتا ہے مگر اس بات میں کوئی شک وتردید نہیں کہ آسمانی مذاہب ہوس رانی کے خلاف ہیں، مذاہب نے خواہش پرستی کے خلاف محاذ لگایا ہے۔ اکثر ادیان و مذاہب کے لوگ ترک ہوس و ترک خواہش کیلئے بڑی بڑی ریاضتیں جھیلتے ہیں۔

اسلام کے واضح اور مسلم اصول میں ایک بنیاد خواہشات کی پرستش سے مقابلہ ہے قرآن مجید نے خواہش پرستی کو بت پرستی کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔ اسلام میں وہ شخص ملعون اور خدا کا قابل نفرت انسان سمجھا گیا ہے جس کا مقصد ہی رنگارنگ عورتوں سے لذت حاصل کرنا ہو۔ ''ذواق'' طلاق پر بحث کے ضمن میں اس موضوع پر کچھ اسلامی مصادر و مدارک نقل کریں گے۔

متعدد شریعتوں کے مقابلے میں اسلام کا امتیاز یہ ہے کہ اسلام، ریاضت ورہبانیت کا مسترد کرتا ہے، ہوس رانی کو جائز قرار دینے کیلئے نہیں۔ بلکہ اسلام کی نظر میں تمام انسانی جبلیں، طبیعی تقاضے جنسی ہوں یا غیر جنسی۔ تقاضے کی حد میں رہیں اور طبیعت کی ضرورت بڑی حد تک پوری ہو جائے، ہاں اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ غرائز (جبلتوں) کو ہوا دے اور انہیں نہ بجھنے والی روحانی پیاس بنالے۔ لہٰذا جو چیز بھی عیاشی حرم سرا سازی اور ہوس راں افراد کی ہوس پرستی کا وسیلہ ہو جس سے ایک عورت دربار اور بچے لاوارث بنیں وہ غیر اسلامی ہے۔

آئمہ علیہم السلام کی طرف سے ازدواج موقت کی تشویق و ترغیب پر احادیث کی

روایت کا ایک فلسفہ ہے جس پر عن قریب گفتگو ہوگی۔

آج کی دنیا حرم سرا!

یہ بھی دیکھے کہ آج دنیا میں حرم سرا کیلئے کیا ہوا ہے؟ آج کی دنیا حرم سرا کو منسوخ کر چکی ہے۔آج کل حرم سرا کو منسوخ کیا جا چکا ہے۔ان دنوں حرم سرا کو ناپسندیدہ کام جانتے ہیں۔اس کے سبب (عامل) وجود کو ختم کر دیا گیا ہے مگر کون سا عامل وسبب؟ کیا معاشرتی ناہمواریوں کو اٹھا دیا ہے اور اب تمام نوجوان شادیاں کرنے لگے اس طریقے سے حرم سرا بنانے کا عمل ختم ہو گیا؟

نہیں،ایک اور کام ہوا ہے۔پہلا عامل وسبب یعنی عورت کو پاک دامنی وتقویٰ نے مقابلہ کیا اور مرد کیلئے بہت بڑی خدمت انجام دی۔تقویٰ اور پاک دامنی جس قدر عورت کو قدر و قیمت بخشتی ہے اس قدر مرد کیلئے رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔

آج کی دنیا نے ایک کام کیا ہے اس صدی کا عیاش مرد بڑے بڑے اخراجات برداشت کر کے حرم سرا بنانے کا محتاج نہیں ہے۔اس صدی کے مرد مغربی تمدن کی برکت سے ہر جگہ حرم سرا میسر ہے۔اس صدی کا مرد ضروری نہیں سمجھتا کہ ہارون رشید و یحییٰ برمکی جسی دولت کا مالک ہو پھر وہ اس تعداد میں رنگا رنگ عورتوں سے لذت اٹھائے۔

اس صدی کے مرد کو ایک موٹر کار اور ماہانہ دو تین ہزار روپے (نہ سہی دس بیس ہزار روپے) درکار ہیں۔وہ جنس خواتین سے ایسی عیاشی اور لطف اندازی کر سکتا ہے جو ہارون رشید نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔ہوٹل رسٹورنٹ اور کافے،حرم سرا کے عوض اپنے ہاں مردوں کو بلا رہے ہیں۔

''عادل کوتوالی'' جیسے بہت سے مرد اس صدی میں سینہ تان کر کہتا ہے۔وہ

بیک وقت بائیس حسینا ئیں ،مختلف شکل وصورت کی عورتیں، میرے پاس ہیں ۔اس صدی کے مرد کواس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔اس قرن کا مرد مغربی تمدن کی برکت سے اگر کچھ کھوسکا ہے تو وہ وسیع اخراجات اور زحمت و درد سر کے ساتھ حرم سرا ہے۔

اگر ''الف لیلہ'' کا ہیرو قبر سے نکل آئے اور عیش وعشرت کے وسیع امکانات اور سستی یا بلا قیمت ملنے والی ماڈرن عورت کو دیکھ لئے ،توکسی صورت میں اتنے زیادہ اخراجات اور مصیبتوں کے ساتھ حرم سرا بنانے کی جرات نہ کرے۔یورپ والوں نے حرم سرا کے انتظامات اورزحمتوں سے اسے معاف کررکھا ہے۔وہ اس بات پران کاشکر گزار ہوتا۔ تعدد ازدواج اور نکاح موقت ختم ہے کیونکہ یہ سب عورتوں کو ذمہ داری اور جواب دہی کا بوجھ ڈالنے والے کام ہیں۔

اگرآپ پوچھیں کہ آج اورکل اس کھیل میں بازی جیتنے اور کھیل ہارنے والا کون ہے؟ افسوس کے ساتھ اس کا جواب یہ ہے کہ آج اور گزشتہ زمانے میں بھی جو بازی ہاری ہے وہ خوش فہم اور سادہ دل ۔جنس خاتون ۔ ہے۔

ازدواج موقت سے خلیفہ کی ممانعت

ازدواج موقت ،فقہ جعفری کے خصوصیات میں ہے دوسرے فقہی سلسلے اسے جائزنہیں جانتے ہیں کسی انداز سے بھی شیعہ سنی بحث (جس نے اسلام کوکمزور کیاہے) میں حصہ لینے کو تیارنہیں ہوں صرف مسئلہ کی مختصر تاریخ کی طرف اشارہ کرنا ضروری جانتا ہوں۔

مسلمانوں کا اتفاق اجماع ہے کہ صدر اسلام میں متعہ جائز تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفر میں ان مسلمانوں کو متعہ کی اجازت دی تھی جن کی بیویاں دورتھیں اس پر بھی اتفاق ہے کہ دوسرے خلیفہ نے اپنی خلافت میں متعہ کوحرام کردیا تھا۔

انہوں نے ایک مشہور جملہ فرمایا: ''دو چیزیں زمانہ پیغمبرؐ میں جائز تھیں میں ان دونوں کو حرام قرار دیتا ہوں جو بھی وہ دونوں کام کرے گا میں سزا دوں گا۔ متعہ زن۔ اور متعہ حج۔

اہل سنت کے ایک گروہ کے خیال میں، رسول اکرمؐ نے آخر عمر میں خود متعہ کو ممنوع کر دیا تھا اور دوسرے خلیفہ کی ممانعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے تھی لیکن جو عبارت جناب خلیفہ کی طرف سے نقل ہے وہ اس مدعا کے خلاف ہے۔

اس مفہوم کی صحیح تعبیر وہی ہے جسے علامہ کاشف الغطا نے پیش کیا ہے۔ خلیفہ بخیال خود یہ حق رکھتے تھے۔ کہ وہ اس بارے میں پابندی لگا سکیں۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے ولی امر کے دائرہ اختیار میں تھا اور جو حاکم وولی چاہے وہ تقاضائے وقت کے مطابق اس قسم کے اختیارات سے فائدا ٹھائے۔ [1]

دوسری لفظوں میں خلیفہ دوم کی ممانعت سیاسی تھی شرعی وقانونی نہیں تھی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ اپنی قیادت کے زمانے میں صحابہ کے دور دراز علاقوں میں منتشر ہونے کو پسند نہ کرتے تھے، وہ تازہ مفتوحہ علاقوں میں پھیلنے اور نومسلم قوموں سے میل ملاپ کے بارے میں اپنی پریشانی نہ چھپاتے تھے۔ وہ جب تک زندہ رہے انہیں مدینے سے باہر پھیلنے سے روکتے رہے۔ لہٰذا وہ اس بات کو بہت برا جانتے تھے کہ نومسلم جو ابھی اسلامی تعلیمات کی گہری تربیت سے آراستہ نہیں ان کے خون سے ان مسلمانوں کے خون کی آمیزش ہو۔ وہ آئندہ نسل کیلئے اسے خطرہ سمجھتے تھے۔ کھلی سی بات ہے کہ یہ مصلحت وقتی تھی۔ چنانچہ اس زمانے کے مسلمان ان کی ممانعت کو ایک سیاسی مصلحت اور وقتی ضرورت سمجھ کر حکم مان گئے، نہ کہ دائمی قانونی۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ

---

[1] تفصیل کیلئے دیکھیے عبدالحسین امینی مرحوم کی کتاب ''الغدیر'' جلد ششم۔

خلیفہ وقت یہ کہے کہ پیغمبر نے یوں حکم دیا ہے اور میں یہ فرمان جاری کرتا ہوں ، پھر مسلمان بھی اسے مان لیتے ۔

لیکن بعد میں خصوصی واقعات کی وجہ سے ''سیرت خلفاء ماسبق'' خصوصاً پہلے دو خلیفہ ۔ یہ اصول بن گیا اور تعصب اس درجہ پر پہنچ گیا کہ اس نے قانون کی شکل حاصل کر لی ۔ اس صورت حال میں خود ہمارے سنی بھائیوں پر جو اعتراض ہے وہ خود جناب خلیفہ سے زیادہ ہے خلیفہ نے بطور سیاسی اور وقتی ضرورت کے -- جیسے ہماری صدی میں سرکار [1] میرزائے شیرازی نے تمبا کو نوشی حرام کی تھی -- نکاح منقطع کو حرام کیا دوسروں کو یہ حق نہ تھا کہ اسے دوامی قانون بنا لیتے ۔

ظاہر ہے کہ علامہ کاشف الغطا [2] (شیخ محمد حسین کی نظر میں یہ بحث نہیں ہے کہ خلیفہ کا یہ دخل اصلاً صحیح تھا یا نہیں ؟ یہ بھی زیر نظر نہیں کہ آیا مسئلہ متعہ ان مسائل میں ہے بھی جن پر خواہ تھوڑی ہی دیر کے لئے کیوں نہ ہو، مسلمانوں کا شرعی ولی قدغن لگا سکتا ہے یا نہیں ؟ زاویہ نظر صرف یہ ہے کہ شروع میں جو بات ہوئی ہے اس کا عنوان یہ تھا اور یہی سبب ہے کہ مسلمانوں نے اس کی مخالفت نہیں کی ۔

خلیفہ کی شخصیت اور اثر عوام کا ان کی سیرت و رویہ کو اپنانا حکمرانی کے معاملے میں ان کے طور طریقوں کا انداز سبب تھا کہ یہ قانون بھول کی نذر ہو گیا اور یہ

---

[1] ناصر الدین شاہ قاچار نے برطانوی کمپنی سے ایران میں تمباکو کی پیداوار اور فروخت کے ٹھیکے کا معاہد کر لیا جو ایرانی عوام اور ملک کیلئے انتہائی خطرناک تھا اس وقت مرجع اعظم میرزا محمد حسن شیرازی نے تمبا کو نوشی کی حرمت کا فتویٰ دے دیا جو انقلاب اور برطانوی استعماری کے خلاف پر منتج ہوا جس کے بعد مشروط قائم ہوئی ۔

[2] شیخ محمد حسین ابن شیخ علی الکاشف الغطا المتوفی ۱۳۷۳ھ مشہور مصنف و فقہ نجف

دستور جو نکاح دائمی کی تکمیل کا ذریعہ تھا۔ ہمیشہ کیلئے متروک ہو گیا نتیجہ میں متعدد مشکلات پیدا ہوئے۔

ائمہ معصومینؑ کو دین مبین اسلام کا محافظ سمجھا جاتا ہے اسی بنا پر ان حضرات نے اسلام کے اس دستور کو فراموشی اور گم نامی سے بچانے کیلئے بڑھ چڑھ کر تشویق کی ۔امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ایک بات جسے بیان کرنے میں کبھی تقیہ نہ کروں گا وہ مسئلہ متعہ ہے۔

اسی نکتے پر ''تشریع متعہ'' کی مصلحت وحکومت ثانوی حکومت اولی سے مل جاتی ہے اور وہ ہے ''متروک شدہ دستور'' کا احیا۔ میرے نقطہ نظر سے جہاں جہاں ائمہ اطہارؑ نے شادی شدہ مردوں کو متعہ سے منع کیا ہے وہاں ''قانون کی حکمت اولیہ'' کو ملحوظ رکھا گیا ہے مطلب یہ تھا کہ قانون متعہ ان لوگوں کیلئے وضع نہیں کیا گیا جن کو ضرورت نہیں ہے ۔امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے علی بن یقطین سے فرمایا: تمہیں متعہ کرنے کی ضرورت کیا ہے خدا نے تمہیں بے نیاز کیا ہے۔''

دوسرے شخص سے فرمایا: ''متعہ اس کیلئے ہے جسے اللہ نے بیوی کے ہوتے ہوئے اس سے بے نیاز کیا ہو جس کی بیوی ہو وہ صرف اس صورت میں متعہ کر سکتا ہے جب اپنی بیوی پر دسترس نہ رکھتا ہو۔''

جہاں عمومی طور پر ترغیب تشویق کی بات ہے وہاں اس قانون کی دوسری جہت سامنے رکھی گئی ہے یعنی ''متروک دستور کی بحالی'' ورنہ فقط ضرورت مند افراد کو ترغیب وتشویق سے مقصد کا حصول کافی نہ تھا۔

شیعہ روایت سے یہ مطلب بخوبی واضح ہے۔

بہر حال یہ طے ہے کہ قانون ساز کے پیش نظر اور ائمہ طاہرینؑ کے سامنے ترغیب وتشویق کا مدعا جانور صفت انسانوں کیلئے ہوس رانی وحرم سرا سازی کا بہانہ

مہیا کرنا نہ تھا یہ بھی نہیں کہ چند ناواقف حال خواتین اور بے سرپرست بچوں کو جبر و مشکلات میں مبتلا کیا جائے۔

حضرت علی علیہ السلام کی ایک حدیث

زن روز، شمار ۸۷ میں جناب مہدوی لکھتے ہیں ابوزہرہ کی ''کتاب الاحوال الشخصیہ'' میں امیر المومنینؑ سے منقول ہے:

لااعلم الحدًا تمتع وھو محصن الارجمته بالحجارة

جناب مہدوی نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

''جب بھی مجھے معلوم ہوا کہ نا اہل آدمی نے متعہ کیا ہے میں اس پر ''زنا محصن'' کی حد سنگساری کی سزا جاری کروں گا۔''

پہلی بات۔ اگر یہ طے کرلیا جائے کہ حضرت علیؑ کی حدیث کے سامنے ہمیں سر تسلیم خم کرنا ہی چاہیے تو حضرت کی اتنی حدیثیں جو شیعہ و غیر شیعہ کتابوں میں درجہ ہیں اور متعہ کی تائید و تاکید کرتی ہیں انہیں کیوں چھوڑا جائے اور ایک ایسی روایت جس کے راوی علماء اہل سنت کے ایک عالم ہیں۔قبول کرلیا جائے پھر اس کی بھی سند معلوم نہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام کے قیمتی ارشادات میں سے ایک یہ ہے:

''اگر عمر آگے نہ بڑھتے اور متعہ کو حرام نہ کرتے تو بدنصیب افراد کے سوا کوئی زنا نہ کرتا۔''

یعنی اگر متعہ حرام نہ کیا جاتا تو غریزہ کے جبر سے متاثر ہو کر کوئی شخص زنا پر آمادہ نہ ہوتا یہ کام وہی لوگ کرتے ہیں جو قانون شکنی کو ترجیح دینے کے عادی ہیں۔

دوسری بات۔۔ مذکورہ بلا عبارت کے معنی ہیں:

''جب بھی مجھے معلوم ہوا کہ نا اہل آدمی نے متعہ کیا ہے اسے سنگسار کروں گا۔''

مجھے نہیں معلوم جناب مہدوی نے ''محصن'' کے معنی ''نا اہل'' کہاں سے لکھ دیے جبکہ اس کے معنی ''وہ شخص جس کی بیوی ہو''

بنا بریں روایت کا مطلب ہے کہ جن کی شادی ہو چکی، بیوی موجود ہے انہیں متعہ کرنے کا حق نہیں۔اگر مقصد یہ ہوتا کہ متعہ کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے و''وھومحصن'' کی قید بے معنی ٹھہری گی۔خیر۔اگر اس روایت کی کوئی بنیاد ہے تو اس سے تائید ہوتی ہے اس نظریے کی جو کہتے ہیں:

قانون متعہ ان لوگوں کیلئے وضع ہوا ہے جو عورت کے محتاج ہے مجرد ہیں یا ان کی بیویوں ان کے پاس نہیں ہے۔

یعنی یہ روایت ''متعہ'' کے جواز کی دلیل ہے نہ کہ حرمت متعہ کی۔

تیسرا حصہ

عورت اور معاشرتی آزادی

پیدا ہونے سے پہلے شوہر۔

لڑکیوں کا تبادلہ

حضرت علیؑ کی خواستگاری کے جواب میں آنحضرتؐ کا جواب میں فاطمہؑ کے سامنے بات رکھوں گا۔

خواتین کا اسلامی انقلاب۔سفید۔تھا۔

اسلام کے نزدیک باپ مختار مطلق نہیں ہے..................

مرد بندہ خواہشات عورت اسیر محبت

اسلام نے عورت کو بے اختیار نہیں کیا۔اس کو مردوں کی شکار دوستی سے بچایا ہے۔

بیٹی پر باپ ولایت۔ایک بحث۔

خلاصہ از مؤلفؒ

سرنوشت کے انتخاب میں آزادی

پریشاں وہراساں لڑکی رسول اکرمؐ کے حضور میں پہنچی:

یارسول اللہ! اس بات کے ہاتھوں..................

............آخر تمہارے باپ نے کیا کیا ہے تجھ سے؟

ایک بھتیجے سے میرے مشورہ کے بغیر میری شادی کردی۔

اب تو وہ کرچکا، تم چپ ہوجاؤ مخالفت نہ کرو۔ تائید کردو اور چچازاد کی بیوی بن کر رہو۔

یارسول اللہؐ! چچازاد سے مجھے محبت نہیں ایسے شخص کی بیوی کیسے بنوں جس سے محبت نہیں کرتی؟

اگراس سے محبت نہیں، کوئی بات نہیں تمہیں اختیار ہے جاؤ جس سے تمہیں محبت ہے اسے اپنا شوہر چن لو!

اتفاقاً میں اس کو بہت چاہتی ہوں اس کے سوا کسی سے محبت نہیں کرتی۔ اس کے سوا کسی کی بیوی نہیں بن سکتی ہے۔ بات تو اتنی ہے کہ میرے والد نے مجھ سے رائے کیوں نہ لی۔ میں جان کر حاضر ہوئی ہوں کہ آپ سے سوال جواب کروں اور یہ جملہ سن لوں خواتین جہاں کو بتادوں کہ باپ بطور خود حتمی فیصلہ نہیں کرسکتے کہ اپنی بیٹیاں جس کو ان کا دل چاہے اس کے حوالے کردیں۔

شہید ثانی[۱] نے ''مسالک'' اور شیخ حسن [۲] نے ''جواہر الکلام'' میں اور دوسرے فقہا نے اہل سنت[۳] کی یہ روایت نقل کی ہے جالیت عرب میں غیر عربوں کی طرح باپ اپنی بیٹیوں، اپنی بہنوں کبھی تو اپنی ماں کے بارے میں اپنا حق یہی سمجھتے تھے کہ جس سے چاہیں بیاہ دیں۔ اور خواتین بے اختیار تھیں۔ وہ اپنی پسند اور اپنے اختیار سے شوہر کا انتخاب نہیں کرسکتی تھیں۔ یہ اختیار ان کے خیال میں باپ کو پھر بھائی اور ان دونوں کی غیر موجودگی میں چچا کو حاصل تھا۔

اختیار کے استعمال کی حد یہاں تک پہنچی کہ لڑکیاں پیدا ہونے سے پہلے مرد کے رشتے میں دے دی جاتی ہیں۔ لڑکی کے پیدا ہونے اور بڑی ہونے کے بعد اس مرد کو حق تھا کہ وہ لڑکی کو اپنے لئے لے جائے۔

جنم سے پہلے نکاح

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخر حج تھا ایک روز آپؐ ہاتھ میں کوڑا لئے سوار جا رہے تھے ایک آدمی نے راستہ روک کر کہا:

ایک شکایت ہے۔

بیان کرو۔

چند برس پہلے جاہلیت کے دنوں میں اور طارق ابن مرقع ایک جنگ

---

[۱] شہید ثانی، زین الدین ابن علی ابن احمد العاملی (۹۱۱۔۹۶۶ھ) کتاب فقہ مفصل کا نام سے مسالک ہے شرح لمعہ بھی انہیں کی تالیف ہے۔

[۲] جواہر الکلام شریع الاسلام کی مفصل شرح کے مصنف تھے شیخ محمد حسن نجفی متوفی ۱۲۶۶ھ

[۳] سنی کتابوں میں دیکھیے، سنن ابن ماجہ ج ا ص ۵۷۸۔ شیعہ کتابوں میں دیکھیے جواہر الکلام، چاپ بیروت ج۲۹۔۱۷۷

میں شریک ہوئے مصروفیات جنگ میں طارق کو نیزے کی ضرورت پڑی ۔اس نے پکار کر کہا: کوئی ہے جو مجھے نیزہ پہنچا کر مزدوری لے؟ میں آگے بڑھا اور پوچھا کیا صلہ دوگے؟ اس نے کہا میرے یہاں جو لڑکی پیدا ہوگی وہ تمہاری اسے پال پوس کر جوان کروں گا میں نے صلہ منظور کر لیا اور اپنا نیزہ اسے دے دیا۔ قصہ ختم ہوا، جنگ کوئی برس گزر گئے ایک دن خیال آیا، خبر پوچھی معلوم ہوا اس کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی اور اب وہ شادی کے قابل ہے۔ میں طارق کے پاس گیا اور وہ بات یاد دلائی اور اپنے فرض کا مطالبہ کیا۔ اس نے حیلے حوالے اور بہانے کرنے شروع کر دیے ۔وہ مجھ سے دوبارہ مہر لینے کی فکر میں ہے ۔میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں یہ فرمائیے میں حق پر ہوں یا وہ؟

لڑکی کا سن کیا ہے؟

لڑکی بڑی ہو چکی ہے سر کے بال بھی سفید ہو چکے ہیں۔

اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو حق پر تم ہو۔ نہ طارق غریب عورت کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اور تم اپنا کام کرو۔

وہ آدمی حیران ہوا پیغمبرؐ کو دیکھتا رہا سوچ رہا تھا یہ کیسا فیصلہ ہے باپ کو اپنی بیٹی پر اختیار نہیں میں لڑکی کا نیا مہر، باپ کو دے دوں اور وہ اپنی خوشی و رضامندی سے اپنی لڑکی میرے حوالے کر دے تو غلط کام ہوگا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی پھٹی پھٹی نگاہوں کو دیکھ کر سمجھ گئے اس پریشانی خیال کو ملاحظہ فرما کر کہا:

پریشان نہ ہو، میں نے جو بات کہی ہے اس سے نہ تم گنہ گار ہوگے نہ تمہارا دوست طارق۔

لڑکیوں کا ادلہ بدلہ:

لڑکیوں پر باپ کے مکمل اختیار کا ایک مظہر نکاح شغار تھا ''نکاح شغار'' یعنی لڑکیوں کا عوض معاوضہ۔ دو آدمیوں کی دو لڑکیاں شادی کے قابل ہوں۔ لوگوں ان کا ادل بدل کرتے تھے یعنی ایک لڑکی دوسری لڑکی کا مہر بنتی تھی۔ اسلام نے یہ دستور منسوخ کر دیا۔

رسول اللہؐ نے اپنی صاحب زادی حضرت زہراؑ کو انتخاب شوہر میں آزاد رکھا

حضرت علیؑ طلب گاری حضرت زہراء مرضیہؑ کیلئے حاضر ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کو جواب دیا اب تک کئی آدمی طلب گاری کیلئے آئے ہیں۔ میں نے خود ان کی بات زہراؑ سے کہی، انہوں نے چہرے کے آثار سے اظہار نا منظوری کیا اب میں تمہاری بات بھی کہوں گا۔

پیغمبر، فاطمہ زہراؑ کے پاس گئے اور پیاری بیٹی کو رشتے کا آیا ہوا پیام سنایا۔ سیدہ عالمیان نے منہ نہ پھیرا اور خاموش بیٹھی رہیں سکوت سے رضامندی کا اظہار ریکھ کر آنحضرتؐ تکبیر کہتے ہوئے فاطمہؑ کے پاس سے اٹھ کر باہر آئے۔

اسلامی تحریک میں خواتین کا انقلاب سفید

خواتین کیلئے اسلام نے بہت بڑی خدمتیں انجام دی ہیں۔ اسلام نے صرف یہی نہیں کیا کہ بیٹی پر باپ کے تمام تر اور مکمل اختیارات واپس لے لئے۔ بلکہ اسلام نے عورت کو مکمل آزادی اور شخصیت عطا کی۔ فکر و نظر کو آزادی بخشی عورت کے

طبیعی حقوق کو قانونی حیثیت دی۔ حقوق خواتین کے بارے میں اسلام نے جو اقدامات کیے ہیں اور یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے دوسرے ممالک جو اس کی رو میں بہہ رہے ہین۔ ان کا جائزہ لیا جائے تو اساسی طور پر دو فرق ملیں گے۔

ایک تو زن و مرد کی نفسیات کے زاویہ نظر سے فرق ہے۔ اسلام نے اس سلسلے میں معجزہ دکھایا۔ ہم آئندہ اوراق میں اس پر گفتگو کریں گے اور کچھ مثالیں سامنے رکھیں گے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ عین اس وقت جبکہ وہ خواتین کو ان کے انسانی حقوق ،ان کی شخصیت و حیثیت و آزادی و خودمختاری دے رہا تھا۔ اس لمحہ جنس مرد سے انہیں بغاوت سرکشی و نافرمانی پر نہیں ابھارا اس نے کبھی بھی مردوں سے بدبینی اور ان کے بارے میں غلط اندیشی کی تحریک نہیں کی۔

خواتین کا انقلاب سفید تھا سیاہ سرخ نیلا اور بنفشی نہ تھا۔ یہ انقلاب ہے بیٹیوں سے باپ کا احترام اور بیویوں سے شوہروں کا احترام چھیننے نہیں آیا اسلام کے انقلاب نے گھریلو زندگی کی بنیاد نہیں ہلائی، بیویوں کو شوہروں کی خبر گیری اور ماں کو تربیت اولاد سے بدظن نہیں بنایا، بے شادی شدہ لڑکوں کیلئے ایسے وسائل نہیں پیدا کیے جن کے سہارے وہ معاشرے میں مفت کے شکار کھیل سکیں، خواتین کو شوہروں کی پاک آغوش اور بیٹیوں کو ماں باپ کے سایہ مہر و محبت سے نکال کر افسروں اور سرمایہ داروں کے حوالے نہیں کیا۔ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا کہ آنسوؤں کے سمندر میں طوفان اٹھے۔ ہائے ،گھر کا امن و سکون تباہ ہو گا ی، باپ کے دل سے اطمینان چھن گیا، اس افراتفری میں آدمی کیا کرے؟ نومولود بچوں کا قتل ،اسقاط کا علاج کیا ہے؟ چالیس فی صد ناجائز بچوں کی پیدائش کا حل کیا ہے؟ نومولود بچے ،جن کا باپ نہیں ملتا، ماؤں نے یہ بچے اپنے گھروں میں جنے ہیں۔ چاہنے والے باپ کے گھر میں پیدا نہیں ہوئے۔ ان کا اس

بچے سے کوئی تعلق نہیں ۔ یہ بچہ پرورش گاہ کے حوالہ کر دیا جاتا ہے وہاں کوئی ان کی خبر لینے نہیں آتا۔

ہمارے ملک میں خواتین کے انقلاب کی ضرورت ہے ۔لیکن سفید اسلامی انقلاب مغربی کالی کلوٹی انقلابی تحریک درکار نہیں۔

ایسا انقلاب جس میں شہوت پرست جوانوں کا ہاتھ نہ پہنچ سکے۔ وہ انقلاب جو براہ راست اسلام کے اعلیٰ تعلیمات سے مستفید ہو۔ یہ نہیں کہ اس کا مدعا صرف ''قانون مدنی'' بدلنا ہو۔یعنی اسلام کے مسلمہ قوانین ہوا وہوس کا نشانہ بنائے جائیں۔ وہ انقلاب جس کی پہلی منزل عمیق اور گہرا مالعہ ہو۔ تاکہ یہ بات کبھی کر سامنے آئے کہ جس معاشرے کا نام اسلام سے وابستہ کیا گیا ہے وہ کس حد تک اسلام کو نافذ کرتا ہے۔

خدا کی توفیق سے اگر یہ سلسلہ مضامین باقی رہا تو اہم مسائل کو مکمل کرنے کے بعد خواتین کے اسلامی انقلاب کا ایک پروگرام شائع کروں گا جس سے واضح ہوگا کہ ایرانی خواتین واقعاً ایک ایسا انقلاب لاسکتی ہیں جو نیا زور دنیا پسند بھی ہو اور منطقی وبادلیل ہونے کے ساتھ ساتھ چودہ سو سالہ اسلامی تعلیمات کے سرچشمے سے سیراب بھی ہو۔جس میں مغرب کی طرف بھیک کا ہاتھ نہ پھیلا یا گیا ہو۔

باپ کی اجازت

باپ ،،لڑکی کا ولی ہے یعنی ،کیا دوشیزہ لڑکیاں جو پہلی مرتبہ شادی کرنا چاہیں انہیں باپ کی اجازت لینے کی شرط ہے یا نہیں؟

اسلام کی نظر میں چند باتیں طے شدہ ہیں

لڑکا اور لڑکی اگر اقتصادی طور پر خود کفی ہوں نالغ وعاقل ،نیز رشید بھی

ہوں۔ یعنی معاشرتی لحاظ سے ان کا فکری معیار اقدر ہو جس کی بنیاد پر وہ اپنے مال کا تحفظ ونگہداشت کرسکیں ان کا سرمایہ ان کے ہاتھ میں رہ سکے۔ تو ماں باپ، ماں یا شوہر، بھائی یا کسی دوسرے آدمی کو ان پر نظرت ودخل اندازی کا حق نہیں ہوسکتا۔

دوسری طے شدہ بات شادی کے بارے میں ۔اولاد ۔بالغ ہونے کی عمر پر پہنچ جائے ،عقل ورشد بھی ہو۔ تو اپنے بارے میں وہ خودمختار ہیں ،کسی کو ان کے معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں ۔لڑکیوں کا معاملہ یہ ہے کہ اگر کوئی لڑکی ایک ایک مرتبہ شوہر کر چکی ہے اور اب بیوہ ہے تو ہو بھی لڑکے کی طرف خودمختار ہے اور کسی کو اس کے معاملے میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ ہاں اگر دوشیزہ ہے اور اس کا پہلا نکاح ہے تو؟

باپ کو مکمل اختیار نہیں ،لڑکی کا عندیہ اور اس کی رضامندی کے بغیر جس کے ساتھ بیاہنا چاہے نہیں بیاہ سکتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ہم نے دیکھا باپ نے بیٹی کی رائے کے بغیر نکاح کر دیا تو آپ نے فرمای: پسند نہیں تو دوسرے کے ساتھ میں شادی کرسکتی ہو۔ فقہا میں اس نقطہ نظر سے اختلاف ہے کہ آیا دوشیزہ لڑکیاں، باپ کی رضامندی حاصل کیے بغیر شادی کا حق نہیں رکھتیں؟ یا باپ کا اتفاق رائے کسی طرح شرط صحت نکاح نہیں ہے؟

البتہ ایک مسئلہ قطعی ومسلم ہے کہ اگر باپ کسی سبب کے بغیر لڑکی کے نکاح کو منع کریں تو اس کا حق (ولایت) ساقط ہوجاتا ہے اور باتفاق تمام فقہا ،لڑکی انتخاب شوہر میں مکمل آزادی کی مالک ہیں۔

رہا یہ کہ آیا باپ کی رضامندی شرط ہے یا نہیں؟ ہم نے بتایا کہ فقہا میں اختلاف ہے شاید اکثر فقہا ،خصوصاً متاخرین علما (آخری دور کے فقہا) باپ کی رضامندی کو شرط نہیں جانتے ،مگر بعض علماء متاخر ،شرط جانتے ہیں ہمارے ’’قانون

مدنی'' نے دوسرے گروہ کے فتوے کو قانون بنایا ہے کیونکہ اختیار کا راستہ یہی ہے۔

اسلامی نطقہ نظر سے کیونکہ مسئلہ مرد اتفاق نہیں اس لئے ہم اسلامی نقطہ نظر سے بحث بھی نہیں کرتے البتہ معاشرتی لحاظ سے بحث ضروری سمجھتا ہوں اس کے علاوہ میری رائے، ہ اِ'' قانون مدنی'' نے صحیح راہ اختیار کی ہے۔

مرد بندہ شہوت اور عورت اسیر محبت ہے

بن بیاہی لڑکیوں پر لازم --کم از کم ان کیلئے اچھا ضرور ہے کہ باپ کی ہم خیالی کے بغیر کسی مرد سے شادی نہ کریں۔اس کا فلسفہ یہ نہیں ہے کہ لڑکی کو ناقص اور معاشرتی لحاظ سے اس کا شعور مرد سے کمتر سمجھا گیا ہے۔اگر یہی بات ہوتی تو سولہ برس کی بیوہ اور اٹھارہ برس کی بن بیاہی میں فرق کیا ہوگا۔سولہ برس کی عمر والی بیوہ ہو باپ کی رضامند کی پابند نہ ہو اور اٹھارہ برس کی بن بیاہی رضا پدر کی پابند ہو۔پھر یہ بات بھی دیکھیے،اگر لڑکی اسلام کی نظر میں اپنے معاملات میں ناقص سمجھی جاتی تو بالغہ ورشیدہ لڑکی اپنے مالی امور اور ملینوں ،بلینوں سرمایے کے معاملے میں ،باپ بھائی اور شوہر کے راضی ہونے یا اجازت لینے کی پابند کیوں نہیں؟ اور انہیں دخل دینے کا حق کیوں نہیں؟ اس کے اقدامات صحیح اور وہ سب سے بے نیاز کیوں ہے؟ دراصل یہاں ایک دوسرا فلسفہ ہے فقہی دلائل سے قطع نظر۔اس فلسفے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اور'' قانون مدنی'' تیار کرنے والوں کی اس بنیاد پر داد دینا چاہیے۔

بات۔عورت میں کمی یا عقلی وفکری نقص ہی کی نہیں۔اس کا تعلق مرد وعورت کے نفسیات سے ہے۔اس کا ربط کی وفا سچائی اور محبت پر جلدی سے ایمان لے آتی ہے۔

مرد خواہشات کا غلام اور عورت اسیر محبت ہے مرد کے پیر شہوت سے

لڑکھڑا جاتے ہیں مگر ماہرین نفسیات کے بقول عورت جنسی خواہشات کے بارے میں مرد سے زیادہ صابر و پائیدار ہے۔ ہاں عورت کو چت کرنے والی چیز اظہار محبت وخلوص۔ وفا وخلوص ہے وہ مرد سے یہ باتیں سن کر لڑکھرا جاتی ہے۔عورت کی خوش فہمی یہاں کھل جاتی ہے عورت جب تک بن بیاہی ہے جب تک اس کے لباس نے مرد کا صابن مس نہیں کیا اس وقت تک وہ مرد کے زمزمہ محبت کو جلدی سنتی اور ماننے لگتی ہے۔

معلوم نہیں آپ نے ''زن روز'' کے شمارہ نمبر ۹۰ میں، امریکی ماہر نفسیات کا مضمون پڑھا یا نہیں؟ پروفیسر ''ریگ'' کے مضمون کا عنوان تھا ''عورت و مرد کیلئے دنیا ایک جیسی نہیں ہے'' پروفیسر لکھتا ہے کہ بہترین فقرہ جو ایک مرد کسی عورت سے کہہ سکتا ہے وہ ہے ''پیاری! میں تمہیں چاہتا ہوں'' روزمرہ محاورہ پھر ''ریگ'' نے لکھا۔ ایک عورت کے واسطے سب سے بڑی خوش نصیبی ایک مرد کا دل موہنا اس کی زندگی بھر دیکھ بھال ہے۔

رسول اکرمؐ وہ نفسیات کے خدائی ماہر اس حقیقت کو چودہ سو برس پہلے بیان کر چکے ہیں آپ نے فرمایا: میں تمہیں چاہتا ہوں ایسا جملہ ہے جو عورت کے دل سے نہیں نکلتا۔

شکاری مرد عورت کی اس نفسیاتی کمزوری سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے ہیں ''پیاری''، ہم تو تمہارے عشق میں مر رہے ہیں'' مردوں کے ہتھکنڈوں سے ناواقف لڑکیوں کیلئے یہ بہتر جال ہے۔

''زن روز'' کے تازہ شماروں میں افسر نامی خاتون کی داستان چھپ رہی ہے یہ خاتون خودکشی کرنا چاہتی ہے جواد نے اس کو فریب دے رکھا تھا، بات کچہری تک پہنچی اور زبان زد عام ہوگی جواد نے افسر کو اپنا گرویدہ بنانے کیلئے مذکورہ فامورلے سے فائدہ اٹھایا، بقول رسالہ زن روز، افسر کہتی ہیں۔

میں نے اس سے بات تونہیں کی مگر ہر ساعت اور ہر لمحے اسے دیکھنے کو تڑپتی تھی، میں تو عاشق نہ تھی مگر جس عشق کا اظہار وہ کرتا تھا اس سے مری روح کو نیاز مندی ضرور تھی۔ ساری عورتوں کا حال یہی ہے ''عشق'' کو پسند کرنے سے پہلے ''عشق'' پر فریفتہ ہوجاتی ہے۔لڑکیوں اور خواتین کی پیدائش سے پہلے عاشق ان کے بعد عشق پیدا ہوتا ہے اس قانون سے میں بھی مستثنیٰ نہ تھی۔

تجربہ کار بیوہ پر یہ تازہ واردات بیت گئی تو ناتجربہ کار لڑکیوں کا حال کیا ہوگا۔ یوں لازم قرار پایا کہ ''مرد ناآموزدہ'' لڑکی باپ کی رضامندی بہرحال حاصل کرے۔ باپ مرد کے احساسات ،جذبات ونفسیات سے بہتر آگاہ ہوتے ہی ہیں۔ چند افراد و حالات کو چھوڑ کر باپ اپنی بیٹی کی خیر خواہی کے طلب گار ہوتے ہیں لہٰذا ان سے مشورہ مفید و لازم ہے۔

قانون اس نکتے پر کسی انداز سے بھی عورت کی توہین نہیں کرتا۔ اس نے تو حمایت کا ہاتھ کاندھے پر رکھا ہے اگر لڑکا دعویٰ کرے کہ قانون نے انہیں باپ یا ماں کی رضا حاصل کرنے کا پابند کیوں نہیں کیا۔تو ان کا دعویٰ منطق کے خلاف نہ ہوگا۔خصوصاً ان لوگوں کیلئے جو لڑکیوں کی ہم آہنگی پدر پر معترض ہیں۔

تعجب کرتا ہوں ،لوگ روزانہ ''بیوک وزہرہ'' عادل ونسرین کے افسانے اور ڈرامے دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ پھر لڑکیوں کو اولیا کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔

ان کے کردار میں تضاد محسوس کرتا ہوں ۔عورت کے بارے میں ان کی ہمدردی و غمخواری دیکھیے ، پھر شکاریوں کیلئے شکار تیار کرتے ، گولیاں دیتے اور لڑکیوں کے گلے کو ہنکا کر نشان پر پہنچاتے ہیں۔

''زن روز'' شمارہ ۸۸ میں چالیس نکاتی قرارداد کے مصنف نے کہا ہے:

''دفعہ ۱۰۴۳۔ بلوغ ورشد سے متعلق تمام دفعات کی مخالف اوران

کو توڑے والی دفعہ ہے۔ نیز آزادی انسان اور منشور اقوام متحدہ کے خلاف............

معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے سوچ رکھا ہے کہ مذکورہ دفعہ باپ کو حق دیتی ہے وہ جسے چاہیں اپنی بیٹی دے دیں اور انہیں بلا وجہ شادی روکنے کا بھی حق ہے۔

باپ غلط اندیش اور بدنیت نہ ہو جو لڑکی کو شادی ہی نہ کرنے دے۔اس صورت میں لڑکیوں کو با اختیار مان کر شادی کے صحیح ہونے کی شرط باپ کی رضامندی مان لی جائے تو کیا خرابی ہے، اور انسانی آزادی کے منشور کی کیا خلاف ورزی ہے؟ یہ تو ایک احتیاطی اقدام اور پیش بندی ہے۔ان خواتین کیلئے جن کا سابقہ تجربہ کچھ نہیں ہے۔ اور مرد کی جبلت وطبیعت کے بارے میں بے اطمینانی کی وجہ سے یہ احتیاطی تدبیر کی گئی ہے۔

مضمون نگار کہتے ہیں:

’’ہمارے قانون ساز نے تیرہ برس کی لڑکی کو شادی کے قابل قرار دیا ہے ۔ابھی اس کی فکری نشوونما پوری نہیں ہوئی۔ اصولاً اسے شادی کے معنی اور بیوی بننے اور شوہر بنانے کا مطلب بھی نہیں آتا۔ایسی مخلوق جو دو چار سیر ترکاری بھی نہیں خرید سکتی اسے حق ہے کہ شادی کرے اور زندگی بھر کا ساتھی قبول کرے۔اس کے مقابلے میں پچیس یا چالیس سالہ خاتون ،تعلیم یافتہ ،یونیورسٹی کی ہوا کھائے اعلیٰ درجے کی دانش ورکو شادی کا حق نہیں۔ بلکہ ضروری ہے وہ بے پڑھے باپ یا دادا سے اجازت اور رائے حاصل کرے......‘‘

پہلے تو قانون کے کس جز سے آپ نے یہ دریافت کیا کہ تیرہ برس کی لڑکی باپ کی اجازت لیے بغیر شادی کرسکتی ہے اور پچیس یا چالیس برس کی لڑکی ’’دانش گاہ دیدہ خاتون شادی نہیں کرسکتی۔ دوسرے یہ ہے کہ باپ کی اجازت انہیں حدود میں

ہے جہاں وہ جذبہ پدری اور مرد کے ان احساسات کا اندازہ کر سکے جو عورتوں کے بارے میں ہوا کرتے ہیں۔لیکن اگر رکاوٹ بننے کا روپ دھار لے تو اس کی اجازت بے قیمت ہے۔

تیرے میں نہیں سمجھتا کہ عہد قدیم سے آج تک کوئی ایسا جج پیدا ہوا اور دکھائی دیا ہو جس نے ''قانون مدنی'' کی رو سے کہا ہو کہ فکر و عقل کی پختگی (رشد عقلی) شادی میں شرط نہیں ہے اور بقول مضمون نگار، تیرہ سالہ لڑکی جسے شادی اور انتخاب شوہر کے معنی معلوم نہ ہوں وہ شادی کر سکتی ہے۔

قانون مدنی دفعہ ۲۱۱ میں ہے:

''دو معاملہ کرنے والے اہل سمجھ جائیں اس کیلئے بالغ و عاقل و رشید ہونا چاہیے''۔

قانون کے اس فقرہ میں اگرچہ ''معاملہ کرنے والے'' کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے اور باب نکاح۔معاملہ نہیں۔لیکن اس کے ساتھ ایک مجموعی عنوان ہے ''عقود، معاملات، پابندیاں'' یہ پیر گراف دفعہ ۱۸۱ سے شروع ہوتا ہے۔قانون مدنی کے ماہرین نے دفعہ ۲۱۱ کو ''اہلیت عام'' ۔۔عمومی صلاحیت کے طور پر مانا ہے یہ اہلیت تمام ''عقود'' میں (جہاں جہاں صیغہ معینہ جاری کیا جائے) لازمی قرار دی ہے۔

تمام پرانی دستاویزوں اور نکاح ناموں میں ''بالغ و عاقل و رشید'' کے بعد شوہر کا نام اور بالغہ، عاقلہ و رشیدہ کے بعد بیوی کا نام لکھا ہوا موجود ہے ''قانون مدنی'' کے مرتب کرنے والے اس نکتے سے کیونکر غافل رہ سکتے تھے۔

''قانون مدنی'' کے مرتبین باور نہیں کر سکتے تھے کہ فکری گراوٹ یہاں تک پہنچے گی کہ ''عمومی اہلیت'' بیان کرنے دینے کے باوجود، باب نکاح میں دوبارہ ''بلوغ و عقل و رشد'' کیلئے ایک دفعہ لکھنا چاہیے۔

دفعہ ۱۰۶۴ پر قانون مدنی کے ایک شارح جناب ڈاکٹر سید علی شالگان فرماتے ہیں ۔ ''عاقد کو بالغ و عاقل و باارادہ ہونا چاہیے'' موصوف نے سوچا کہ اس کا تعلق میاں بیوی سے ہے اوران کے نکاح کی اہلیت کا بیان ہے رشد کا تذکرہ موجونہیں لہٰذا فیصلہ کر دیا کہ مذکورہ دفعہ ،دفعہ ۲۱۱ کے خلاف ہے جس میں عام اہلیت کا تذکرہ ہے ۔ یہ کہنے کے بعد توجیہ کرتے ہیں کہ دفعہ ۱۰۶۲ اگر ''عاقد'' کے بارے میں ہے اور وہاں ضروری نہیں کہ رشید ہو۔

یہاں محل اعتراض ایرانی عوام کا طریق کار ہے نہ قانون مدنی پر اعتراض ہوسکتا ہے نہ قانون اسلام پر ہمارے عوام کی اکثریت میں ابھی دور جاہلیت کی طرف باپ اپنے تیئں مکمل اختیار کا مالک سمجھتے ہیں اور انتخاب شوہر و شریک زندگی اور نسل آئندہ کے باپ کے بارے میں لڑکی کی رائے کا اظہار، بے حیائی و تہذیب کے خلاف جانتے ہیں ۔فکری پختگی (رشد فکری) جسے لڑکے کے بارے میں اسلام مسلم جانتا ہے ۔توجہ کے قابل نہیں سمجھتے کتنے ہی نکاح ہیں جو لڑکیوں کے رشد سے پہلے ہو چکے ، حالانکہ وہ غیر موثر اور شرعاً باطل تھے۔

عقد کرنے والے لڑکی کے رشد کے بارے میں چھان بین کرتے ہی نہیں ۔ان کے نزدیک لڑکی کا بالغ ہونا کافی ہے دراں حالیکہ بڑے بڑے علما کے بہت سے واقعات ہمارے علم میں ہیں انہوں نے لڑکیوں کے عقلی و فکری پختگی کے تجربے کیے ہیں کچھ علماء لڑکی میں رشد دینی (دینی پختگی ،کو شرط مانتے ہیں ۔ یہ علماء صرف انہیں لڑکیوں کا عقد پڑھتے تھے جن کو اصول دین پر استدلال آتا تھا۔ افسوس آج کل بچوں کے اکثر ولی اور نکاح کرنے والے ان باتوں کا خیال نہیں رکھتے۔

عوام کے رویوں پر گفتگو چونکہ مطلوب نہیں لہٰذا سارے پیالے پیالیاں ''قانون مدنی'' کے سر پر توڑنا چاہیے عوام کے ذہن اس ''قانون مدنی'' کے خلاف

کرنا چاہیے جو قوانین اسلام سے پیدا ہوا ہے۔

میری نظر میں ''قانون مدنی'' پر جو اعتراض ہوتا ہے وہ دفعہ ۱۰۴۲ سے مربوط ہے یہ دفعہ کہتی ہیں:

''پندرہ برس پورے کرنے کے بعد بھی لڑکیاں جب تک اٹھارہ سال کی نہ ہو جائیں اس وقت تک ولی کی اجازت کے بغیر شوہر نہیں کر سکتیں

اس دفعہ کی رو سے پندرہ اور اٹھارہ برس کے درمیان عمر کی بیوہ بھی بلا اجازت ولی شادی نہیں کر سکتی۔ حالانکہ فقہ شیعہ اور عقلی بیناد پر جو عورت شرائط کے مطابق بالغہ ورشیدہ ہے ایک مرتبہ شادی کر چکی ہے تو اسے باپ کی اجازت ورضا حاسل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

چوتھا حصہ

اسلام اور بدلتی زندگی

وقت کے تقاضے۔

دین اور وقت کے تقاضے نہرو کی نظر میں

اسلام کا زندگی کی ترقیوں سے انطباق غیروں کیلئے تعجب آفرین ہے۔

اسلام نے مستقل ضروریات کے مستقل ضابطے اور ادلتی بدلتی ضرورتوں کیلئے غیر مستقل ضابطوں کو پیش نظر رکھا ہے۔

اگر ہر چیز کو زمانے سے منطبق (ہم آہنگ) کریں تو خود زمانے کو کس سے ہم آہنگ بنائیں؟

زمانے سے اسلام کی ناہم آہنگی ایک گروہ کے جمود اور ایک گروہ کی جہالت کا نتیجہ ہے۔

قرآن نے اسلامی معاشرے کی تشبیہ اس سبزے سے دی ہے جو پھپک رہا ہو۔

''صدی کی پیداوار'' ایسی اصطلاح ہے جس نے بہت سے خاندان تباہ کر دیے۔

جامد (غیر متحرک) ہمیشہ پرانی چیز سے جوڑ کھاتی ہے اور جاہل ہر تباہی کا سبب تقاضائے زمانے بتاتے ہیں۔

قوانین اسلام کی تکنیک میں ایسے جوڑ اور موڑ ہیں جن کی بدولت اس میں حرکت اور مڑنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔

ہیٹ پہننا حرام نہیں۔ دم چھلا بننا حرام ہے۔

اسلام ''قاعدہ ضرر'' و ''قاعدہ حرج'' کیلئے ''ویٹو'' کا قائل ہے۔

(خلاصہ از مولف)

اسلام اور بدلتی زندگی (۱)

زمانے کے تقاضے

مقدمہ کتاب ''انسان وسرنوشت'' میں مسلمانوں کے عروج وزوال کے مسئلے پر بحث کر چکا ہوں وہاں لکھا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں موضوع کے تین حصے کر کے بحث وتحقیق کی ہے

اسلام کا حصہ۔ مسلمانوں کا حصہ۔ اجنبی عوامل کا حصہ

اس مقدمہ میں جن ستائیس نکات پر تحقیق کی ضرورت پر زور دیا ہے ایک موضوع یہ بھی ہے میں نے وہاں وعدہ کیا ہے ''اسلام اور مقتیات زمان'' پر ایک کتابچہ لکھوں گا چنانچہ کچھ نوٹ بہت دنون سے تیار کر رہا تھا۔

مقالات کے اس سلسلے میں سب باتیں تو لکھنا مشکل ہیں تفصیل کیلئے تو مستقل کتاب ہی ہونا چاہیے۔ ہاں اس موضوع پر یہاں اتنا ضرور لکھوں گا جو مختصر طور پر قاری کے ذہن کو منور کر دے۔

مذہب وترقی۔ ایسا موضوع ہے ہم مسلمانوں سے پہلے اور ہم سے زیادہ دوسرے مذاہب واہل مذاہب کے سامنے آتا رہا ہے۔ دنیا کے بہت سے روشن دماغ اس لئے مذہب چھوڑ بیٹھے کہ ان کے خیال میں مذہب اور آئے دن بدلتی ہوئی زندگی میں جوڑ نہیں بیٹھتا دنوں ہم آہنگ نہیں ہوسکتے۔ ان کی سوچ میں دینداری ،ٹھہراؤ اور سکون کا نام ہے مذہب حرکت اور تبدیلی سے برسر پیکار رہتا ہے۔ دوسری عبارت میں وہ سمجھتے ہیں کہ مذہب ثبات یک رخی اور شکل وصورت کی یکسانیت چاہتا ہے۔

آنجہانی نہرو، ہندوستان کے وزیر اعظم مذہب کے خلاف تھے اور (بقول

خود) کسی دین ومذہب کا قائل نہ تھے ان کی باتوں سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ مذہب کے جموداورس کے منفرد رویے سے بیزار ہوگئے تھے ۔نہرو، زندگی کے آخری دور میں اپنے اندراور پوری دنیا میں ایک خلامحسوس کرنے لگے تھے۔ان کے خیال میں یہ خلا روحانی طاقت ہی سے پر ہوسکتا تھا اس کے باوجود مذہب کے منفرد رویے اوراس کے جمود کی بنا پر۔ بخیال خود۔ ہر مذہب سے گھبراتے تھے۔

''کرنجیو'' ایک ہندی نامہ نگار نے ان کی آخری عمر میں ایک انٹرویولیا۔ جو فارسی میں چھپ چکا ہے۔غالباًیہ ان کے آخری نظریات تھے جو دنیا کے مجموعی حالات پر انہوں نے ظاہر کیے''کرنجیو'' گاندھی کے بارے میں ان سے باتیں کرتے ہوئے کہتا ہے:

چند روشن خیال وترقی پسندوں کا خیال ہے کہ گاندھی جی نے آپ کے نفسیاتی اور روحانی احساسات میں تبدیلی پیدا کی اور آپ کے فکری سوشلزم کو متاثر اور کمزور کردیا؟

نہرو نے کہا:

> روحانی اور باطنی رویوں سے فائدہ اٹھانا ضروری اوراچھا ہے میں اس بارے میں گاندھی کے عقیدے سے متفق تھا اوراب ان وسائل سے فائدہ اٹھانے کو زیادہ ضروری سمجھتا ہوں اس دور میں روحانی خلا کی وجہ سے نئے تمدن نے فروغ حاصل کرلیا ہے۔ہمیں کل کے مقابلے میں آج روحانیت سے جواب لینے کی ضرورت زیادہ ہے۔

کرنجیو، مارکسزم کے بارے میں سوالات کرتا ہے اورنہرو مارکسزم کی نارسائیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے دوبارہ اسی روحانی کی بات کرنے لگے۔کرنجیو نے

سوال کیا ہے:

مسٹر نہرو! اس وقت آپ کے تاثرات جن میں اخلاقی وروحانی طریقوں سے مسائل کا حل ممکن سمجھتے ہیں تو کیا جناب والا اور کل کے جواہر لال میں ۔نہرو کی جوانی ۔کوئی فرق نہیں پیدا ہوا؟ آپ کی باتوں سے اندازہ ہوا ہے کہ مسٹر نہرو عمر کے سورج ڈھلتے خدا کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہیں ۔

نہرو:

جی ہاں تبدیلی تو محسوس کرتا ہوں ۔مشکلات حل کرنے کے بارے میں جن اخلاقی وروحانی معیاروں کی بات کرر ہا ہوں وہ بے فکری ونادانستہ حالت میں نہیں ہیں..................

اب یہ سوال ہے کہ اخلاق وروحانیت کو بلند سطح پر لایا کیسے جائے ۔

اس کا جواب خود ہی دیا۔ سامنے کی بات ہے اس مقصد کیلئے مذہب موجود ہے۔ افسوس مذہب کوتاہ نظری اورخشک رسم ورواج اورجسم بے روح بن چکا ہے ۔کچھ تکلفات ہیں اور ظاہری شکل وصورت اوراوپری خول رہ گیا ہے ۔اس کی روح اور حقیقی مقصد ختم ہو چکا ہے ۔

اسلام اور وقت کے تقاضے

دنیا بھر کے مذاہب وادیان میں کسی مذہب نے انسان کی زندگی میں اتنا دخل نہیں دیا جس قدر اسلام کا عمل دخل ہے ۔اسلام نے اپنے پروگرام میں چند عبادتوں اور کچھ ذکر واذکار پھر اخلاقی نصیحتوں ہی کو نہیں رکھا ہے ۔وہ تو جسطرح اللہ اور بندے کے روابط پرروشنی ڈالتا ہے اسی طرح بندگان خدا کے تعلقات، انسانوں کے رشتے ان کے حقوق فرائض اور ایک فرد کے دوسرے فرد ایک

فرد کے معاشرے سے رنگارنگ تعلقات بھی دکھاتا اور بتایا ہے۔اسی وجہ سے ’’زمانہ‘‘ کے ساتھ اس کی ہم آہنگی کے مقامات زیادہ موجود ہیں۔

اتفاقاً، بیرونی دنیا کے بہت سے مفکروں اور مصنفوں نے معاشرتی وشہری قانون سازی کے زاویے سے اسلام کا مطالعہ کیا ہے ان لوگوں نے قوانین اسلام کو ترقی پسند مانا ہے ان کے خیال میں اسی بنیاد پر اسلام زندہ جاوید ہے اس کے قوانین میں اتنی صلاحیت ہے کہ زمانے کی ترقی کے ساتھ ان کا انطباق کیا جاسکے۔اسی لئے قابل توجہ اور لائق تعریف ہیں

’’برناڈ شاہ‘‘ انگلستان کا آزاد خیال مشہور مصنف نے کہا ہے:

’’میں ہمیشہ ’’دین محمدؐ ‘‘ کا احترام اس لئے کرتا ہوں کہ اس میں زندہ رہنے کی تعجب خیز خاصیت ہے۔میری نظر میں فقط اسلام ہی ایک ایسا راستہ ہے جو رنگارنگ حالات وتغیر پذیر زندگی میں ہم آہنگی اور اقتدار پیدا کرسکتا ہے اور اس کا یہ عمل صدیوں کیلئے ہے۔‘‘

میں پیشین گوئی کرتا ہوں۔اس کے آثار، اب بھی نمایاں ہورہے ہیں کہ ’’محمدؐ کے عقائد‘‘ آنے والے یورپ کے واسطے قابل قبول قرار پائیں گے۔

’’قرون وسطیٰ‘‘ کے علماء جہات یا تعصب کی بنا پر آئین محمدیؐ کے سیاہ خدوخال بناتے رہے انہوں نے عوم کو کینہ ودشمنی سے متاثر ہوکر آپ کو ضد مسیح بتایا۔میں اس شخصیت کے بارے میں۔فرد بلند از سطح عوام وخواس مطالعہ کیا میں اس نتیجے پر پہنچا کہ صرف یہی نہیں کہ وہ ضد مسیح نہ تھے بلکہ ان کی نجات وہندہ بشر کا لقب دینا چاہیے۔میرا عقیدہ ہے کہ اگر ان جیسا صاحب اختیار آج کی دنیا میں آجائے تو مشکلات ومسائل دنیا کا حل یوں کردے کہ دنیا صلح وسعادت انسانی کا گھورہ بن جائے۔

ڈاکٹر شبلی شمیل ، مادہ پرست ،لبنانی عرب نے پہلی مرتبہ ڈارون کے فلسفے کو بوخز جرمنی کی شرح کا ضمیمہ ملا کر عرب میں ترجمہ کیا اور مذہبی عقائد پر حملے کی صورت میں عربی زبان جاننے والوں کے سامنے پیش کیا۔

میٹر یالسٹ ہونے کے باوجود اسلام کی حیرت انگیزی اور خوبیوں کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا اس نے اسلام پیش کرنے والے (رسول) کی تعریف کی اور اسلام کو دوامی طور پر زندہ آئین اور زمانے کے مطابق قرار دیتے ہوئے ستائش کی۔

''فلسفہ النشو والارتقاء'' کی جلد دوم میں انہوں نے ایک مقالہ شائع کیا ہے ''القرآن والعمرآن''۔مقالے میں ایک سیاح کے خیالات کی تردید کی ہے۔وہ سیاح اسلامی ملکوں میں آیا تھا اور وہاں ایک زبوں حالی کا سبب اس نے اسلام بتایا تھا۔

شبلی شمیل نے اپنے مقالے میں مسلمانوں کے زوال کا سبب ان کے تعلیمات اسلامی سے انحراف کو قرار دیا ہے اور کوشش کر کے ثابت کیا ہے کہ اسلام کے معاشرتی اصول چھوڑنے کے نتیجے میں زوال رونما ہوا ہے اسلام سے نہیں۔اس نے کہا۔مغرب کے لوگ جو اسلام پر حملے کرتے ہیں وہ یا تو اسلام کو نہیں جانتے یا نیت اچھی نہیں ۔وہ مشرقی لوگوں کے دلوں سے ان قوانین سے دل چسپی ختم کرنا چاہتے ہیں جو خود ان کی زمین سے ابھرے ہیں وہ اپنی غلامی کا طوق ان کی گردن میں ڈالنا چاہتے ہیں۔

ہمارے زمانے میں یہ سوال عام ہے کہ آیا اسلام تقاضائے وقت کے مطابق ہے یا نہیں؟ مجھے مختلف طبقے کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے خصوصاً تعلیم یافتہ وتجربہ کار حضرات کے ساتھ ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا ہے میرے حلقے میں سب سے زیادہ یہی سوال گردش کرتا رہتا ہے۔

اعتراضات

کبھی اپنے اس اشکال کو فلسفیانہ رنگ دیتے ہیں اور کہا جاتا ہے دنیا کی ہر چیز بدلتی رہتی ہے انسانی معاشرہ بھی اسی طرح تغیر پذیر ہے لہٰذا بدلتے معاشرے کے قوانین ناقابل تغیر کیسے ہو سکتے ہیں؟

سوال کو اگر صرف فلسفی انداز سے دیکھیں تو جواب بہت صاف ہے۔ جو کچھ مسلسل حالت تغیر میں ہے نیا ہے پرانا ہوگا۔ نشوونما کے بعد زوال پذیر ہوگا۔ ترقی وارتقا میں رہے...... یہ سب کائنات کا مادی اور ترکیبات مادی کا حال ہے لیکن جہاں تک قوانین کائنات کا تعلق ہے وہ بہرحال ثابت وقائم ہیں زندہ مخلوق وموجودات اپنے مخصوص قانون کے مطابق ''تکامل'' پیدا کرتے ہیں۔ یہ قوانین دانش بیان کر چکے ہیں۔ خود زندہ موجود کے اندر ہمیشہ ٹوٹ پھوٹ اور ترقی جاری رہتی ہے مگر ان کے قوانین میں تغیر وارتقا نہیں ہے اور ہماری گفتگو قوانین ہی کے بارے میں ہے اب اس میں کوئی فرق نہیں قانون زیر بحث طبیعی ہو یا وضع ومعاہداتی سب کا حکم ایک ہوسکتا ہے ۔ کیونکہ وضعی قوانین ممکن ہے طبیعت وفطرت سے ماخوذ ہوں اور ان سے افراد یا انسانی معاشروں کا وہ راستہ بنتا ہو جس پر وہ اپنا ارتقائی سفر کرتے ہیں۔

رہے وہ سوالات جن میں اسلام اور تقاضائے وقت کے ہم آہنگ ہونے نہ ہونے کی بات کی جاتی ہے۔ ان میں فقط فلسفیانہ یا کلیاتی بات نہیں ہوتی۔

ایک سوال اچھا اور بہت قیمتی ہے اتفاق کی بات دین مبین اسلام کے معجزانہ پہلوؤں میں سے ایک پہلو ایسا ہے جس پر سمجھ دار اور دانشمند مسلمان فخر محسوس کرتا ہے ۔یعنی اسلام فرد یا معاشرے کے پائدار ضروریات کیلئے پائدار قانون رکھتا ہے اور ضروریات یا انسانی کی بدلتی صورتوں میں اس کے قوانین میں لوچ اور لچک

بھی ہے۔ہم اللہ کی مدد سے جہاں تک مناسب ہوا تفصیلی بات کریں گے۔

خود زمانہ کس سے منطبق ہوتا ہے؟

بحث شروع کرنے سے پہلے دو باتیں یاد دلاتے چلیں:

پہلی بات یہ ہے کہ ترقی پسند اور بدلتی دنیا کے تقاضوں کا دم بھرنے والے، معاشرے کی ہر تبدیلی کو ترقی سمجھ لیتے ہیں۔خصوصاً اگر وہ تبدیلی یورپ سے آئی ہو وہ اسے ارتقائی عمل ضرور مانتے ہیں۔آج کے عوام میں سب سے زیادہ گمراہی کن یہی فکری رجحان دامنگیر ہے۔

اس گروہ کے خیال میں چونکہ زندگی کا ساز وسامان روازنہ بدل رہا ہے ناقص کی جگہ کامل آرہا ہے علم اور ٹیکنک میں ترقی ہے لہٰذا انسانی زندگی میں جو تبدیلیاں بھی پیدا ہورہی ہیں وہ ایک قسم کی ترقی وبیش رفت ہیں اوران کا خیر مقدم کرنا چاہیے بلکہ وقت کا جبر ہے وہ اپنا راستہ خود صاف کرلے گا۔

حالانکہ نہ تو ہر تبدیلی براہ راست علم وصنعت کا نتیجہ ہے اور نہ ضرورت وجبر کا عمل دخل ہے عین اس حالت میں کہ علم ترقی کرر ہا ہے ہوس پیشہ طبیعت، درندہ مزاج بشریت بھی خالی نہیں بیٹھی ہے۔علم وعقل انسان کو کمال کی طرف بڑھاتی ہے اور طبیعت کی ہوس نا کی وبشری درندہ مزاجی خود آگے بڑھ کر ''انسان'' کو فساد وانحراف کی راہ پر کھینچتی ہے۔طبیعت کی ہوسناک ودرندمزاجی کوشش کرتی رہتی ہے کہ علم کو اپنے لئے حربہ بنائے اور اپنی شہوانی وحیوانی ہوس کیلئے استعمال کرے جس طرح زمانے کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے اسی طرح اس سے مقابلہ بھی کرنا ضروری ہے۔دنیا کے اصلاح پسند اور رجعت پرست دنیا کی ترقی کے خلاف نبرو آزمار ہا کیے ہیں۔

اگر زمانے کی تبدیلیوں اور تغیرات کو تمام اچھائیوں اور برائیوں کا پیمان مان

لیں تو خود زمانے اوراس کی تبدیلیوں کو علم حاصل کرنے کے واسطے کون سا ذریعہ استعمال ہوگا۔ اگر ہر چیز کا انطباق اور ہر بات کی تطبیق زمانے سے کرنا ہے تو خود زمانے کی تطبیق کس سے کریں؟ اگر انسان دست بستہ ہوکر زمانے اور تبدیلیوں کا تابع ہوجائے تو خود انسانیت کی خلافیت، فعالیت اور اس کے ارادے کے صناعی کہاں جائے گی؟

انسان وقوت کی سواری پر بیٹھا ہے اور سفر کر رہا ہے اسے لمحہ بھر کیلئے بھی اس کی راہنمائی سے غفلت نہ برتنا چاہیے۔ جو حضرات فقط زمانے کی تبدیلیوں کے گیت گاتے رہتے ہیں اور اس کی رہبری سے غافل ہیں وہ انسان کے تعمیری عمل کو بھلا رہے ہیں۔ وہ اس گھوڑے سوار کے مانند ہیں جو گھوڑے کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کے بجائے اپنے تئیں اس کے حوالے کردے۔

انطباق یا نسخ؟

دوسری بات۔ اسلام اور تقاضائے وقت کا حل بعض حضرات نے ایک فارمولے کے ذریعے نکالا اور فارمولا بہت سادہ اور آسان ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ اسلام جاودانی دین ہے ہر زمانے کے مطابق ڈھل سکتا ہے ہم پوچھتے ہیں کیسے؟ اس کے انطباق کا فارمولا کیا ہے؟ جواب دیتے ہیں: جب دیکھیں کہ زمانہ بدل گیا فوراً اس کے قوانین منسوخ کر دیں اس کی جگہ دوسرے قوانین لے آئیں!

چالیس نکات کے مصنف نے مشکل کا یہی حل پیش کیا ہے وہ فرماتے ہیں دنیا کے بارے میں ادیان کے قوانین کو نرم اور مڑے جھکنے کے قابل ہونے چاہیے۔ تقاضائے وقت پر منطبق ہوسکیں یہ بات اسلام کے تعلیمات کے برخلاف نہیں بلکہ اس کی روح کے بالکل مطابق ہے (رسال زن روز شمارہ نوے، صفحہ ۷۵)

مقالہ نگار موصوف مذکورہ بالا جملے کے آگے پیچھے فرماتے ہیں۔ چونکہ زمانے

کے تقاضے بدل رہے ہیں اور ہر وقت نئے قانون کی ضرورت ہے۔ اسلام کے مدنی ومعاشرتی قوانین جاہلیت کے عرب رسم ورواج کے مطابق اوران کی سادہ زندگی سے ہم آہنگ تھے لہٰذا اس وقت ٹھیک تھے۔آج کے زمانے سے وہ ہم آہنگ نہیں ہیں۔ لہٰذا آج کیلئے آج قانون بنا ضروری ہے۔

اس قسم کے حضرات سے پوچھا جائے اگر زمانے سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ قوانین منسوخ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو پھر کون سا قانون ہے جس میں یہ لوچ نہیں ہے؟ کون سا قانون ہے جو اس معنی میں زمانے سے ہم آہنگ نہیں ہے؟

اسلام کی زمانے سے ہم آہنگ ہونے کی بیاں کردہ لچک اور ہم آہنگی کی مثال تو وہی ہے کہ ایک شخص کہے: کتاب وکتاب خانہ عمر سے مزے لوٹنے کا بہترین ذریعہ ہے۔اس سے پوچھیے اس کا مطلب؟ وہ جواب دے۔یعنی جب آدمی الطف ولذت کا خیال کرے فوراً اسے بیچ کر اس کی قیمت عیش ونوش میں خرچ کردے۔

مضمون نگار موصوف فرماتے ہیں: اسلامی تعلیمات کی تین قسمیں: پہلی قسم اصول عقائد، جیسے توحید ونبوت وقیامت وغیرہ۔قسم دوم،عبادات۔جیسے مقدمات و متعلقات نماز وروزہ ووضووطہارت وحج وغیرہ۔تیسری قسم،وہ قوانین جوعوامی زندگی سے متعلق ہیں۔

پہلی دوسری قسم تو دین کا جز ہیں انسان کوذاتی طور ہمیشہ ان کا خیال رکھنا چاہیے رہی تیسری قسم تو وہ دین کا جز نہیں۔کیونکہ دین کوعوامی زندگی سے سروکار نہیں ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان چیزوں کوجزء دین کے طور پر نہیں لائے تھے۔ان کا تعلق فریضہ رسالت سے نہ تھا۔اتفاق کی بات ہے آپؐ حکمراں بھی تھے لہٰذا یہ کام بھی کرتے رہے۔ورنہ دین کی شان تو فقط اسی میں ہے کہ آدمی کونماز روزے کیلئے

تیار کرے دین کا انسانوں کی دنیاوی زندگی سے کیا تعلق؟

میں یقین نہیں کرسکتا کہ جو شخص ایک اسلامی ملک میں زندگی بسر کرتا ہو وہ اسلام کی منطق سے اتنا بھی ناواقف ہوسکتا ہے۔

کیا قرآن مجید نے انبیاومرسلین کا نصب العین نہیں بتایا ہے؟ کیا قرآن مجید نے پوری وضاحت سے یہ نہیں کیا؟

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ

ہم نے اپنے تمام رسولوں کو روشن دلائل اور کتاب اور ترازو کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ عوام میں انصاف قائم کریں۔ (سورہ حدید-25)

قرآن نے اجتماعی عدالت کے قیام کو پیغمبروں کا اصل نصب العین بتایا ہے ۔اگر آپ قرآن پر عمل نہیں کرنا چاہتے تو آگے بڑھ کر اس سے بڑا جرم کیوں کرتے ہیں اسلام اور قرآن پر تہمت لگاتے ہیں؟ آج انسان کے سر پر جو مصیبتیں آرہی ہیں اس کا سبب یہی ہے کہ دین؟ جو سب کا پشتیبان اور سہارا ہے اسے ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ وہی تو منفرد اخلاق وقانون کا سرچشمہ ہے۔

اسلام بہت اچھا ہے بشرطیکہ مسجدوں اور عبادت گاہوں میں رہے معاشرے سے سروکار نہ رکھے۔ ہم یہ ترانہ آدھی صدی سے سن رہے ہیں۔ یہ نغمہ اسلامی سرحدوں کے پار اٹھا تھا وہاں سے اسلامی دنیا میں آیا اور اس کا خوب پروپیگنڈا ہوا۔ چھوڑیئے ہم اس کا عام فہم زباں میں مطلب بتائیں اور سادہ لفظوں میں لکھیں۔ اس طرح ان دعوے داروں کی بات زیادہ وضاحت سے بیاں ہوسکے گی۔

خلاصہ مدعا یہ ہے ''اسلام جہاں تک کمیونزم کے مقابلے کیلئے اسے آگے رکھو

اسے باقی رہنا چاہیے ۔مگر جہاں مغربی منافع سے ٹکرائے اسے راستے سے ہٹ جانا چاہے یورپ کے نزدیک اسلام کے عبادتی طورطریقے باقی رہیں کوئی حرج نہیں ۔کمیونزم کے خلاف اسے ایک الحادی تحریک اور دشمن خدا فلسفہ کہہ کراستعمال کر سکتے ہیں۔لیکن اسلام کے سماجی ضابطے جومسلمانوں کی زندگی کا فلسفہ ہیں۔مسلمان جب تک اسے مانتے رہیں گے اس وقت تک وہ یورپ کے مقابلے میں آزادی اورانفرادیت کا احساس بیدار رکھیں گے۔یہ بات مغرب کیلئے ان کے ہضم کرنے میں رکاوٹ بنے گی۔اسے درمیاں سے ہٹانا ضروری ہے۔[1]

افسوس ہے کہ یہ نکتہ ایجاد کرنے والے یہ تھیوری پیش کرنے والے غلط فہمی کے شکار ہوتے ہیں۔

پہلے تو یہ ہے:

نُؤۡمِنُ بِبَعۡضٍ وَّنَكۡفُرُ بِبَعۡضٍ ۙ

ہم کچھ مانتے ہیں کچھ نہیں مانتے (سورہ نساء۔150)

ایسا ''اصول'' ہے جسے قرآن مجید نے پندرہ سوبرس پہلے ہی مسترد کردیا ہے۔

دوسرے یہ ہے کہ

میرے خیال میں وقت آچکا ہے کہ مسلمان اب ان شعبدہ بازیوں کا شکار نہ ہوں عوام کی انتقادی قوت کم وبیش بیدار ہوچکی ہے۔وہ امتیاز کرنے لگے ہیں کہ انسانی علم وفکر کی طاقت کہاں کہاں شگوفہ بہار کا سبب ہے اور کہاں کہاں فساد وانحراف

---

[1] شہید کی نہایت خوبصورت ومعنی خیز عبارت ہے ''متاسفانہ ،ایداع کنندگان این تزکور خواندہ'' ۔''تز''فرانسیسی میں''THESE'' ہےانگریزی میں اسے-THESIS'' ''DISSERATIO کہتے ہیں۔

کا باعث ہے۔ چاہے وہ یورپ سے متعلق کیوں نہ ہو۔

اسلامی دنیا کے عوام پہلے سے زیادہ اسلامی تعلیمات کی قوت و قیمت کو سمجھ چکے ہیں وہ نصب العین بنا چکے ہیں کہ زندگی کا مستقل فلسفہ اسلام اور اسلامی ضوابط ہیں وہ کسی قیمت پر یہ حقیقت ضائع کرنے پر تیار نہیں ہوں گے۔

مسلمان سمجھ چکے ہیں کہ اسلامی قوانین کے خلاف پروپیگنڈا استعمار اور سامراج کی ایک چال ہے۔

تیسرے یہ ہے:

یہ تھیوری دریافت کرنے والے سمجھ لیں کہ اسلام میں اگر الحاد کے مقابلے کی قوت ہے تو اس میں غیر الحادی نظام سے بھی ٹکر لینے کی صلاحیت ہے یہ اس وقت ہے جب وہ ایک فلسفے کے طور پر معاشرے میں بالادستی وحاکمیت پیدا کرے مساجد اور عبادت خانوں میں محدود نہ رہے جو اسلام عبادت گاہوں میں بٹھا تا ہے وہ افکار اہل یورپ کیلئے میدان خالی چھوڑ دیتا ہے بلکہ وہ مغربی افکار کی مخالفت کا محاذ بھی چھوڑ دیتا ہے۔

اسلامی ممالک پر یورپ نے جو غضب ڈھایا ہے وہ اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔

اسلام اور بدلتی زندگی (۲)

انسان، معاشرہ اور عقل

انسان فقط ایسا جاندار نہیں اجتماعی زندگی کا عادی ہے بہت سے حیوانات ،خصوصاً حشرات ،اجتماعی زندگی بسر کرتے ہیں ان کا ایک حکیمانہ نظام دستور ہے جس کے پابند ہیں۔ اصول تعاون تقسیم کار تولید و تقسیم حکمرانی فرماں برداری ان کی زندگی میں حکم واطاعت کا عمل موجود ہے۔

شہد کی مکھی، چیونٹی کی بعض قسمیں اور دیمک بک جا زندگی تمدن (ان کا خاص تمدن) نظام اور انتظامات سے فیضیاب ہیں۔ برس ہا برس بلکہ صدیاں گزر جائیں تب جا کر انسان اشرف مخلوقات ان تک پہنچے۔

ان کا تمدن انسانی تمدن کے برخلاف عہد بہ عہد تقسیم نہیں ہوتا پہلے جنگل پھر پتھر اس کے بعد لوہے کا دور اور اب ایٹم کے زمانے تک نہیں پہنچا۔انہوں نے اس دنیا میں قدم رکھتے ہیں یہ تمدن یہ انتظامات اور یہی دنیا بنی بنائی دیکھی آج بھی وہی اسلوب ہے اور کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ یہ انسان ہے' اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے (قرآن) اس کی زندگی زیرو سے شروع ہو کر لا انتہا کی طرف جا رہی ہے۔

جانوروں کیلئے وقت کے تقاضے یکساں ہیں دنیا کے تقاضے ان کی زندگی کو دگرگوں نہیں کرتے۔ جدت پسندی اور نو پرستی ان کیلئے بے معنی ہے۔ان کے یہاں نئی پرانی دنیا کا فرق نہیں ہے علم ان کیلئے روزانہ نئے انکشافات نہیں کرتا ہلکی بھاری صنعتیں جدید سے جدید تر کامل سے کامل تر ان کے بازاروں کو انقلاب نہیں لاتیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ جبلی (غریزہ کی) زندگی گزارتے ہیں عقل سے دور ہیں۔

انسان کی زندگی اجتماعی اور ہمیشہ تغیر پذیر بلکہ تبدیلیوں کی زد پر ہے ہر صدی میں اس کیلئے دنیا بدل جاتی ہے۔ اس کے اشرف مخلوق ہونے کی بنیاد بھی یہی ہے انسان طبیعت کا فرزند بالغ ورشید ہے۔ وہ ایسی منزل پر فائز ہے جہاں اسے براہ راست طبیعت کی نگہداشت وسر پرستی کی ضرورت نہیں۔ غریزہ (سرشت) نامی چیز اپنی مرموز (اندرونی واشاراتی) ہدایت کرے۔ انسان اس سے آزاد ہے وہ غریزہ کے بجائے عقل کی زندگی گزارتا ہے۔

طبیعت نے انسان کو بالغ سمجھ کر آزاد کر دیا ہے اپنی سر پرستی سے دست کش ہوگئی ہے۔ حیوان جو کچھ اپنے غریزے اور قانون طبیعت کے ماتحت بے چون وچرا کرتا ہے انسان وہی کام اپنے علم اور وضع شدہ وتشریع سے کرتا ہے جس سے سرتابی بھی ممکن ہے۔

تباہی و بربادی انحرافات اور روگردانی جو کچھ بھی وہ ترقی وکسب کمال کی راہ میں دکھاتا ہے ٹھہراو اور پستیاں، گراوٹ اور ہلاکت اسی مقام سے پیدا ہوتی ہے۔

انسان کیلئے جس طرح ترقی کی راہیں کھلی ہوئی ہیں اسی طرح فساد وانحرافات اور گراوٹ کی راہیں بھی بند نہیں ہیں۔

انسان اس منزل میں ہے جہاں بہ تغیر قرآن کریم ــ جس امانت کا بوجھ آسمان وزمین اور پہاڑ نہ اٹھا سکے اسے اپنے کاندھوں پر لے کھڑا ہوا۔ یعنی آزاد زندگی قبول کر لی۔ پابندیوں ذمے داریوں اور قانون کے بندھن بھی منظور کر لیے۔ اسی بنیاد پر ظلم و جہالت وخود پرستی میں مبتلا ہوتا اور غلط کاری سے نہیں بچتا۔

قرآن کریم جہاں انساں کی عجیب وغریب صلاحیت اور امانت وذمہ داری کے بارے میں بات کرتا ہے وہیں بلاتوقف اسے ''ظلوم'' و''جہول'' کی صفتوں سے بھی یاد کرتا ہے۔

ترقی پذیری اورانحراف کی دوصلاحیتیں انسان میں ناقابل جدائی ہیں انسان جانور کی طرح نہیں کہ اجتماعی زندگی میں نہ آگے بڑھ سکے نہ پیچھے ہٹ سکے نہ دائیں لڑ سکے نہ بائیں انسان کی زندگی میں کبھی پیش قدمی ہے کبھی پسپائی سرعت وتیز روی ہے توقف اورگراوٹ عدالت ونیکی ظلم وتجاوزانسانی زندگی کے پرتو ہیں ایک منزل میں عقل وعلم کا مظہر ہے ایک مرحلے میں جہالت وہوس پرستی ہے۔

زمانے میں جوتغیرات اورتبدیلیاں ہوتی ہیں ممکن ہے دوسری قسم ہی کی ہوتی ہوں۔

منجمداورجاہل لوگ

بشری خاصیتوں میں افراط بھی ہے تفریط بھی انسان اگرحداعتدال میں رہے پہلی قسم کی تبدیلیوں کو دوسری قسم کی تبدیلیوں سے الگ کرے زمانے کوعلم وایجاد کی طاقت سے کوشش وعمل کے ذریعے آگے لے جائے ترقی وپیش رفت کے مظاہر سے اپنے تئیں ہم آہنگ بنانے کی سعی کرے زمانے کے انحرافات کا راستہ روکے اورہم رنگ زمانے ہونے سے دوررہے توانسان کیلئے ممکن ہے۔

افسوس یہ ہے کہ صورت حال یہ نہیں ہے آدمی کواس موقع پردوخطرناک بیماریاں للکارتی رہتی ہیں۔جموع اور جہالت کے مرض پہلی بیماری کا نتیجہ ٹھہراؤ سکون اورتوقف ہے آدمی وسعتوں اورترقیوں سے دوررہ جاتا ہے اوردوسرے مرض کی وجہ سے سقوط وانحراف سے دوچار ہوتا ہے۔

جامد ہرچیز سے نفرت کرتا ہے اور پرائے پن کے علاوہ کسی کو پسندنہیں کرتا جاہل ہرنئی چیزکوتقاضائے وقت کا نام دیتااورجدت پسندی وترقی پسندی سمجھنے لگتا ہے۔جامد ہرنئی اورتازہ چیزکوفسادوانحراف کہتا ہے اور جاہل ہر بت کوتمدن اورتوسیع

علم و دانش کی مد میں شمار کرتا ہے۔

جامد آدمی ،مغز اور چھلکے وسیلے اور نصب العین میں فرق نہیں کرتا، اس کی نظر میں دین آثار قدیمہ کی حفاظت کی ذمہ داری سونپتا ہے اس کی رائے میں نازل شدہ قرآن زمانے کی رفتار روکنے اور وضع کائنات کو اپنی حالت پر ساکن رکھنے کا فریضہ سپرد کرتا ہے۔

جامد شخص کے عقیدے میں پارہ عم تیساء لون پڑھنا کلک سے لکھنا موصوف والی دوات کا استعمال پرانے حمام میں نہانا ہاتھ سے کھانا کھانا مٹی کے تیل کی لالٹین جلانا جاہل و بے سواد جتنا دینی آداب کی زندگی ہے اس کی نگہداشت کرنا چاہیے جاہل اس کے برخلاف دونوں آنکھیں بند کیے دیکھتا رہتا ہے کہ یورپ میں کیا نیا شگوفہ کھلا کیا نیا فیشن نکلا جس کی تقلید کرے اور جدت پسندی اور وقت کا جبر کہہ کر اسی راہ پر چل کھڑا ہو۔

جامد و جاہل دونوں اس بات پر ہم خیال ہیں کہ جو وضع قطع پرانے زمانے کی تھی وہی دینی مسائل اور مذہبی شعائر ہیں۔ دونوں میں اختلاف یہ ہے کہ ایک رسم ورواج کی نگہداشت پر زور دیتا ہے اور جاہل کے خیال میں مذہب قدامت پرستی ہے اور اس کا تعلق سکون و قرار سے ہے۔

آخر صدیوں میں یورپ علم اور دین کے تضاد سے دوچار تھا۔ ہر جگہ یہی بحث و گفتگو تھی۔ دین و علم میں تضاد کی بنیادیں دو ہیں ایک بات یہ ہے کہ چرچ نے کچھ قدیم علمی و فلسفی مسائل کو دینی عقائد اور دینی پہلو مان لیا تھا۔لیکن علوم نے ان مسلمات کے خلاف کچھ ترقیاتی حقائق ثابت کر دیے تھے۔ادھر علوم نے زندگی کی وضع بدل دی زندگی کی شکل وصورت کچھ سے کچھ کر دی۔

جامد خشک نام نہاد دیندار حضرات ایک طرف تو چند فلسفی مسائل کو بلاوجہ

مذہبی رنگ دیدیتے ہیں۔ دوسری طرف مادی زندگی کے ظاہری ڈھانچے کو بھی قلمرو مذہب کا حصہ بنانا چاہتے ہیں ادھر جاہل و بے خبر عوام بھی سوچتے ہیں کہ واقعاً مادی زندگی میں بھی آدمی کو خاص وضع قطع میں ہونا چاہیے۔ اور چونکہ علم کا فتویٰ یہ ہے کہ مادی صورت کو بدلنا چاہیے لہٰذا دین کا منسوخ ہونا ہی بہتر ہے اور یہ فتویٰ صدر کر دیا جاتا ہے۔

پہلے گروہ کے جمود اور دوسرے گروہ کی بے خبری نے علم و دین کے تضاد کو جنم دیا۔ اور بس۔

قرآنی تمثیل

اسلام ترقی یافتہ اور ترقی دینے والا دین ہے قرآن کریم مسلمانوں کو ترقی اور پیش روی کی طرف بڑھنے کی دعوت دیتا ہے اس بنا پر وہ ایک مثل میں کہتا ہے:

پیروان محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مثال دانے کی زمین میں بویا اس کی نازک سی کونپل پھوٹی پھر اس نے کچھ قوت حاصل کی، اس کے بعد وہ اپنے تنے پر ٹھہری اس کی یہ رفتار اتنی تیز تھی کہ کسان بھی حیرت میں پڑ گئے۔

یہ مثل قرآنی نصب العین کے مطابق ایک مثالی معاشرے کیلئے ہے۔ قرآن ایسے معاشرے کے بیج بولانا چاہتا ہے جو ہمیشہ نشو و نما پاتا، پھلتا، پھولتا اور پھلتا رہے۔

ویل ڈیورانٹ کہتا ہے:

اسلام کی طرح کسی دین نے اپنے ماننے والوں کو قوت کی تعلیم نہیں دی ہے۔ اسلام کے پہلے دور کی تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام نے معاشرے کی تجدید و تعمیر میں

کتنا کام کیا اور ترقی میں کس قدر طاقت کا مظاہرہ کیا ہے۔

اسلام جمود کے خلاف ہے وہ جہالت کا بھی دشمن ہے اسلام کو جو خطرہ ہے وہ اس رخ سے بھی ہے اور اس سمت سے بھی۔جمود اور خشک مزاجیاں نیز ہر پرانے نعرے کو محبوب قرار دینا۔ حالانکہ دین مقدس اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔جاہل لوگوں کو ایک بہانہ فراہم کرتا ہے کہ وہ اسلام کو جدیدیت کا حقیقی مخالف سمجھنے لگیں دوسری طرف تقلید اور فیشن پرستی و مغرب زدگی کے زیر سایہ یہ عقیدہ کہ مشرقی ممالک کی خوش نصیبی اسی میں ہے کہ وہ جسمانی وروحانی ظاہری و باطنی طور پر فرنگی بن جائیں اہل مغرب کے تمام رسم ورواج قبول کرلیں۔ اپنے مدنی ومعاشرتی قوانین کو آنکھیں بند کرکے یورپ کے قوانین سے ہم آہنگ بنالیں۔ یہ خیال جامد افراد کیلئے بہانہ بن گیا کہ وہ لوگ ہرنئ وضع کو بدبینی کی نظر سے دیکھیں اور اسے دین آزادی اور قوام کی اجتماعی شخصیت وانفرادیت کیلئے خطرہ سمجھیں۔

ان دونوں رویوں کا نقصان اٹھانے والا اسلام ہے خشک لوگوں کا جمود جاہلوں کو میدان جنگ مہیا کرتا ہے اور جاہلوں کی جہالت خشک لوگوں کو ان کے عقائد ونظریات زیادہ متعصب اور خشک بنارہی ہے۔

یہ متمدن نما جاہل سمجھتے ہیں زمانہ ''معصوم'' ہے جیسے زمانے کی تبدیلیاں انسان کے علاوہ کسی اور ہاتھوں رونما ہوتی ہیں؟ کب سے اور کس تاریخ سے انسان سے غلطی سے دوری۔عصمت۔حاصل کی ہے جو زمانے کے انقلاب خطا اور غلط فہمیوں سے ماورا۔معصوم۔مان لئے جائیں؟

آدم زاد جس طرح علمی رجحانات اخلاقی اور مذہبی رکھتا ہے اور بشریت کی صلاح وفلاح کیلئے ایجادیں کرتا ہے اسی طرح وہ خود پرستی ،جاہ طلب ہوس رانی ،دولتمندی اور استعماری خواہشات کے زیر اثر بھی رہتا ہے۔بشر آخر بشر ہے نئے نئے

انکشافات کرتا ہے۔ بہتر سے بہتر وسائل دریافت کرتا ہے اس سلسلے میں اتفاقاً غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔خودفراموش آدمی ان باتوں کوسمجھ نہیں پاتا۔اس کا تکیہ کلام ہے۔آج کی دنیاایسی ہے آج کی دنیاویسی ہے۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز بات ہے کہ یہ لوگ زندگی کے اصول جوتے ،ٹوپی اوراپنے لباس کے معیار پرجانچتے ہیں۔جیسے جوتا،ٹوپی نئی پرانی ہوتی ہے اسی طرح ان کے نزدیک جوزمانے نیانیا کارخانے سے بننے کے بعد ابھی ابھی ان کے سامنے آیاہے اس کی توقیمت ہے اسے توخریدنااور پہننا چاہیے اور جیسے ہی وہ پرانا ہوا سے دور پھینک دیناچاہیے۔کائنات کے حقائق بھی ایسی ہیں ہیں ان جاہلوں کی نظرمیں اچھے اور برے کامفہوم۔نئے اور پرانے سے جدانہیں۔ان کے خیال میں ''فیوڈلرزم''۔یعنی ایک طاقت ورزبردستی اپنانام''مالک'' رکھ لے اوراپنی جگہ بیٹھا سینکڑوں ہاتھوں اور بازووں سے کام لے مقصدصرف منہ چلاناہو۔بہت براہے کیوں ؟ اس کی دلیل اس کاپراناپن ہے۔آج کی دنیا اس نظام کوپسندنہیں کرتی۔اس کادورگزرچکا، یہ فیشن پراناہوگیا۔لیکن جس دن یہ طریقہ ایجادہواتھااورنیانیا قالب سے اتراتھادنیاکی بازارمیں رکھاگیاتھااس دن اچھاتھا۔

ان لوگوں کی نظرمیں عورت کاستثمار براہے۔کیونکہ آج کی دنیااسے ناپسندکرتی اوراس کے سایےتل نہیں چلتی۔اس کے مقابلے میں کل تک عورت کوترکہ نہیں ملتاتھااس کی ملکیت تسلیم نہ تھی۔اس کاعقیدہ وارادہ باعزت نہ تھا،اس وقت یہ سب خوب تھاکیونکہ نیاتھااورنیانیابازارمیں آیاتھا۔

ان حضرات کی رائے میں چونکہ یہ زمانہ فضاکازمانہ ہےاوراب ہوائی جہاز چھوڑکرخچرپرسواری ممکن نہیں بجلی کوچھوڑکرلالٹین نہیں جلائی جاسکتی۔تاگے بنانے والے بڑے بڑے خارخانوں کوبندکرکے چرخے سے کام نہیں چلایا جاسکتا۔

دیو پیکر چھاپے کی مشینیں نظر انداز کر کے قلمی کتابیں نہیں شائع ہوسکتیں۔ یونہی محفل رقص ہم عریان پارٹی ہو یا ''بوفے'' آخران میں شرکت کیوں کر چھوڑ دی جائے شراب نوشی وبدمستی جو، نیم عریان لباس، یعنی اس صدی کے نئے طور طریقوں کو چھوڑنا گدھے کی سواری کا دور واپس لانے کے برابر ہے۔

''نئی روشنی'' کسی اصطلاح نے کسی قدر شخص اور کتنی خاندانی زندگیوں کو تباہ کیا ہے۔

کہتے ہیں علم کا دور ہے ۔ایٹم کا عہد ہے مصنوعی سیاروں ،فضائی راکٹوں کا زمانے ہے جی بہت اچھا ہم بھی خدا کا شکر ادا کرتے ہیں ہم اس عہد و زمانے اس دوراورصدی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہماری تمنا ہے، ہم اس دور کے علوم اور مصنوعات سے زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر فیض یاب ہوں ۔لیکن ایک بات تو بتایے کیا اس دور میں سرچشمہ علم کے علاوہ سب چشموں اور دریاؤں کے دھانے خشک ہو گئے ہیں؟ اس صدی کی تمام ایجادیں اور روشنیاں علمی ترقی کا نتیجہ ہیں کیا کبھی علم نے دعویٰ کیا ہے کہ دنیا کے وجود اور اس کی طبیعت کو سوتی صدرام ومطیع اور ہر چیز کوانسانی بنا رہا ہے؟

علم کے بارے میں دنیا کے ایک آدمی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا ادھر سائنسی اداروں نے انتہائی خلوص نیت اور پاک ارادے سے تحقیق وانکشاف کے ماہرین نے محبت وتن دہی سے نئی دریافت کی اور جاہ طلب ہوس پیشہ سرمایہ دار دولت کے پجاری علمی محنتوں کو اپنے نجس مقاصد کیلئے استعمال کرنے لگے ہیں علم فریادی ہے کہ اس کا استعمال انسان کی سرکش طبیعت ہمیشہ غلط کرتی ہے یہی ہماری صدی کی مشکل اور بدقسمتی ہے۔

علم فزکس میں ترقی کرتا ہے روشنی کے کلیات دریافت ہوتے ہیں ایک منافع پرست گروہ آگے بڑھتا اور خانہ برانداز وتباکن فلمیں بنانے کا کام اسی تحقیق کے

سہارے شروع کر دیتا ہے کیمسٹری کا علم ترقی کرتا ہے مفردات کے خواص اور مرکبات کے نتائج دریافت کرتا ہے۔ کچھ لوگ اسے اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرنا چاہتے ہیں وہ بلائے جان بشر ''ہیروئن'' ایجاد کرتے ہیں، علم ایٹم کے اندر جھانک کر اس کی حیرت انگیز اور طاقت دیکھتا اور اس کی مہار دیتا ہے اور معمولی سا انسانی فائدہ اٹھانے سے پہلے اقتدار کے بھوکے ایٹم بم بنا کر بے گناہوں کو تباہ کرتے ہیں۔

بیسویں صدی کے ہیرو ''آئن اسٹائن'' کے اعزاز میں جشن ہو رہا تھا وہ اٹھا اور تقریر کے دوران کہنے لگا:

آپ اس شخص کیلئے جشن منا رہے ہیں جس کا علم ایٹم بم بنانے کا سبب ہوا ہے۔

آئن اسٹائن نے علمی صلاحیتیں اس لئے نہیں استعمال کی تھی کہ یہ بم بنایا جائے مگر ہوس پیشہ لوگوں نے اس کے علم سے یہی فائدہ اٹھایا۔

ہروئین، ایٹم بم ایسی ویسی فلمیں فقط اس بنا پر معقول نہیں قرار دی جاسکتی ہیں کہ وہ ''صدی کی نئے ایجاد'' ہیں۔ اعلیٰ درجے کے بم آخری ترقی یافتہ بمبار ہوائی جہاز کے ذریعہ بے گناہ آدمیوں کے سر پر برسانے سے عمل کی۔ وحشیانہ حیثیت میں ذرہ بھر کمی پیدا نہیں ہوتی۔

اسلام اور بدلتی زندگی (۳)

عائلی اورگھریلوزندگی میں مغربی رویوں کوقبول کرنے کے سلسلہ میں جوحضرات حمات کادم بھرتے ہیں ان کے پاس سب سے اچھی دلیل یہ ہے کہ ۔دنیابدل گئی ہے بیسویں صدی کے تقاضےاسی سسٹم کاپابندکررہے ہیں۔اگراس رخ پرہم روشنی نہ ڈالیں توہماری دوسری بحثیں ناقص رہ جائیں گی۔

اچھی خاصی اورتفصیلی بحث وتحقیق کیلئے مقالات کافی نہیں ہیں کیونکہ مقالات میں متعددموضوعات ومسائل زیربحث آناضروری ہیں فلسفی فقہی،اخلاقی اورمعاشرتی مسائل۔اسلام اورتقاضائے وقت کےعنوان سے جوکتاب لکھنے کی نیت ہےجس کےنوٹ تیارہیں۔توان شاءاللہ بقیہ بحث وہاں کی جائے گی۔

سردست دونکتوں کی وضاحت کافی ہے۔

نمبر1

زمانے کی تبدیلیوں سے ہم آہنگی اتنی آسان نہیں ہےجتنی یہ مدعیان بےخبر سمجھتےسمجھاتے ہیں۔

قوانین اسلام کے جوڑااورموڑاوران کےرازواسرار

نمبر2:دوسراضروری نکتہ جسے روشن وعیاں ہوناچاہیے وہ اسلامی مفکروں کایہ عقیدہ کہ اسلام میں ایسے رازموجودہیں کواپنے دورکےترقیات سے ہم آہنگ ہونے میں مددکرتے ہیں ان کاعقید ہے اسلام زمانے کی ترقیوں اورثقافتوں کی پیش رفت دنیا کے پھیلاؤ اورزندگی کی جدیدیت کاساتھ دیتاہے۔دیکھنایہ ہے کہ اس

کا راز ورمز کیا ہے؟ دوسری نفظوں میں اس مشینری کے اسپرنگ ، بیرنگ ، بریکٹ اورنٹ یوں لگے ہیں کہ جن سے حرکت میں فرق نہیں پڑتا۔ یعنی کسی قانون کے نظر انداز کرنے کے بجائے وقت کی تبدیلیوں اور تعلیم وثقافت میں توسیع میں کسی قسم کا تضاد وتصادم نہیں ہوتا اس عقیدے کے توضیحات اس مقالے کا موضوع ہیں۔

بعض قاری اوران سے زیادہ میں خود سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ فنی اور ماہرانہ ماحول چاہتا ہے۔اور ماہرین ہی کے سامنے اس پر گفتگو ہونا چاہیے مگر سوال کرنے والوں اور مسئلے سے دل چسپی رکھنے والوں کی اکثریت سے دوچار ہوں۔ان میں غلط اندیش لوگوں کی تعداد زیادہ ہیں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اسلام کی اس خصوصیت کو باور نہیں کرتے۔ میں جس حد تک غلط فہمیوں کو دور کرسکتا ہوں اس حد تک کوشش کروں گا اور دوسروں کو نمونہ دیدوں گا۔

محترم ناظرین! خیال رکھیں کہ اس قسم کی بحثوں سے ہماری دور اندیش علماء بے خبر نہیں تھے چنانچہ مرحوم آیت اللہ میرزا حسین [۱] نائینی کی ''تنبیہ الامت'' اور استاد علامہ محمد حسین طباطبائی [۲] کا مقالہ ''ولایت وزعامت'' کتاب ''مرجعیت وروحانیت'' میں قابل ملاحظہ ہے۔ یہ کتابیں فارسی ہی میں ہیں اور چھپ چکی ہیں۔

دین مقدس اسلام اپنے اٹل اور نا قابل تغیر قوانین کے باوجود تمدن وثقافت زمانے کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور انسان کی بدلتی زندگی میں قابل تطبیق ہے چند چیزوں کی طرف توجہ مبذول فرمائیے۔

---

[۱] آیت اللہ العظمی میرزا محمد حسین نائنی نجف کے عالم جلیل فقیہ اعظم اور اصولی ،جنہوں نے علماء کے منصف پر ایک اہم کتاب ''تنبیہ الامت'' تحریر فرمائی اور مشروط میں استعمار سے آزادی کی تحریک میں حصہ لیا۔ان کی ولادت کا سنہ ۱۲۷۷ء اور سنہ وفات ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۶۳ء ہے۔

[۲] علامہ سید محمد حسین طباطبائی متوفی ۱۹۸۱ء قم تفسیر المیزان کے مصنف اور آخری دور کے مشہور فلسفی۔

جسم وصورت کے اختلاف سے زیادہ روح وحقیقت پرتوجہ ہے

ا۔اسلام زندگی کی ظاہری شکل وصورت سے بحث نہیں کرتا جب کہ انسانی دانش وبینش تمام وکمال اسی سے وابستہ ہے اسلامی قوانین وسفارشات روح وحقیقت سے متعلق ہیں۔وہ زندگی کے نصب العین اورانسان کیلئے بہترین راستے کا رہنما ہے وہ راستہ جواسے منزل مقصود تک پہنچادے علم۔نہ روح ومقصدزندگی کو بدلتا ہے نہ بہتر اور نزدیک تر وبے خطر راستہ بتاتا ہے۔جومقصد حیات تک پہنچا سکے۔علم ہمیشہ بہتر وسائل اورکامل تر ذرائع مہیا کرتا ہے جس سے آدم زادزندگی کے مقاصد حاصل کرسکے اوران تک پہنچنے کے راستے اوران پر چلنے کاانداز معلوم کرسکتا ہے۔

اسلام نے اپنی قلمرواپنے دائرہ کار میں مقاصد متعین کردیے ہیں شکل وصورت ووسائل علم وفن کے دائرہ کار میں چھوڑ دیے تمدن وثقافت کے پھیلاؤ میں تصادم اورٹکرے بچ گیااس سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نے علم وعمل توسیع تمدن وثقافت تقوے استواری ارادہ ہمت پائدار اوراستقامت پیدا کرنے اور بڑھانے میں اصلی عامل اورتمدن کی ترقی میں اساسی کردار اپنے ذمے لیا۔

اسلام نے شاہراہ سفر بشر پر سنگ میل نصب کردیے ہیں وہ نشان راہ رفتار کا رخ اورمنزل کی سمت بتاتے ہیں اس کے مقابلے میں خطروں موڑوں گرنے کے مقامات تباہی کے ٹھکانوں سے بچنے کے سگنل بھی دکھادیے اسلام کے تمام ضابطے یاپہلی قسم کے نشانات ہیں یادوسری قسم کے۔

زندگی کے اسباب ووسائل ہر دور میں انسانی معلومات اورعلمی اطلاعات

سے وابستہ ہوتے ہیں معلومات جتنے بڑھتے جاتے ہیں آلات ووسائل اتنے ہی کامل ومکمل ہوتے اور ناقص وسائل کو ''جبر زمانہ'' کے ہاتھوں بٹاتے جاتے ہیں۔

اسلام میں ایک وسیلہ یا ایک ظاہری ومادی وضع قطع ایسی نہیں مل سکتی جس پر تقدس کا لیبل چپکا یا گیا ہو۔ اور کوئی مسلمان اس وضع قطع کی نگہداشت کا دائمی محافظ بننے کا مدعی ہو۔

اسلام نے یہ نہیں کہا سلائی بنائی کاشتکاری حمل ونقل جنگ .... کیلئے آلات اوزار اور ذرائع کے نام اور خصوصیات نہیں متعین کیے کہ فلاں کام بس فلاں اوزار ہی سے کیا جائے۔ جس کے بعد یہ کہا جاسکے کہ علمی ترقی کے ساتھ وہ اوزار بیکار قرار دے دیا جائے۔ اور اسلامی ضوابط اور علم میں تضاد وتضادم رونما ہو۔ اسلام نے جوتے، ٹوپی اور زنانے مردانے الگ الگ اور نئے قسم کے کپڑے نہیں بنائے ہیں نہ ان کیلئے خاص سانچے، پیمانے اور مادے نہ ساخت اور تولید وتقسیم کیلئے چند آلات اور اوزار معین کیے ہیں۔

ایک جہت تو یہ ہے جس سے دین کو ترقیات زمانہ سے ہم آہنگ بنانے میں آسانی ہوسکتی ہے۔

مستقل ضرورتوں کیلئے پائیدار قانون اور ادلتی بدلتی ضرورتوں کیلئے متبادل قانون

۲۔ دین اسلام کی دوسری خصوصیت جس سے اس کی بے اندازہ اہمیت بڑھ جاتی ہے وہ ہے اس کا یہ پہلو کہ انسان کی مستقل ضرورتوں کیلئے پائیدار قوانین اور تبدیل ہونے والی ضرورتوں کیلئے ایسے متبادل ضابطے جن میں وقتی ضرورتوں کی رعایت ہو۔

انفرادی اجتماعی شخصی اورعمومی دائروں میں کچھ قوانین نا قابل تبدیلی ہیں۔ یہ نوعیت ہرزمانے میں۔یکساں ہے جونظام انسان اپنے غرائز کے سپرد کرتا ہے اور جونظام اپنے اجتماع کو دیتا ہے اس کے اصول وکلیات ہرزمانے میں ایک ہی طرح رہتے ہیں۔

نظریہ ''اضافیت اخلاق'' اضافیت عدالت اوراس کے حامیوں سے باخبر ہوں ان کے عقیدے اور دلائل کے بارے میں اپنی رائے بھی لکھوں گا

ضروریات بشر میں کچھ ضرورتیں ادلتی بدلتی ہیں جن کی وجہ سے ناپائدار اورتغیر پذیر قوانین کی ضرورت پیش آتی ہے اسلام نے ان کیلئے حالات کیلئے خاص ہیت وضع کردی ہے یعنی متغیر حالات کوغیر متغیر اصولوں سے وابستہ کردیا یہ اصول ثابتہ ہر بدلی ہوئی صورت میں ضمنی قانوں پیدا کرسکتے ہیں۔

اس موقع پراس سے زیادہ توضیح نہیں دینا چاہتا، البتہ اپنے قاری کے ذہن کوروشن رکھنے کیلئے چندمثالیں دیتا ہوں:

اسلام کا ایک اجتماعی ضابطہ ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ

مسلمانو!اپنی آخری حدامکان تک دشمن کے مقابلے میں قوت مہیا کرو۔(سورہ انفال۔60)

سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے احکام کا ایک مربوط سلسلہ ''سبق وریایہ'' کے نام سے فقہ میں مرتبہ ہوا۔حکم ہے کہ خودتم اورتمہارے بچے مہارت کامل کی حدتک گھوڑے سواری اورتیراندازی سیکھیں۔گھوڑے سواری کافن اورتیراندازی کاڈھنک اس زمانے کی فوجی تربیت کا جز تھا، ظاہر ہے کہ اس کی بنیادو اصل ''سبق ورمایہ'' اورگھوڑا اسلام کی نظر میں اہمیت نہیں رکھتا اصل ہے ''طاقت ور'' ہونا۔اصل

بات ہے ہر زمانے میں دشمن کے روبرو آخر حد امکان تک فوجی اور دفاعی حیثیت سے مضبوط ہونا طاقتور رہونا تیراندازی اور گھوڑے سواری ایک لباس ہے جو طاقت کے جسم پر پہنا جاتا تھا۔ دوسری لفظوں میں نفاذ حکم کیلئے ایک صورت۔ دشمن کے مقابلے میں طاقت ور ہونا پائیدار قانون ہے جو پائیدار ضرورت کو پورا کرتا اور اسی کے دوام سے دوام پاتا ہے۔

تیزاندازی وگھوڑے سواری میں مہارت کا ضروری ہونا وقت کی وقتی ضرورت تھی زمانے کی مناسبت اور عہد کے بدلنے سے وہ بدلے گی اور تمدن وثقافت کی ترقی کے ساتھ دوسرے جنگی آلات اور آج کے گرم اسلحہ اور آج کی مہارت درکار رہے اور آج کے وسائل کا کل تکنیک کی جگہ بدل جائے گی۔

دوسری مثال:

تبادلہ دولت کے بارے میں قرآن مجید نے ایک اصل اجتماعی بیان کردی ہے اور اسلام نے ''شخصی ملکیت کی اصل'' قبول کی ہے۔ ہاں اسلام جس کو ملکیت کا نام دیتا ہے اور مانتا ہے اس میں اور آج کی دنیا میں سرمایہ داری کی بنا پر جو کچھ ہو رہا اور جو فرق ہے اس کے تقابل کا یہ موقع نہیں۔ بہرحال مالکیت فرد کا لازمہ تبادلہ ہے۔

باہمی تبادلے کیلئے اسلام نے اصول مقرر کیے ہیں من جملہ ان کے ایک اصل ہے:

وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ

سرمایے کو غلط طریقے پر آپ میں گردش نہ دو۔ (سورہ بقرہ۔88)

یعنی جو روپیہ اور جو سرمایہ دست بدست گردش کرتا ہے کاریگر اور کارخانہ دار کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے ہاتھوں میں آنے والے چیز جن جن ہاتھوں میں جس

جس انداز سے جائے اور جو فائدہ ہو وہ مطابق شریعت ہو۔ سرمائے کے دست بدست آنے جانے میں جو فائدہ ہو رہا ہے اس سے انسانی قدر کے اندر ہونا چاہیے ورنہ اجازت نہ ہوگی۔ اسلام نے مالکیت کو مکمل خود مختاری کے برابر نہیں قرار دیا ہے۔

پھر اسلامی ضوابط میں بعض چیزوں کی خرید وفروخت کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً خون اور انسان کا فضلہ ......کیوں! بات یہ ہے کہ خون انسان یا خون گوسفند کا استعمال مفید نہیں ہے لہٰذا اس کی قیمت ایسی نہیں ہوسکتی جو انسانی سرمائے کا حصہ بن سکے۔ خون اور فضلات کی خرید وفروخت کی ممنوعیت کی اساس وہی قرآنی اصل --''وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔ ہے خون وفضلہ کی ممنوعیت اسلام کی نظر میں اصل نہیں ، اصالت تو ہے ایسی دو چیزوں کا تبادلہ جو بشری حالت کیلئے مناسب ہو خون وغیرہ کی ممنوعیت ایک لباس ہے جو غلط سرمائے کی گردش کو پہنا دیا گیا ہے۔ دوسری لفظوں میں یہ ممنوعیت اصل وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ۔کی اجرائی صورت ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اگر تبادلہ۔ مبادلہ، کا ہاتھ درمیان میں نہ ہو اس وقت بھی کوئی سرمایہ کسی سے غلط طریقے پر لے کر ملکیت اور تصروف کا حق حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

یہ اصل پائیدار ہے اور پابند وقت نہیں اس کا ماخذ (سرچشمہ) نا قابل تبدیلی اجتماعی ضرورت ہے۔ رہا خون اور فضلے کا سرمایہ نہ ماننا اور اسے قابل ''مبادلہ'' (لین دین) نہ جاننا اس کا تعلق عہد وزمان اور درجہ تمدن سے بھی ہوسکتا ہے اور حالات کی تبدیلی علوم کی ترقی صنعت وامکان استفادہ صحیح ومفید کے بعد دوسرا حکم بھی ہوسکتا ہے۔

ایک اور مثال

حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے آخری زمانے میں موئے مبارک سفید ہو گئے تھے آپ خضاب نہیں لگاتے تھے داڑھی سفید دیکھ کر ایک شخص نے

غرض کی کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ بالوں کی سفیدی کو رنگ سے چھپالو؟ جواب میں حضرتؑ نے فرمایا: کیوں نہیں اس نے کہا: پھر آپ خضاب کیوں نہیں لگاتے ؟ آپ نے فرمایا: جب حضور نے یہ فرمایا تھا اس وقت مسلمان تعداد میں کم تھے پھر ان میں بوڑھوں کی اچھی خاصی تعداد تھی جو لڑائیوں میں شریک ہوتے تھے، دشمن جب مسلمان فوج کو دیکھتا اور بوڑھے سپاہیوں پر اس کی نظر پڑتی تھی تو اس کے ایک نفسیاتی اطمینان و اعتماد حاصل ہوتا تھا کہ مقابل میں تھوڑے سے بوڑھے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمان جاری کر دیا کہ خضاب لگایا جائے کہ دشمن ان کے بڑھاپے کو دیکھ کر جوان ہمت نہ ہو سکے۔ حضرت علیؑ نے فرمایا حضور کا حکم تقاضائے وقت کے مطابق تھا اس وقت مسلمانوں کی تعداد کم تھی لہٰذا اس قسم کے وسائل کا اختیار کرنا ضروری تھا۔ آج اسلام پوری دنیا میں پھیل چکا ہے، لہٰذا اس کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص آزاد ہے خضاب لگائے یا نہ لگائے۔

حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں پیغمبر اکرمؐ کا فرمان ''خضاب لگاؤ۔ کلیہ۔ اصل نہیں۔ بلکہ کسی اور اصل کی شکل اجرائی ہے قانون اصلی۔ دشمن کی نفسیاتی مدد نہ کرنا پر ایک لباس تھا۔

یہ مطلب ہے کہ اسلام ظاہری شکل پوست چھلکے اور اوپری خول کو اہمیت دیتا ہے اور روح و بطن و مغز کو بھی مگر ہمیشہ صورت کو روح چھلکے کو مغز اور خول کو اندرونی حقیقت کے حوالے سے دیکھتا ہے۔

رسم الخط کی تبدیلی کا مسئلہ

ان دنوں ملک میں ایک مسئلہ زیر بحث ہے ''رسم خط بدلا جائے'' یہ بات زباب وادب کے لحاظ سے بھی قابل بحث ہے اور اصول اسلامی کے لحاظ سے بھی بحث

طلب ہے۔ اسلام نقطہ نظر سے مسئلہ کی دو جہتیں زیر بحث لائی جاسکتی ہیں ایک یہ جہت کہ آیا اسلام کی کوئی حاص الف بے ہے اور دوسری الف بے سے جدا ہے؟ کیا اسلام ہماری الف بے کو جس کا نام عربی الف بے ہے اپنی ملکیت سمجھتا ہے اور دوسری الف بے کو اجنبی جانتا ہے جیسے لاتینی حروف؟

ہرگز نہیں۔ اسلام کائناتی دین ہے اس کی نظر میں ہر الف بے برابر ہے۔ مسئلہ پر بحث کرنے کی دوسری جہت ہے خط اورلف بے کی تبدیلی کا مسلمانوں کے اجنبی لوگوں کے حلق میں اترنے اوران کے پیٹ میں ھضم ہونے پر اثر بھی پرتا ہے؟ اس تبدیلی کا اثر قوم کے اپنے تمدن سے کٹ جانے پر کیا ہوگا جس نے بہرحال اسلامی علوم اوراپنے علمی اثاثے کو چودہ سو برس تک اسی الف بے میں لکھا ہے؟ اور رسم الخط بدلنے کا منصوبہ ہے کن ہاتھوں میں اوراسے کون لوگ نافذ کرنا چاہتے ہیں؟ ان کی تحقیقات ہونا چاہیے۔

ہیٹ پہننا حرام نہیں دم چھلا بننا حرام ہے۔

مجھ جیسے لوگوں سے اکثر تمسخر آمیز لہجے میں پوچھا جاتا ہے؟ جناب کھڑے ہوکر کھانا شرعا کیسا ہے؟ چھری کانٹے سے کھانا جائز ہے؟ ہیٹ لگانا حرام ہے کیا اجنبی زبان میں بات کرنا ناجائز ہے؟

ان حضرات کے جواب میں کہتا ہوں اس بارے میں اسلام نے کوئی خصوصی حکم نہیں دیا ہے اسلام نے پابند نہیں کیا ہے کہ ہاتھ سے کھائیے یا چمچے سے یہ ضرور حکم دیا ہے کہ صفائی کا خیال رکھیں۔ جوتا ٹوپی اور لباس کا بھی کوئی ماڈل نہیں دیا۔ انگریزی جاپانی اور فارسی زبان اسلام کے نزدیک یکساں ہے۔

لیکن............

لیکن اسلام نے ایک اور بات ضرور کہی ہے۔اسلام کہتا ہے کہ اپنی شخصیت کا بھلا دینا حرام ہے دوسروں کے پیٹ میں ہضم ہو جانا دوسروں میں مل کر مٹ جانا حرام ہے دم چھلا بننا حرام ہے اجنبی کے مقابلے افسوس کی ندر ہونا حرام ہے جیسے سانپ کے سامنے خرگوش دوسرے کے بدلے گدھے کو خچر سمجھنا حرام ہے ان کے انحراف اوران کی بدبختیوں کوصدی کی ایجاد کہہ کر جذب کر لینا حرام ہے۔یہ عقیدہ کہ ایرانی کوجسم وروح ظاہر و باطن میں فرنگی بن جانا چاہیے۔حرام ہے چارون تک صبح سویرے فرانسیسی کلچر سینٹر پیرس جانا اور حرف ''ز'' کا مخرج ''غ'' میں بدلنا اور ''زفتم'' کو ''غضتم'' کہنا حرام ہے۔

اہم اور اہم تر مسئلہ

۳۔ایک اور جہت کہ اسلام کو تقاضائے قوت سے ہم آہنگ کرتا ہے وہ اس کے قوانین کا عقلی پہلو ہے۔اسلام نے اپنے پیروں کو علانیہ بتایا ہے کہ اس کے تمام ضوابط بلند ترین مصالح پر مبنی ہیں اور خود اسلام میں مصالح کی اہمیت کے درجے بیان کیے گئے ہیں۔اسلام کے معاملات کے ماہر ایسے مقامات پر طرح طرح کی مصلحتوں کو باہم مقابل دیکھ کر کام کی سمت و جہت آسانی سے معلوم کر لیتے ہیں وہ اسلام کی اس اجازت سے مطلع ہیں کہ ایسے مقامات پر حقیقی ماہرین اسلام مصلحتوں کی اہمیتوں کا اندادہ لگائیں اوراس کی براہ راست رہنمائی کی روشنی میں اہم ترین مصلحتوں کا انتخاب کریں۔فقہا اس کلیہ کو ''اہم ومہم'' کا نام دیتے ہیں۔یہاں مثالیں بہت ہیں لیکن ان کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

''ویٹو'' کا حق رکھنے والے قوانین

۴۔ ایک اور جہت جس نے اس دین کو حرکت وانطباق کی خصوصیت دی اور اسے زندہ وجاوداں بنا دیا ہے وہ خود اس دین کے اندر ایسے قوانین اور قاعدے وضع ہوئے ہیں جن کا کام دوسرے قوانین میں اعتدال اور ان پر کنٹرول قائم رکھنا ہے۔ فقہوں کی زبان میں انہیں ''قواعد حاکمہ'' کہتے ہیں جیسے ''قاعدہ لاحرج'' اور قاعدہ ''لاضرر'' جو پوری فقہ پر حاکم ہے۔ حقیقت میں اسلام تمام قوانین وضوابط کے مقابلے میں ان قواعد کو ''ویٹو'' کا درجہ دیتا ہے اس کی بات بھی طویل ہے اور اس کا بیان کرنا مقصود نہیں۔

حاکم کے اختیارات

جن بریکٹوں اسپرنگوں کا سلسلہ ہم نے بتایا ان کے علاوہ بھی کچھ باتیں ہیں جو دین مقدس اسلام کی تعمیر میں ملحوظ رکھی گئی ہیں اور انہوں نے اس دین کو ابدیت وخاتمیت کی صفت خاص بخشی ہے مرحوم آیت اللہ نائنی اور علامہ طباطبائی نے اس سمت میں ان اختیارات کا تذکرہ کیا ہے جو اسلام نے ''اسلام کی حکومت صالحہ'' کو عطا کیے ہیں۔

اصل اجتہاد

(علامہ) اقبال پاکستانی کہتے ہیں:

''اجتہاد اسلام کی قوت محرکہ ہے۔''

بات بالکل ٹھیک ہے لیکن اہم خصوصیت ہے ''اجتہاد پذیری'' اسلام

اجتہاد کو منظور کرتا ہے اسلام کی جگہ کسی اور کو رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اجتہاد کس قدر مشکل ہے۔ بلکہ اجتہاد کا راستہ ہی بند ملے گا اس دین آسمانی میں عجیب وعمدترین بات وہ باریکیاں ہیں جو اس کی ساخت میں موجود ہیں۔ان خصوصیات کی وجہ سے وہ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے۔

بوعلی سینا نے کتاب ''الشفا'' میں بھی اسی بنیاد پر ضرورت اجتہاد کی بحث چھیڑی ہے وہ کہتا ہے چونکہ زمانے کے حالات تغیر پذیر ہیں اور ہمیشہ نئے مسائل پیش آتے ہیں ۔دوسری طرف اسلام کے کلی اصول قائم و ناقابل تبدیل ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہر عہد اور ہر زمانے میں نت نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں لہٰذا ایسے افراد ہونا چاہیں جو نئے مسائل کا ادراک کرسکیں اور مسلمانوں کو جواب دہی کے بعد اطمینان دلائیں۔

''قانون اساسی'' کے تتمے میں بھی اس کی پیش بندی کی گئی ہے ۔یعنی ہر زمانے میں مجتہدین کی ایک کمیٹی ہوگی جس کے ممبر کم ازکم پانچ ہوں گے یہ حضرات ''تقاضائے وقت'' سے باخبر بھی ہوں ،یہ حضرات منظور شدہ قوانین کی نظارت کریں گے

قابل یاددہانی بات یہ ہے کہ ''اجتہاد'' اپنے حقیقی مفہوم کے لحاظ سے ۔یعنی تخصص مہارت وکارشناسی اوراسلامی مسائل میں فنی کارشناسی۔ ایسی چیز نہیں کہ مدرسے کا ہر بھگوڑا صرف اس بہانے مدعی ہوسکے کہ وہ چند دن کسی حوزہ علمیہ میں رہ چکا ہے۔

اسلامی مسائلہ میں مہارت اوراظہار نظر کی صلاحیت کیلئے پوری عمر درکار ہے (جو اگر کم نہیں تو زیادہ بھی نہیں ہے) اس پر ایک شرط زائد اس کا فطری ذوق اورقوت استعداد اور فن پر قابو اور توفیقات الٰہی کا ہونا ہے۔

مہارت خصوصی اوراجتہاد سے آگے یہ لوگ ایسے ہوں جو مرجع رائے ونظر سمجھتے جاتے ہوں ۔تقوے معرفت الٰہی خداترسی سے کماحقہ بہرہ مند ہوں تاریخ اسلام ایسے افراد کی نشان دہی کرتی ہے جوتمام ترعلمی واخلاقی صلاحیتوں کے باوجود جب اظہارنظر کاوقت آتاتھاتو کانپنے اورتھرتھرانے لگتے تھے۔

محترم مطالعہ کرنے والوں سے معذرت چاہتاہوں کہ گفتگو کا دامن اس بحث میں ان مطالب تک پھیل گیا۔

پانچواں حصہ

قرآن کی نظر سے عورت کا انسانی درجہ

اسلام نے زن و مرد میں انسانی مساوات کی نگہداشت کی ہے۔

اسلام زن مرد کے مساوی حقوق کے خلاف نہیں وہ دونوں کے حقوق میں مشابہت کے خلاف ہے۔

اسلام نے عورت کے بارے میں حقارت آمیز نظریوں اور رویوں کا کالعدم قرار دیا۔

قرآن نے اپنے بیان کردہ واقعات میں توازن رکھا ہے۔ واقعات میں فقط مرد ہی بڑے کردار کے نہیں دکھائے۔ خواتین کے بلند کردار بھی نمایاں کیا ہے۔

خواتین اگر مردوں کے برابر حصہ لینا چاہیں تو مرد کے حقوق سے مشابہت کا خیال ختم کر دیں۔

علماء اسلام کے کلیہ ''عدل'' کی بنیاد پر فلسفہ حقوق کی اساس رکھی ہے۔

اہل مشرق نے انسانیت کو درگزر اور نیکی میں اور اہل مغرب نے حقوق حاصل کرنے میں محدود کر دیا۔

منشور حقوق انسانی فلسفہ ہے قانون نہیں ہے۔ اسے فلسفیوں کا تائید درکار ہے عوام کی نہیں۔

منشور حقوق انسانی میں احترام آدمیت کی بت مدتوں سے مشرق اور اسلام میں تصدیق شدہ ہے۔

مغربی دنیا ایک طرف تا بہ حد امکان انسانی مقام کو نیچے لا رہی ہے

اور دوسری طرف حقوق انسانی کا لمبا تڑ نگا منشور جاری کر رہی ہے۔

آج کے انسان کی مجبوری یہ ہے کہ اس نے ''خود'' کو بھلا دیا ہے

احترام انسان فلسفہ مشرق سے ہم آہنگ ہے، فلسفہ مغرب سے نہیں۔

خلاصہ مطالب از مؤلف:

قرآن کی نظر سے عورت انسانی درجہ

اسلام عورت کو کس قسم کی مخلوق سمجھتا ہے؟ کیا شرافت اور انسانی حیثیت سے اسے مرد کے برابر جانتا ہے یا ادنی درجے کی جنس؟ یہ سوال ہیں جن کے ہم جواب دیں گے۔

عائلی حقوق کے بارے میں اسلام کا خاص فلسفہ

اسلام خاندانی مسئلہ میں عورت و مرد کے لئے خاص فلسفے کا قائل ہے یہ فلسفہ گزشتہ چودہ برس اور آج کے فلسفے سے مختلف ہے۔ اسلام عورت مرد کیلئے ہر جگہ ایک طرح کے حقوق ،ایک قسم کے فرائض ایک نوع کی سزا کا قائل نہیں ۔کچھ حقوق اور ذمے داریاں اور سزائیں مرد کیلئے مناسب سمجھتا ہے کچھ باتیں عورت کے واسطے کہیں وہ زن و مرد کو مشابہ وضع میں دیکھتا ہے کہیں یہ مشابہت نہیں مانتا۔

کیوں ؟ کس انداز وحساب کی بنیاد پر یہ وجہ تونہیں ہے کہ دوسرے دبستانوں کی طرح اسلام بھی عورت کے بارے میں حقارت آمیز رویہ رکھتا ہے اور عورت کو پست جنس مانتا ہے یا کوئی اور علت وفلسفہ ہے۔

مغربی سسٹم کے پیروکار تقریروں اور تحریروں میں لکھتے اور کہتے اور ہم آپ سنتے رہتے ہیں کہ اسلامی قانون قاعدے مہرو نان ونفقہ، طلاق وتعدد ازدواج عورت کی جنس کو حقیر رکھنے کیلئے ہیں۔ ہر جگہ عورت کی توہین کی گئی ہے۔ یہ لوگ سمجھاتے ہیں کہ تمام احکام مرد ہی کی جنبہ داری کرتے ہیں۔

کہتے ہیں، بیسویں صدی سے پہلے رسم ورواج دنیا ہی یہ تھا کہ مرد کی جنس کو عورت کی جنس سے بہتر مانتے تھے۔عورت فقط مرد کی لذت اندوزی اور بیگار کیلئے

پیدا کی گئی ہے۔ اسلامی قوانین بھی مرد کے فوائد کے گرد گھومتے ہیں۔

کہتے ہیں: اسلام مردوں کا دین ہے وہ عورت کو معیاری انسان نہیں مانتا اس کیلئے ایسے قوانین وضع نہیں کیے جو ایک انسان کیلئے وضع کیے جاتے ہیں۔ اگر اسلام عورت کو مکمل معیاری انسان جانتا تو کئی بیویاں رکھنے کی اجازت نہ دیتا، طلاق کا حق مرد کو نہ دیتا دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر مانتا، گھر کی سرداری مرد کو نہ دیتا۔ بیوی کی میراث مرد کے حصہ ترکہ میں نصف کی نسبت سے نہ رکھتا۔ مہر کے نام سے عورت کی قیمت مقرر نہ کرتا۔ عورت کو اقتصادی و معاشرتی خودمختاری دیتا اسے وظیفہ خوار و نفقہ گیر مرد نہ بناتا۔ یہ باتیں ثابت کرتی ہیں کہ اسلام عورت کے بارے میں حقارت آمیز رویہ رکھتا ہے اسے مرد کیلئے ایک وسیلہ جانتا ہے۔

کہتے ہیں: اسلام دراصل مساوات کا دین ہے متعدد مقامات پر اس نے مساوات کا خیال رکھا ہے صرف مرد و زن کے بارے میں اس کا رویہ جدا ہے۔

کہتے ہیں: اسلام مردوں کے قوانین و حقوق میں امتیاز و ترجیحات کا قائل ہے اگر مردوں کیلئے ترجیحات کا قائل نہ ہوتا تو مذکورہ بالا ضابطے نہ بناتا۔

ان حضرات کے استدلال کو اگر منطق ارسطو کے مطابق دھرائیں تو یہ شکل ہوگی: (الف) اگر اسلام عورت کو مکمل معیاری انسان مانتا تو مرد کے مساوی و مشابہ حقوق اس کیلئے بھی بناتا۔

(ب) اسلام عورت کیلئے مرد کے برابر اور اس سے مشابہ حقوق و قوانین کا قائل نہیں۔

(ج) لہٰذا عورت کو ایک حقیقی و واقعی انسان نہیں مانتا۔

برابری یا مشابہت

اس استدلال میں جو کلیہ استعمال ہوتا ہے وہ ہے کہ:''قانون میں یکسانیت ومشابہت (تشابہ) کی بنیا پر حیثیت واعزاز انسان جانچا جائے اور زن ومرد کو ایک سمجھا جائے۔اچھا تو فلسفی زاویے سے بھی ایک گوشے پر اشارہ کیا جانا چاہیے۔یعنی یہ بتایئے کہ عورت ومرد میں انسانی حیثیت سے اشتراک کا لازمہ کیا ہے؟ لازمہ یہ ہے کہ دونوں قانونی مساوات رکھتے ہوں یعنی کسی قسم کی ترجیح اور کسی کام میں حقوقی امتیاز نہ ہو۔ یا لازمہ یہ ہونا چاہیے کہ زن ومرد کے حقوق میں برابری ومساوات کے علاوہ ایک دوسرے کے مشابہت اور یک رنگی بھی ہونا چاہیے کسی قسم کی تقسیم کار کسی قسم کی تقسیم فرائض نہ ہو۔زن ومرد کے انسانی مرتبے میں برابری بلاشک وشبہ موجود ہے انسانی حقوق میں مساوات بھی ہے مگر حقوق میں ایک دوسرے کے مشابہ حقوق کا مقصد کیا ہے۔

اگر فلسفہ یورپ کی اندھی تقلید کو چھوڑ کر ان کے افکار ونظریات کے زاویے سے سوچنے کا حق دیا جائے تو ہم سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ آیا تساوی حقوق کا لازمہ تشابہ حقوق بھی ہے یا نہیں؟ آخر تساوی اور تشابہ میں فرق ہے۔تساوی کے معنی برابری اور تشابہ کہتے ہیں یکسانیت کو۔ممکن ہے باپ اپنی دولت اپنی اولاد میں مساوی سے تقسیم کردے مگر متشابہ تقسیم نہ کرے۔مثلاً باپ متعدد قسموں کے سرمائے کا مالک ہو۔ ایک تجارتی مرکز ایک زرعی جائیدار کچھ کرایے کے مکانات واملاک۔لڑکوں میں صلاحیتوں کا جائزہ لینے کے بعد اس نے اندازہ لگایا کہ ایک میں تجارت، دوسرے میں زراعت، تیسرے میں املاک کے کرایے کی وصول یابی کا شوق دیکھا اپنا سرمایہ تقسیم کرتے وقت اس نے فیصلہ کیا کہ جائیداد واملاک تقسیم کرتے وقت ہر ایک کے حصے

کو قیمت میں برابر رکھنے کا خیال رکھا اور کسی کو ترجیح وامتیاز نہیں دیا۔ سب کو حصہ دیتے وقت اس کے حصے کی قیمت کا اندازہ کرلیا۔

کمیت (مقدار) اور چیز ہے کیفیت اور چیز ہے، برابر اور ہے اور یکسانیت اور ہے طے شدہ بات ہے کہ اسلام نے یکساں اور یک انداز حقوق زن ومرد کو نہیں دیے ہیں اس کے باوجود اسلام مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں امتیاز اور ترجیحی حقوق کا بھی قائل نہیں۔ اسلام زن ومرد میں انسانی مساوات کا خیال ضرور رکھتا ہے۔ اسلام زن ومرد کے حقوق میں مساوات کا مخالف نہیں تشابہ حقوق کے مخالف ہے۔

تساوی ومساوات (برابری) کے لفظ میں چونکہ امتیاز نہ ہونے کا مفہوم بھی ہے لہٰذا لفظ نے ''تقدس'' کا پہلو اختیار کرلیا ہے خصوصاً جب اسے ''حقوق'' سے جوڑ دیا جاتا ہے۔

حقوق کی برابری (تساوی حقوق) کتنی مقدس خوبصورت ترکیب کون شخص ایسا ہوگا۔ جو پاک فطرت اور صحیح وجدان رکھتا ہو اور ان دولفظوں کو سن کر سر نہ جھکائے آج یہ حالت ہے۔ ''تشابہ حقوق زن ومرد'' کو 'حقوق کی برابری' کے نام سے ہم پر مسلط کیا جارہا ہے۔

اس کی مثال تو یہ ہے جیسے کوئی اپنے لہو (ابلے چقندر) کو گلابی (ناشپاتی کی قسم کا ایک پھل) کہہ کہ شور مچائے۔

سب مانتے ہیں، اسلام نے زن ومرد میں ہر جگہ مشابہ حقوق وضع نہیں کیے نہ ہر جگہ اور ہر مقام پر ان کیلئے مشابہ فرائض اور سزا تجویز کی۔ ہاں یہ سوال کیا مجموعی طور پر جو حقوق عورت کو دیے ہیں وہ مردوں کو عطا کردہ حقوق سے کم قیمت ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اسے ہم ثابت کریں گے۔

یہاں ایک اورسوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے عورت مرد کے حقوق کو بعض مقامات پر غیر متشابہ کیوں رکھا، علت کیا ہے؟ دونوں کو ایک دوسرے کے مشابہ کیوں نہ رکھا؟ اگر عورت و مرد کے حقوق مساوی بھی ہوتے اور مشابہ بھی تو اچھا نہ ہوتا جو مساوی تو رکھے مگر مشابہ نہ بنائے ؟ اس مدعا کو واضح کرنے کیلئے تین پہلوؤں پر بحث کرنا ہوگی۔

۱۔تخلیق و پیدائش کے لحاظ سے عورت کی انسانی حیثیت پر اسلام کا نقطہ نظر۔

۲۔عورت و مرد کی تخلیق میں جو فرق ہے اس کا مقصد کیا ہے؟ آیا یہ اختلاف دونوں کے طبیعی وفطری حقوق میں نامشابہت رکھنے کا سبب ہے یا نہیں؟

۳۔اسلامی ضابطوں میں زن و مرد میں جو اختلافات ہیں وہ بعض حصوں میں نامشابہ حالات پیدا کرتے ہیں ان کا فلسفہ کیا ہے؟ کیا وہ فلسفے ابھی تک اپنے استحکام پر باقی ہیں؟

اسلام کی جہان بینی میں عورت کا مرتبہ

۱۔قرآن فقط قوانین کا مجموعہ نہیں اس کے مندرجات صرف خشک قواعد وضوابط ہی نہیں بلکہ ان کی تشریح بھی ہے۔قرآن میں قانون تاریخ وعظ تفسیر خلقت اور ہزاروں مطالب ہیں۔قرآن کبھی قانوں کے بیان میں دستور العمل معین کرتا ہے کبھی وجود ہستی کی تشریح کبھی خلقت زمین وآسمان، نباتات وحیوانات انسان اور موت وزندگی، عزت وذلت، عروج وزوال، غربت وامیری کے راز بتاتا ہے۔

قرآن کتاب فلسفہ نہیں ہے، اس کے باوجود کائنات انسان اور معاشرے فلسفے کے تینوں اہم موضوعات کے بارے میں اپنی حتمی رائے ضرور دیتا ہے۔قرآن اپنے پیروکاروں کو فقط قانون کی تعلیم نہیں دیتا صرف وعظ ونصیحت نہیں کرتا وہ

تشریح تخلیق کائنات بھی کرتا ہے انداز فکر و کائنات شناسی کا خاص زاویہ بھی بتاتا ہے اسی ضمن میں معاشرے جیسے مالکیت حکومت عائلی قوانین وغیرہ کی تشریح بھی کرتا ہے اور اسے تخلیق و موجودات ہی میں قرار دیتا ہے۔

جو مسائل قرآن مجید میں تشریح طلب سمجھے گے ہیں ان میں زن و مرد کی تخلیق بھی ہے۔قرآن نے اس بارے میں خاموشی اختیار نہیں کی اور بے معنی خیال آرائی کرنے والوں کو موقع نہیں دیا کہ وہ اپنی طرف سے عورت و مرد کیلئے کوئی فلسفہ گرہیں اوران کی اسلام سے نسبت دے کر اسلامی مسلمات کا نام دیں۔اسلام نے اگے بڑھ کر خود عورت کے بارے میں اپنا نقطہ بیان کیا ہے۔

قرآن مجید کا عورت کے بارے میں نقطہ نظر معلوم کرنے سے پہلے دوسری مذہبی کتابوں میں زن و مرد کی سرشت پر گفتگو بھی دیکھتے چلیے قرآن مجید بھی خاموش نہیں دیکھنا چاہیے کہ تخلیق زن و مرد کے بارے میں قرآنی نقطہ نظر ہے کیا؟ دونوں ایک خمیر سے بنے ہیں یا الگ الگ؟ دونوں کی سرشت ایک ہے یا مرد کی طینت اور ہے عورت کی سرشت اور ہے۔قرآن بڑی صفائی سے متعدد آیتوں میں کہتا ہے کہ عورت کو مرد کی جنس اور اسی جیسی سرشت سے پیدا کیا ہے۔آدم اول کے بارے میں ارشاد ہے ''تم سب کو ایک باپ سے اور اس کی شریک حیات کو خود اسی کی جنس سے قرار دیا (النساء۔ا) تمام آدم زاد کیلئے فرمایا: اللہ نے خود تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں (النساء،آل عمران،الروم)

کچھ مذاہب کی کتابوں میں جو لکھا ہے کہ عورت کو مرد کے مقابلے میں حقیر مادے سے پیدا کیا گیا، یا عورت کو بائیں یا زائد حصہ جسم قرار دیا گیا اور یہ کہ آدم اول کی بیوی آدم کے بائیں پہلو کے کسی عضو سے پیدا کی گئیں۔قرآن میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا بنابریں اسلام میں عورت کیلئے سرشت وطینت کی بنیاد پر کوئی حقارت

آمیز نظریہ موجود نہیں۔

ایک اور نظریہ حقارت آمیز ماضی میں موجود تھا اور بین الاقوامی ادب میں اس کے ناپسندیدہ نشان ملتے ہیں وہ تھا کہ عورت عنصر گناہ ہے۔عورت چھوٹا شیطان ہے مرد جو گناہ و جرم کرتے ہیں اس میں عورت کا دخل ہوتا ہے۔مرد بذاتہ گناہ سے پاک ہے عورت اسے گناہ کی طرف لے جاتی ہے شیطان براہ راست مرد تک نہیں پہنچ سکتا وہ عورت کے ذریعے مرد کو فریب دیتا ہے۔شیطان عورت کو وسوسے میں ڈالتا اور وہ مرد کو۔آدم اول نے جو شیطان کا فریب کھایا اور سعادت کی جنت سے نکلے وہ بھی عورت کے سبب ہوا شیطان نے حوا کو ورغلایا اور انہوں نے............

قرآن نے جنت آدمؑ کی بات چھیڑی ہے مگر کہیں یہ نہیں کہا کہ شیطان یا سانپ نے حوا کو فریب دیا اور حوا نے آدم کو قرآن حوا کو نہ ذمے دار قرار دیتا ہے نہ ان کو حساب سے خارج کرتا ہے۔قرآن کے بقول: ہم نے آدم سے کہا تم اور تمہارے زوجہ بہشت میں رہو اور اس کے میوے کھاؤ۔شیطان کے وسوسوں کے تذکرے میں قرآن تثنیہ کی ضمیریں لاتا ہے [1]:

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ

شیطان نے ان دونوں کیلئے وسوسے پیدا کیے۔[2]

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ

شیطان نے دونوں کو فریب کی راہ دکھائی۔[3]

---

[1] البقرہ/35 (يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا)

[2] الاعراف-20

[3] الاعراف-22

وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيۡ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيۡنَ ﴿۲۱﴾

یعنی شیطان نے دونوں کے بارے میں قسم کھائی کہ وہ ان کی بھلائی چاہتا ہے۔[1]

اس طرح قرآن مجید نے اس دور کے عام عقیدے بلکہ آج کی دنیا میں بھی کہیں کہیں پائے جانے والے عقیدے کے خلاف سختی سے قدم اٹھایا اور جنس زن کو اس اتہام سے بری قرار دیا کہ وہ عنصر گناہ یا گناہ ہے یا چھوٹا شیطان ہے۔

یہ حقارت آمیز نظریہ بھی عورت کے بارے میں موجود ہے کہ اس کی روحانی اور نفسیاتی صلاحیت کے پیش نظر وہ جنت میں نہیں جائے گی۔ عورت روحانی مدارج اور الٰہی معارف کو نہیں پا سکتی۔ جیسے مرد قرب الٰہی حاصل کرتے ہیں عورت کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ قرآن مجید نے متعدد آیات میں صاف کہا ہے کہ آخرت کا بدلہ اور قرب الٰہی کا جنس سے کوئی تعلق نہیں، یہ مسئلہ ایمان و عمل کا ہے اس میں عورت ہو یا مرد، قرآن مجید نیک اور مقدس مرد کے ساتھ نیک اور مقدس خاتون کا تذکرہ کرتا ہے آدم و ابراہیم علیہما السلام کے ساتھ ان کی بیویاں حضرت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی محترم مائیں بڑے اعزاز سے یاد کی گئی ہیں نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کا نااہل بیویوں کے ضمن میں بیان کیا مگر نہایت موزوں انداز سے۔ زوجہ فرعون ایک بڑی خاتون جو انتہائی گندے شوہر کے ساتھ رہیں گویا قرآن نے اپنی تاریخی حکایتوں میں توازن کو برقرار رکھا اور اپنی داستانوں کے ہیرو مرد ہی نہیں خواتین کو بھی یاد رکھا ہے۔

قرآن کریم، مادر حضرت موسیٰؑ کے بارے میں کہتا ہے:

---

[1] الاعراف/21

ہم نے [1] مادر موسیٰؑ کو ''وحی'' بھیجی کہ بچے کو دودھ پلائیں اور جب ان کی جان کے بارے میں وہ خوف زدہ ہوں تو سمندر میں ڈال دیں اور ڈریں نہیں کہ ہم اسے تمہارے واپس لوٹا دیں گے۔

قرآن کریم مادر عیسیٰؑ حضرت مریمؑ کے بارے میں کہتا ہے کہ ان کا مرتبہ یہاں تک پہنچا کہ ملائکہ محراب عبادت میں ان سے باتیں کرتے تھے غیب سے ان کیلئے روزی آتی تھی۔ روحانی مرتبہ اتنا بلند ہوا کہ پیغمبر وقت حیران رہ گئے وہ نبی سے اگے بڑھ گئیں زکریاؑ مریم کے سامنے حیران ہو گئے۔

تاریخ اسلام میں مقدس و بلند مرتبہ عورتیں فراواں ہیں حضرت خدیجہؑ کے پائے کے بہت کم مرد ملیں گے اور پیغمبرؐ و علیؑ کے سوا فاطمہؑ کا ہم پایہ کوئی نہ تھا۔ حضرت زہرا اسلام اللہ علیہا خاتم الانبیاؐ کے علاوہ تمام پیغمبروں اور اپنی اولاد (جو امام تھی) سب پر شرف رکھتی ہیں اسلام نے ۔خلق سے حق کی طرف سفر میں زن و مرد کا فرق نہیں کیا، ہاں حق سے خلق ۔۔۔کے سفر میں اور پیغمبرانہ ذمہ داریوں میں مرد کو مناسب تر سمجھا ہے۔

عورت کے بارے میں ایک اور حقارت آمیز نظریہ تھا۔ وہ تجرد جنسی ریاضت شادی نہ کرے اور مرد سے دور رہنے کا دستور تقدس ہے ہم سب جانتے ہیں کہ بعض آئینوں میں جنسی روابط بذاتہ نجس ہیں اور ان قوانین کے ماننے والوں میں فقط وہی لوگ روحانی درجے حاصل کر سکتے ہیں جو ساری زندگی کنوار پن میں گزار دے ، بین الاقوامی پیشوائے مذہبی کا جملہ ہے ''بکارت کے تیشے سے شادی کے درخت کو جڑ سے کاٹ دو'' یہی پیشوا شادی کو فاسد سے فاسد تر کیلئے تجویز کرتے ہیں۔ ان

---

[1] القصص۔7 وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْهِ ۚ ....

کے خیال میں چونکہ اکثریت کنوارپن پر صبر کر سکتے بے اختیار ہو کر فحشا رومنکر میں گرفتار ہوجاتے ہیں ،متعددعورتوں سے پھنستے ہیں ریاضت کی فکراور مجرد زندگی کی حمایت اور کنوار پن جنس خواتین سے بدظنی ہے ۔ یہ لوگ عورت سے محبت کو اخلاقی تباہ کاری شمار کرتے ہیں ۔

اسلام نے اس بے معنی نظریے اورعمل سے مقابلہ کیااس نے ازدواج کومقدس قرار دیا، کنوار پن کو منحوس شمار کیا اسلام نے عورتوں سے محبت کوانبیا کے اخلاق کا حصہ مانا،اورکہامن اخلاق الانبیاء حب النساء۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا مجھے تین چیزیں پسند ہیں خوشبو،عورت ،اور نماز ۔

برٹرینڈرسل کہتے ہیں : تمام مذاہب میں جنس زن کے بارے میں بدظنی ہے اسلام کے علاوہ اسلام نے معاشرتی فلاح وبہبود کے زاویے سے حدود اور پابندیاں تو لگائی ہیں مگراس رابطے یاعورت کونجس قرارنہیں دیا۔

عورت کے بارے میں حقارت آمیز ایک رویہ بھی تھاکہ : عورت وجودمرد کا پیش خیمہ ہے وہ مرد کیلئے پیدا کی گئی ہے۔

اسلام نے کوئی ایسی بات نہیں کہی اسلام نے انتہائی وضاحت سے علت غائی بیان کی اور اسلام صاف صاف کہتا ہے زمین وآسمان ،ابروہو، نباتات اور حیوانات سب انسان کیلئے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ عورت مرد کیلئے پیداہوئی اس کے بجائے وہ ایک کو دوسرے کیلئے پیداہونے کا تذکرہ کرتا ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ [1] عورتیں تمہارے لئے زینت ولباس ہیں تم عورتوں کیلئے لباس وزینت ہو۔ اگراسلام عورت کومرد کیلئے پیش

[1] البقرہ۔187

خیمہ جانتا تو بہرحال اپنے قوانین میں اس زاویے کوملحوظ رکھتا،لیکن چونکہ اسلام تشریح خلقت کے نقطہ نظر کا حامی نہیں اور عورت کوطفیلی وجود مرد نہیں مانتا اس بنا پر اس نے اپنے ضابطوں میں زن ومرد کیلئے یہ گوشہ پیش نظر نہ رکھا۔

حقارت آمیز رویوں سے ایک رویہ یہ بھی ہے کہ عورت ایسا شر و بلا ہے جس سے مرد بچ نہیں سکتا بہت سے مرد جنہوں نے عورت سے فائدہ اٹھایا ہے وہ بھی اسے حقیر اور اپنی مصیبت و بدقسمتی کی بنیاد جانتے ہیں قرآن حکیم نے خصوصی طور پر اس بات کی یاد دلائی ہے کہ وجود زن مرد کیلئے خیر [۱] وآرام دل وجان ہے۔

توہین خیز رویوں میں یہ بات بھی ہے کہ عورت تولید میں ناچیز ہے۔جاہلیت کے عرب اور متعدد قومیں ماں کو مرد کے مادہ تخلیق کا برتن جانتی تھیں ان کے خیال میں مرد کا مادہ ہی اصل بیج ہے ماں فقط اسے محفوظ رکھتی اور نشوونما دیتی ہے۔قرآن مجید نے متعدد آیات میں پھر تفاسیر نے اس سوچ کو ختم کیا اور مرد عورت کو مساوی بتایا۔ [۲]

مذکورہ بالا گفتگو سے واضح ہوگیا کہ فلسفیانہ اور تخلیق بیانات کے نقطہ نظر سے اسلام کسی قسم کی حقارت آمیز رائے نہیں رکھتا بلکہ ایسے خیالات کو بے ہودہ سمجھتا ہے اس کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ مرد وزن کے حقوق میں تشابہ نہ ہونے کا فلسفہ کیا ہے؟

مساوات؟ ہاں مشابہت؟ نہیں [۳]

---

[۱] الروم-21 وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢١﴾

[۲] الحجرات-13-يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى ....

[۳] یہ بات پہلوی دور کی ہے انقلاب اسلامی کے بعد صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔لیکن ایران کے علاوہ متعدد مسلمان ملکوں کا مسئلہ یہی ہے کہ اسلام کا لیبل تو ہے مگر ہیں وہ قوانین کچھ اور

ہم نے کہا ہے اسلام زن ومرد کے خانگی تعلقات وحقوق میں خاص فلسفہ کا مالک ہے۔اسلام کا فلسفہ چودہ سو برس پہلے کے فلسفے سے مختلف اور معاصر فلسفے سے بھی متفق نہیں ہے۔

ہم کہہ چکے کہ اسلام میں یہ مسئلہ زیر بحث نہیں کہ مرد وزن دو مساوی انسان ہیں۔ یا انسانیت میں فرق ہے؟ کیا ان کے گھریلو حقوق قیمت کے لحاظ سے مساوی ہوں یا نہیں؟ اسلام کی نظر میں مرد وزن دونوں انسان ہیں اور انسانی حقوق میں برابر کے حصے دار ہیں۔

اسلام کے نزدیک بحث طلب بات ہے کہ زن ومرد فقط اس بنا پر کہ ایک عورت ہے دوسرا مرد بہت سے پہلوؤں سے ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہیں ۔کائنات ان دونوں کیلئے یکساں نہیں ہے،خلقت اور طبیعت نے دونوں کوایک جیسا تسلیم نہیں کیا، وہ یہی ثابت کرتے ہیں کہ بہت سے پہلو ایسے ہیں جہاں حقوق وفرائض قانون سزا میں مشابہ وضع نہیں ہے ۔یورپ کوشاں ہے کہ عورت ومرد بلحاظ قوانین وضوابط،حقوق وفرائض میں وضع کے طور پر ایک اور مشابہ ہیں ۔اور طبیعت اور نیچر کے اختلافات کونظر انداز کرتے ہیں ۔اسلام اور مغربی سسٹم میں یہیں سے اختلاف رونما ہوتا ہے بنا بریں آج کل ہمارے ملک میں اسلامی قوانین کے طرفدار اور مغربی سسٹم کی حامی ’’اکائی اور تشابہ قوانین زن ومرد‘‘ کے مسئلہ پر بحثیں کررہے ہیں تساوی حقوق پر نہیں ’’تساوی حقوق‘‘ حقوق کی مساوات لیبل ہے جو تشابہ حقوق پر مغرب کے اندھے مقلدوں نے فریب کیلئے چسپاں کردیا ہے۔

میں نے ہمیشہ تحریروں تقریروں اور کانفرنسوں میں اس جعلی لیبل کے استعمال سے پرہیز کیا ہے میں نے کبھی تساوی حقوق کا نام تشابہ وتماثل حقوق کو نہیں دیا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا میں ’’برابری حقوق مرد وزن‘‘ کے کوئی معنی نہیں اور

تمام گزشتہ وموجودہ قوانین عورت ومرد کے حقوق کے بارے میں مساوی قیمت اقدار پر مبنی قرار دیے گئے ہیں اور صرف مشابہت کونظر انداز کیا گیا ہے۔

نہیں میرا یہ دعویٰ نہیں بیسیویں صدی سے پہلے کا یورپ بہترین گواہ ہے بیسویں صدی سے پہلے وہاں کی عورت قانونی اور عملی طور پر انسان حقوق سے محروم تھی نہ اسے مرد کے برابر حقوق حاصل تھے نہ مشابہ حقوق وہ میرا ایک جلد باز انقلاب میں ؒجوایک صدی سے کم میں رونما ہوا) جس کا نعرہ عورت اور وہ برائے عورت تھا، یہ انقلاب یورپ میں اٹھا اور اس نے عورت کو کم وبیش مرد کے مثباہ حقوق دے دیے لیکن طبیعی اور جسمانی اور نفسیاتی ضروریات کے پیش نظر عورت کبھی بھی مرد کے برابر حقوق پیدا نہ کر سکی۔ اگر عورت مرد کے برابر حقوق حاصل کرنا چاہتی ہے اسے مرد کی خوش نصیبی جیسی خوش نصیبی کی آرزو ہے تو اس کا صرف ایک راستہ ہے۔ اور وہ راستہ ''حقوق کی مشابہت سے دست برداری'' ہے مرد کے حقوق مرد کے مناسب اور خود اس کی حقوق اس کے مناسب احوال کا خود اعتراف ومطالعہ کرے۔ صرف ایک راہ یہ ہے کہ عورت ومرد میں سچا خلوص اور اتحاد پیدا ہو تو عورت مرد کے برابر بلکہ اس سے بہتر خوش نصیبی سے شادکام ہو سکتی ہے۔ مرد بھی سچے دل سے کسی غفلت وسستی کے بغیر فریب کاری سے بچ کر عورتوں کو اپنے برابر بلکہ بہتر حقوق کا اعتراف کریں۔

میں اس کا مدعی نہیں ہوں کہ ہمارے موجود بظاہر اسلامی [1] معاشرے میں قوانین عملاً رائج ہیں وہ قدر وقیمت کے لحاظ سے عورت کو مرد برابر حقوق دیتے ہیں کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ آج کی عورت کے معاملات کی مکمل چھان بین کی جائے اور وہ بہت

[1] یہ بات پہلوی دور کی ہے انقلاب اسلامی کے بعد صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ لیکن ایران کے علاوہ متعدد مسلمان ملکوں کا مسئلہ یہی ہے کہ اسلام کا لیبل تو ہے مگر ہیں وہ قوانین کچھ اور۔

سے حقوق جو اسلام نے عورت کو دیے ہیں اور طویل مدت سے عملا ان کو چھوڑ رکھا گیا ہے ۔وہ سب حقوق واپس کیے جائیں ۔مگر یورپ کی اندھی تقلید میں نہیں جو خود ان کیلئے مصیبت عظیم کا سبب بنے ہوئے ہیں ہم بھی غلط طریقے اور مفروضے کا خوبصورت نام رکھالیں ۔اور مغربی قسم کی بدنصیبوں پر مزید مشرقی قسم کی بدبختیاں بڑھادیں میرا مدعا یہ ہے کہ عورت اور مرد کی طبیعت وخمیر میں جس حد تک مشابہت نہیں ہے وہاں تک دونوں کو غیر مشابہتی حقوق دیے جائیں اور اس میں عدل وحقوق فطری کی نگہداشت رہے ۔یوں عائلی زندگی بھی خوشگوار ہو سکے گی اور معاشرہ ہنسی خوشی میں آگے بڑھ سکے گا۔

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہمارا دعویٰ ہے کہ انصاف وعدالت اور فطری وانسانی حقوق زن ومرد کا لازمہ یہ ہے کہ کچھ حقوق میں تشابہ نہیں ہے لہٰذا ہماری بحث سوفی صد فلسفیانہ پہلو سے ہے۔اس کا تعلق فلسفہ قانون سے ہے۔اس کا تعلق اصل عدالت اور کلیہ انصاف سے ہے عدل اصول دین میں بھی ہے اور فقہ اسلامی میں بھی رکن کی حیثیت رکھتا ہے اصل عدل وہ کلیہ ہے جو اسلام میں عقل وشرع کی تطبیق کا سبب ہے یعنی اسلامی فقہ ۔۔کم ازکم شیعہ فقہ ۔۔میں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ فلاں قانون فلاں بنیاد پر خلاف عدل ہے اور اگر اس کی صورت یہ ہو تو ظلم ہوگا اور اصل عدالت کے خلاف ہے اگر یہ ثابت ہو جائے تو مجبوراً ماننا پڑے گا کہ شریعت کا حکم یہی ہے کیونکہ شریعت نے خود ایک اصل کی تعلیم دی اور کہا ہے کہ عدالت وحقوق فطری وطبیعی کے محور سے حکم کو دور نہ ہونا چاہیے۔

مقدر یہی تھا کہ وہ لوگ اپنا کام مکمل طور پر آگے نہ بڑھا سکے تقریباً آٹھ صدی بعد یورپ کے فلاسفہ اور دانشوروں نے پیچھا کیا اور یہ اعزاز اپنے لئے حاصل کرلیا کہ معاشرتی وسیاسی واقتصادی فلسفے پیدا کیے اور دوسری طرف افراد معاشروں اور قوم کی زندگی کی قدروں اور ان کو ان کے انسانی حقوق سے

آشنا کیا۔تحریکات اور انقلابات برپا کیے دنیا کی صورت کچھ سے کچھ کر دی۔

میرے خیال میں تاریخی اسباب کے علاوہ ایک نفسیاتی وجغرافیائی سبب کا دخل بھی تھا باین معنی کہ اسلامی مشرق بلاک میں عقلی حقوق کا مسئلہ تو موجود تھا مگر لوگوں نے اس کو مسلسل توجہ کے قابل نہ سمجھا۔اس کی ایک وجہ مشرق ومغربی لوگوں کے اخلاقی رجحانات میں مشرق اخلاق کی طرف مائل ہے اور مغرب حقوق کی طرف مشرق اخلاق کا دیوانہ مغرب حقوق پر فریفتہ مشرق اپنی فطرت وطبیعت کی بنا پر انسانیت کا مطلب یہ سمجھتا ہے کہ جذبات کام میں لائے درگزر کرے اپنے ہم نوع افراد سے محبت کرے جواں مردی اور فراخ حوصلگی دکھائے لیکن مغربی انسان کے نزدیک انسانیت کا مطلب ہے اپنے حقوق جاننا اس کا دفاع کرنا اور کسی کو یہ حق نہ دینا کہ اس کے حقوق کے دائرے میں قدم رکھے۔

بشریت کو اخلاق کی ضرورت بھی ہے اور حقوق کی بھی۔انسانیت حقوق سے بھی تعلق رکھتی ہے اور اخلاق سے بھی اخلاق وحقوق الگ الگ انسانیت کا معیار نہیں ہیں۔

دین مقدس اسلام اس عظیم خصوصیت کا حامل تھا اور ہے۔اس نے حقوق واخلاق کو بیک وقت مرکز توجہ قرار دیا۔اسلام کے نزدیک خلوص ونیکی اخلاقی معاملات ہیں اور مقدس کام حقوق اور ان کا دفاع بھی مقدس اور انسانی کارشمار ہوتے ہیں یہ تفصیل طلب داستان ہے جس کی تشریح کا یہ موقع نہیں ہے۔

خاص مشرقی روح نے اپنا عمل انجام دیا۔شروع شروع میں تو حقوق واخلاق دونوں اسلام سے لئے اور ان پر عمل کیا لیکن آہستہ آہستہ حقوق کو چھوڑ دیا اور اخلاق پر توجہ جمالی

مقصد یہ ہے کہ اس وقت جس مسئلہ کا سامنا ہے۔وہ مسئلہ قانونی ہے وہ مسئلہ

عقلی و فلسفی ہے وہ مسئلہ استدلال و برھان سے تعلق رکھتا ہے ۔اس کا تعلق عدالت اور نیچر آف لا سے ہے۔عدالت وانصاف وحقوق ۔قانون وضع ہونے سے پہلے موجود تھے اور قانون وضع کرنے سے عدالت وحقوق انسانی کی حقیقت نہیں بدلی جاسکتی۔

مان ٹیسکیو کہتا ہے:

'' انسان کی قانون سازی سے پہلے ایسے عادلانہ رویے موجود تھے جو مخلوقات پر حکومت کرتے تھے ۔انہیں رویوں کا وجود بعد میں قانون سازی کا سبب بنا اب اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ سوائے ابتدائی قوانین کے کوئی شے عادل یا ظالم وجود نہیں رکھتی تو گویا ہم اس مدعی ہورہے کہ دائرہ بننے سے پہلے اس دائرے کی تمام شعاعیں اور خط مساوی نہیں ہیں ۔''

ہر برٹ اسپنسر کہتا ہے:

''عدالت احساسات کے علاوہ کسی اور چیز سے مخلوط ہے اسے افراد بشر کے طبیعی حقوق کہتے ہیں اور عدالت کے وجود خارجی سے پہلے حقوق اور طبیعی خصوصیات (وامتیازات) کا احترام کرنا چاہیے ۔''

یورپ کے فلسفی یہی عقیدہ پہلے بھی رکھتے تھے اور اب بھی وہ بہت بڑی تعداد میں اسی کے حامی ہیں۔ حقوق انسانی کے اعلانات اور منشور اسی نظریے کے ماتحت مرتب ہوئے اور جو دفعات وضع کی گئی ہیں وہ حقوق طبیعی کے مفروضہ سے حاصل شدہ نتائج ہیں ۔یعنی حقوق طبیعی وفطری کا مفروضہ ہے جس نے اعلان حقوق انسانی'' روپ دھارا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ مان ٹیسکیو ،اسپنسر وغیر عدلت کے بارے میں جو کچھ

کہتے ہیں بعینہ وہی بات ماہرین علم کلام (علم عقائد) ''حسن و قبح[1] عقلی'' کے ضمن میں کہتے رہے ہیں مسلمان علما میں کچھ لوگ ذاتی حقوق کے منکر اور عدالت کو معاہداتی چیز جانتے ہیں۔

یورپ والوں میں بھی یہ خیال موجود تھا، انگریز ''ھوبز'' عدالت کو ایک موجود حقیقت نہیں مانتا تھا۔

حقوق انسانی کا منشور فلسفہ قانون نہیں ہے

مضحکہ خیز بات یہ کہتے ہیں کہ: حقوق انسانی کے منشور کو حکومت کے دونوں ایوانوں[2] نے منظور کیا ہے--بات ہے عہد شاہی کی --اور چونکہ حقوق زن و مرد اس منشور کی ایک دفعہ ہے لہٰذا قانون تائید ہر دو ایوان کے مطابق عورت و مرد کو مساوی حقوق کا مالک ہونا چاہیے۔

شاید منشور حقوق انسانی قرارداد (مسودہ قانون) ہے اور اس میں صلاحیت ہے کہ دونوں ایوان اسے منظور یا نا منظور کر سکیں؟

---

[1] علم کلام و عقائد میں ایک بحث یہ ہے کہ اچھائی اور برائی عقلی بنیاد پر موجود ہے یا اسلام نے جسے اچھا کہا وہ اچھا ہے اور جسے برا کہا وہ برا ہے۔ یہی بحث عدل کے موضوع مین دبستان بناتی ہے۔ امامیہ و اشاعرہ و معتزلہ۔

[2] دونوں ایوانوں سے مراد اس وقت کی مجلس ملی اور سنا ہے۔ مدعی کہتے تھے کہ عورت مرد کے مساوی حقوق کا مسئلہ قابل بحث یوں نہیں ہے کہ سینٹ اور اسمبلی نے منشور حقوق انسانی اقوام متحدہ منظور کر لیا ہے اور اس میں مساوی حقوق موجود ہیں لہٰذا ''سول لا'' میں اگر غیر مساوی ہیں تو منسوخ مانے جائیں۔ شہید مطہری اس کا جواب دیتے ہیں کہ ''منشور'' میں تائید و مخالف ایواں کی ضرورت ہی نہیں وہ ایک فلسفیانہ اور مستقل دستاویز ہے۔

منشور حقوق انسانی ذاتی حقوق ہیں وہ نہ چھینے جاسکتے ہیں نہ خود آدمی انہیں کسی کو دے سکتے ہیں نہ نظرانداز کرسکے ہیں ایسے حقوق ہیں جن پر اس میں گفتگو کی گئی ہے اس منشور میں ایسے حقوق پر گفتگو ہے جو منشور کے دعوے کے مطابق انسانی حیثیت کے لوازم ہیں اور تخلیق کے توانا ہاتھوں نے انسان کیلئے معین کیے ہیں۔ یہ حقوق منشور کے دعوے کے مطابق اس نے انسانوں کو عطا کیے ہیں۔

انسان اس منشور کے حقوق اپنے لئے وضع نہیں کرسکتے نہ وہ اپنے اختیار سے سلب یا ساقط کرسکتے ہیں۔ دونوں ایوانوں کی منظوری یا قانون سازاداروں کی تائید کا تو سوال ہی نہیں۔

منشور حقوق انسانی فلسفہ ہے قانون نہیں ہے۔ اس کی منظوری فلسفیوں کو کرنا چاہیے نہ کہ اسمبلی کے نمائندوں کو دونوں ایوانوں کو یہ حق کہاں ہے کہ وہ اپنی اٹھک بیٹھکوں میں لوگوں کیلئے منطق و فلسفے وضع کریں۔ اور اگر ایسا ہے تو آئن اسٹائن کا فلسفہ اضافت بھی اسمبلی میں لائیں اور نمائندوں سے ووٹنگ کرائیں۔ آسمانی کروں میں فلسفہ حیات بھی منظور کرائیں۔ طبیعت کے قانون قراردادوں کی طرح منظور یا منظور نہیں ہوسکتے۔ جیسے ہم کہیں کہ دونوں ایوان نے اس قرارداد کے حق میں ووٹ دیا ہے کہ گلابی (ناشپاتی) کا سیب سے پیوند لگایا جائے تو پیوند لگ جاتا ہے اور اگر شہوت کے درخت میں اس کا پیوند لگایا جائے تو نہ لگے گا۔

جب اس قسم کے اعلان کسی ایسے گروہ کی طرف سے شائع ہوں جو مفکر اور فلسفی ہوں تو اقوام کو چاہیے کہ اس اعلان کو فلاسفہ اور مجتہدین کے سامنے رکھیں اور اگر اس قوم کے مفکرین و فلاسفہ کی رائے اس کے حق میں آجائے تو اس قوم کے تمام افراد پابند ہیں کہ ان حقائق کو قانون سے بالاتر سمجھیں قانون سازادارے بھی پابند ہیں کہ کوئی قانون اس کے خلاف وضع نہ کریں۔

دوسری قوموں کا معاملہ یہ ہوگا کہ جب تک خود ان کی رائے میں یہ ثابت نہ ہوجائے کہ واقعاً طبیعت میں یہ حقوق اسی طرح سے موجود ہیں اس وقت تک وہ اس کی پابندی کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ پھر یہ مسائل تجرباتی تو ہیں نہیں جن کیلئے وسائل اور لیبارٹری درکار ہو اور وہ آلات اور لیبارٹریاں صرف یورپ والوں کو میسر ہیں دوسروں کے پاس نہیں ہیں۔ ایٹم کو توڑنے اور اس کے دوسرے راز معلوم کرنے کی بات نہیں کہ یہ سب کچھ چند محدود افراد کے قبضے میں ہے۔ یہ فلسفہ و منطق کی بات ہے اور اس کے آلات ہیں مغز عقلا اور قوت استدلال۔

فرض کیجئے اگر دوسری قومیں مجبور ہوں اور فلسفہ و منطق میں وہ دوسروں کی تقلید کریں۔ اپنے اندر موزونیت اور فکر فلسفی کی کمی محسوس کریں تو ہم ایرانیوں کو تو یہ نہ کرنا چاہیے۔ ہم نے ماضی میں اپنی صلاحیتیں درجہ کمال پر دکھائی ہیں اور منطق و فلسفے کی چھان بین میں کام کئے ہیں۔ ہم فلسفے کے مسائل میں دوسروں کی تقلید کیوں کریں؟

مسلمان دانشوروں پر حیرت ہے کہ جہاں ''اصل عدالت'' اور انسان کی نجی حقوق کا نام آتا ہے وہ اس قدر اس کی اہمیت ماننے لگتے ہیں کہ چوں و چرا کے بغیر ''عقل وشر'' کی مطابقت کا اصول برتنے لگے ہیں اور فرماتے ہیں ''یہی حکم شرع ہے یعنی شرع تائید کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اب معاملہ یہاں تک آپہنچا ہے کہ ان مسائل کی تائید اسمبلی کے نمائیدوں سے طلب کی جاتی اور اس کی تائید ہوتی ہے۔

فلسفہ ''کوپن'' سے ثابت نہیں کیا جاسکتا

اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ ہم عورت کے حقوق انسانی کی تحقیق کیلئے لڑکوں اور لڑکیوں سے رجوع کریں کوپن (سوالنامہ) چھاپ کران سے جواب لکھوائیں اور اس کی روشنی میں نتیجہ نکالیں کہ انسانی حقوق کیا ہیں؟ کیا عورت

ومرد کے انسانی حقوق ایک جیسے ہیں یا دو طرح کے ہیں؟

بہر حال ہم عورت کے انسانی حقوق کا مسئلہ عملی و فلسفی اساس اور انسان کے ذاتی حقوق کی بنیاد پر دیکھیں گے اور یہ معلوم کریں گے کہ جن اصولوں کا یہ تقاضا ہے کہ تمام انسان کلی طور پر خدادادا ور طبیعی حقوق کے نقطہ نظر سے مشابہ (وضع) حالت رکھتے ہیں یا نہیں؟ میں ملک کے صحیح دانشوروں مفکروں اور قانون دان حضرات سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ہمارے دلائل کو تحقیق وتنقید کی نظر سے دیکھیں۔ کیونکہ ایسے حضرات ہی اس قسم کے مسائل میں اظہار رائے کی صلاحیت رکھتے ہیں انتہائی شکرگزاری کا باعث ہوگا اور یہ حضرات اپنی رائے دلائل کے ساتھ بیان فرمائیں۔ تائید میں ہو یا تردید میں۔

اس مدعا کی تہہ تک پہنچنے کیلئے پہلے انسانی حقوق کی اساس و بنیاد سے بحث کرتے ہیں۔ پھر عورت و مرد کے حقوق کو موضوع مطالعہ بنائیں گے۔

مناسب ہوگا اصل مطلب سے پہلے نئ صدی حقوق سے متعلق تحریکوں جو زن و مرد کے حقوق میں برابری کے نظریے پر تمام ہوئے اشارہ کروں۔

یورپ میں حقوق نسوان کی تاریخ پر ایک نظر

یورپ میں سترھویں صدی کے بعد انسانی حقوق کے نام سے نغمہ سنجی شروع ہوئی، سترھویں اٹھارویں صدی کے لکھنے والوں نے حیرت انگیز تسلسل سے اپنے افکار انسان کے طبیعی فطری اور نا قابل سلب حقوق پر پھیلانا شروع کیے جان جیکیو روسو والٹر اور ماٹیسکیو اس گروپ کے مفکر اور مصنف ہیں۔ انسانی حقوق طبیعی کے بارے میں افکار کی اشاعت کا عملی اثر یہ ہوا کہ انگلستان کی حکومت اور عوام میں رسہ کشی کا آغاز ہو گیا اور ۱۶۸۸ء میں قوم نے کچھ اپنے اجتماعی اور سیاسی حقوق ایک منشور کی صورت

میں پیش کیے اور انہیں حاصل کرلیا۔[۱]

اس مہم کا دوسرا بڑا نتیجہ، انگلستان کے خلاف امریکہ کی جنگ آزادی میں برآمد ہوا۔ شمالی امریکہ کے تیرہ استعماری علاقہ جہاں کے عوام نے سخت دباؤ اور شدید حملے کرکے بغاوت اور خودمختاری کا پرچم بلند کیا اور آخر میں اپنی آزادی حاصل کرلی۔

1776ء میں فلاڈیلفیا میں ایک کانفرنس ہوئی جہاں آزادی عام کے بارے میں ایک اعلان و منشور شائع کیا گیا اس کے مقدمے میں لکھا تھا۔

تمام افراد بشر خلقت میں یکساں ہیں۔ اور خالق نے سب کو مستقل اور ناقابل تبدیل حقوق عطا فرمائے ہیں جیسے زندگی کا حق اور آزادی کا حق حکومتوں کی تشکیل کی علت غائی (اور اصل غرض) مذکورہ حقوق کی حفاظت ہے اور اس کا اقتدار قوم کی پسند پر موقوف ہوگا۔[۲]

''منشور حقوق انسانی'' کے نام سے دنیا میں شہرت پانے والا اعلامیہ فرانس کے عظیم انقلاب کے بعد ''اعلان حقوق'' کے عنوان سے شائع ہونے والا ہی منشور ہے۔ اس اعلامیہ میں ایسے اصول کلیات ہیں جو فرانس کے آئین کے مقدمے میں لکھے گئے ہیں اور فرانس کے آئین کا ناقابل جدائی حصہ شمار ہوتے ہیں۔ یہ اعلامیہ ایک مقدمے اور سترہ دفعات پر مشتمل ہے۔

پہلی دفعہ ہے

---

[۱] ترجمہ تاریخ البراماہ ج 4 ص 266۔ مصنف نے البرٹ مالٹ کی نوول ہسٹری یونیورسل ''ALBERT MALETS NOVELLE HISTOIRE UNIVERCELLE

[۲] ''The Unanimous Declaration Of The Thirteen United States of Amarica جو جو 4 جولائی 1776ء کو منظور ہوا۔

افراد بشر آزاد پیدا ہوئے ہیں اور زندگی بھر آزاد رہیں گے اور حقوق میں ایک دوسرے کے برابر ہیں......[1]

انیسویں صدی میں اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کے بارے میں حقوق بشر کے مسئلہ پر نئے افکار ابھرے جن کے نتیجے میں سوشلزم اور محنت کش طبقے کی نفع میں قطعی شرکت اور سرمایہ دار کے ہاتھ سے مزدور کو حکومت منتقل کرنے کی بات سامنے آئی

بیسویں صدی کی ابتدا میں انسانی حقوق کے بارے میں جتنی بھی گفتگو ہوئی ہے اس کا پس منظر۔۔حکومتوں کے مقابلے میں قومی حقوق یا مزدور کو حکومت کش عوام اور حکمران و مالک ہیں۔

بیسویں صدی میں پہلی مرتبہ مردوں کے مقابلے میں ''عورت کے مزدور کو حکومت کش عوام اور حکمران و ملاک ہیں۔'' کا سوال اٹھا انگلستان وموکریسی میں قدیم ترین ملک تسلیم کیا جاتا ہے یہ ملک بیسویں صدی کے اوائل میں ''عورت ومرد کے مساوی حقوق'' کا قائل ہوا ہے۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ باوجود یکہ اٹھارھویں صدی میں اعلان آزادی کے ساتھ عام انسان حقوق کا اعتراض کر چکا تھا مگر سیاسی حقوق میں مرد وزن کی مساوات کا مسودہ 1920ء میں منظور کرتا ہے۔ فرانس نے بھی بیسویں صدی ہی میں یہ اصول مانا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ بیسویں صدی میں پوری دنیا میں متعدد گروپ ''عورت

---

[1] ''DECLARATION OF THE RIGHTS OF MAN AND OF CITIZEN'' یہ میثاق فرانسیسی قومی اسمبلی نے 1789ء میں آئین کے مقدمہ کے طور پر منظور کیا اور بعد میں تھامس پاس کے ذریعہ حقوق انسانی کے نام سے مشہور ہوا۔

ومرد‘‘ کے حقوق وفرائض کے بارے میں ایک بڑی اور گہری تبدیلی کے حق میں اٹھ کھڑے ہوئے ان لوگوں کا خیال ہے کہ قوموں کے تعلقات حکومتوں سے محنت کشوں کے تعلقات مالکوں سے مزدووں کے تعلقات سرمایہ داروں سے اس وقت دگرگوں نہیں ہوسکتے جب تک مردوزن کے حقوق وتعلقات میں اصلاحات رونما نہیں ہوتے نہ اس کے بغیر معاشرتی انصاف قائم ہوسکتا ہے۔

اسی لئے انسانی حقوق کا منشور 1948ء جنگ عظیم دوم کے بعد ادارہ اقوام متحدہ نے شائع کیا اس کے مقدمے میں درجہ ہے:

’’چونکہ امریکہ متحدہ کے عوام نے انسانی حقوق اور فرد انسانی کی قدروقیمت اور حقوق مردوعورت کی برابری کا ایک بار پھر اعلان کیا ہے۔[۱]

انیسویں اور بیسویں صدی کی مشینی (صنعتی) انقلاب کاری گروں اور مزدوروں خاص کر عورتوں کی غربت سب سے بڑا سبب بنی کہ موضوع حقوق خواتین پر توجہ دی جائے تاریخ البرٹ مالٹ میں ہے:

ایک مدت تک حکومت نے مزدوروں کے حالات اور کارکنوں کے مسائل پر دھیان نہیں دیا سرمایہ دار جو چاہتے تھے وہ کرتے رہے ......کارخانہ وار عورتوں اور کم سن بچوں کو بڑی تھوڑی تھوڑی مزدوریوں پر رکھ لیتے تھے کام کا وقت زیادہ ہونے سے اکثر لوگ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے اور جوانی میں مرجاتے تھے۔[۲]

---

[۱] بین الاقوامی منشور حقوق انسانی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 10 دسمبر 1948ء کو منظور کیا۔

[۲] نیول ہسٹری یونورسل ج4 ص587

یورپ میں انسانی حقوق کی تحریک کا یہ مختصر سا تاریخی جائزہ تھا انسانی حقوق کے تمام منشوروں میں جو مطالب ہیں وہ اہل یورپ کے لئے نئے ہیں لیکن ہمیں علم ہے کہ اسلام میں چودہ صدی پہلے یہ بتایا جا چکا تھا اور کچھ عرب اور ایرانی دانشوران اعلامیوں کے تقابلی مطالعے میں یہ بات کر چکے ہیں اور کتابوں میں لکھ چکے ہیں۔ ہاں اعلامیے اور اسلام کے ضوابط میں کہیں کہیں اختلاف ہیں اور یہ بحث بڑی خوش گوار و دل کش ہے ان مسائل میں ایک مسئلہ حقوق زن و مرد کا مسئلہ ہے اسلام مساوات کا قائل ہے۔ اور مشابہت و یکسانیت اور اکائی کو ''حقوق زن و مرد'' میں تسلیم نہیں کرتا۔

انسان کی حیثیت اور حقوق

چونکہ افراد خاندان بشری کے تمام افراد کی ذاتی حیثیت کی پہچان اور ان کے ناقابل تبدیل (و انتقال) و یکساں حقوق آزادی و عدالت اور صلح کی بنیاد مہیا کرتی ہے۔

چونکہ پہچان نہ ہونے اور حقوق بشری کے حقوق کی تحقیر وحشیانہ عمل پر تمام ہوتی ہے جو روح بشریت کو سرکشی پر ابھارتی ہے اور ایسی دنیا کا وجود جس میں تمام افراد بشر اپنے عقیدے کے اظہار میں آزاد ہوں خوف اور غربت سے مطمئن ہوں انسانی آرزوں کی بلند ترین دنیا کا اعلان کیا جاتا ہے۔

چونکہ اساسی طور پر حقوق انسانی کو نفاذ قانون کے ذریعے حمایت کی جاتی ہے۔ تا کہ انسان ظلم اور دباؤ کے خلاف آخری علا کیلئے اٹھنے پر مجبور نہ ہو۔

چونکہ اساسی طور لازم ہے قوموں میں باہمی دوستانہ تعلقات کو پھیلایا جائے (لہٰذا) اس بات کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔

چونکہ اقوام متحدہ کے عوام نے انسانی بنیادی حقوق اور فرد انسان کی قدر ومنزلت اور عورت و مرد کے حقوق کی برابری کا پھر سے اعلان کیا ہے اور پختہ ارادہ کیا ہے اجتماعی ترقی میں مدد کریں گے اور اچھے ماحول میں زندگی کی شکل صورت بہتر بنائیں گے۔

چونکہ............

عام اجلاس اس اعلامیہ جہان حقوق بشر کو تمام عوام اور تمام اقوام کی مشترک تمنا کے طور پر اعلان کرتا ہے تا کہ تمام افراد اور معاشرے کے تمام ارکان اس اعلانیے کو ہمیشہ نظر کے سامنے رکھیں اور پوری کوشش کریں کہ تعلیم وتربیت کے ذریعے ان حقوق اور آزادیوں کے احترام کا دائرہ وسیع ہو اور قومی، نیز بین الاقوامی تدریجی کوششوں سے ان اقدار کی پہچان اور ان کا واقعی اور زندہ نفاذ خود ممبر قوموں اور ان کے مما لک میں رہنے والے عوام میں وجود پذیر ہو۔

مندرجہ بالا سنہری فقرے انسانی حقوق کے بین الاقوامی (پوری دنیا کیلئے) اعلامیے کے مقدمے میں درج ہیں یہ وہی اعلامیہ ہے جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

''سب سے بڑی کامیابی ہے جو آج کی تاریخ تک انسانی حقوق کی تائید میں عالم بشریت کو نصیب ہوئی ہے۔''

اس کا ہر جملہ سوچا سمجھا ہے۔ جیسا کہ سابقہ مقالے میں لکھ چکا ہوں کہ یہ جملہ صدیوں کے فلاسفہ اور آزادی طلب اور قانون دانان عالم کے افکار کی نمائندگی کرتے ہیں۔

منشور حقوق انسانی کے اہم نکات

منشور، تیس دفعات میں مرتب ہے اس سے قطع نظر کہ بعض دفعات کچھ مطالب مکرر یا کم از کم بعض دفعات میں بیان شدہ مطالب دوسری جگہ کے بیان کردہ

مطالب سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔ یا کچھ مطالب ایسے بھی ہیں جن کو الگ پیراگراف میں ہونا چاہیے تھا۔

اس مقدمے کے چند اہم نکات ایسے ہیں جن پر توجہ کرنا ضروری ہے:

ا۔حیثیت احترام اورنا قابل انتقال ذاتی حقوق میں انسان ایک ہی نوع سے بہرہ مند ہے۔

۲۔انسان کی حیثیت احترام اور ذاتی حقوق، کلی اور عمومی ہیں جو تمام انسانی افراد کو آغوش میں لیتے ہیں ان میں تفریق نہیں ہے۔سفید وسیاہ، بلند اور پستہ قد زن ومرد سب ان میں برابر کے حصہ دار ہیں جیسے خاندان کے تمام ممبروں میں سے کسی ایک کو اپنے نسب میں دوسروں پر فوقیت اور اعزاز ونجابت جتانے کا حق نہیں، اسی طرح تمام افراد بشر ایک بڑے خاندان کے ممبر اور ایک جسم کے اجزا ہیں، شرافت واعزاز میں برابر ہیں۔ کوئی شخص اپنے تئیں دوسرے فرد سے زیادہ معزز سمجھنے کا حق نہیں رکھتا۔

۳۔آزادی وصلح وعدالت کی اساس یہ ہے کہ تمام افراد دل کی گہرائیوں سے تمام انسانوں کی حیثیت اور ذاتی احترام کی واقعیت پر ایمان رکھیں اور اعتراف کریں۔

یہ اعلامیہ کہنا چاہتا ہے:

تمام افراد جو ایک دوسرے کے خلاف بے چینیاں پھیلاتے ہیں۔ ان کا سرچشمہ دریافت کرلیا گیا ہے لڑائیوں کا پھیلنا ظلم اور دست درازیوں کا ہونا اور ایک دوسرے کے خالف وحشیانہ کارگزاریوں کا مرکزی نقطہ انسان کے ذاتی احترام اور اس کی حیثیت سے نا آشنائی ہے۔ چند افراد کی یہ نا آشنائی (ناواقعیت) اپنے حریف کو سرکشی اور نافرانی پر ابھارتی ہے اسی سبب سے صلح وامن کی راہ خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

۴۔سب کو مل کر جس بلند ترین آرزو کے حصول کی جدوجہد کرنا چاہیے وہ ایک ایسی دنیا کی تخلیق ہے جس میں عقیدہ دامن اور مادی خوش حالی مکمل طور پر موجود ہو گھٹن ،خوف اور افلاس کی جڑیں اکھڑی ہوئی ہوں اس تمام کو روبراہ لانے کیلئے اعلامیے کے تیس دفعات مرتب کیے گئے ہیں۔

۵۔انسان کی ذاتی حیثیت پر یقین اور نا قابل سلب وانتقال حقوق کا احترام تعلیم وتربیت کے ذریعے تمام انسانوں میں پیدا کیا جائے۔

مقام واحترام انسان

حقوق انسانی کا منشور چونکہ احترام انسانیت وآزادی ومساوات کی بنیاد پر مرتب وانسانی حقوق کا احیا کی خاطر وجود پذیر ہوا ہے۔اس لئے ہر صاحب وجدان (واحساس) انسان کیلئے احترام وعزت کے لائق ہے۔ ہم مشرق کے باشندے مدتوں سے انسان کی قدر واحترام کا دم بھر رہے ہیں جیسا کہ سابقہ مقالہ میں کہہ چکا ہوں۔دین مقدس اسلام میں انسان حقوق انسان آزادی اور باہمی برابری کی بڑی قیمت اور احترام ہے۔اس منشور کے لکھنے والے اور وہ فلسفی حضرات جو حقیقی طور پر اس فکر کے خالق اور لکھنے والوں کو اشار دینے والے ہیں۔ ہمارے احترام وتعظیم کے لائق ہیں لیکن چونکہ یہ متن ایک فلسفیانہ اعلان ہے ،فرشتے نہیں انسانوں کے ہاتھوں سے لکھا گیا ہے انسانی افراد نے استنباط (حاصل فکر پیش) کیا ہے۔لہٰذا ہر فلسفی کو حق ہے وہ اس کا تجزیہ وتحلیل کرے اور اگر اتفاقاً کہیں کمزوری نظر آئے تو اس کی یاددہانی کرائے۔

یہ اعلامیہ/منشور کمزور مقامات سے خالی نہیں مگر ہم اس مقالے میں کمزور نکات کے بجائے نقطہ قوت پر انگلی رکھیں گے۔

اس منشور کا سارا زور انسان کے ذاتی مقام پر ہے شرافت اور انسان کی ذاتی حیثیت اس اعلامیہ کے نقطہ نظر سے انسان ایک نوع ہونے کے ناتے خصوصی کرامت وشرافت اور حقوق اور آزادیوں کے ایک سلسلے کا براہ راست مالک ہے جب کہ دوسرے جاندار اس ذاتی حیثیت وشرافت وکرامت نہ رکھنے کی وجہ سے ان حقوق اور آزادیوں سے بہرہ ور نہیں ہیں۔اس اعلامیہ کا نقطہ قوت یہی ہے۔

مغربی فلسفوں میں انسان کا تنزل اور گراوٹ

اب یہاں پھر ایک مرحلہ آگیا ہے کہ ہم دوبارہ اسی پرانے فلسفی مسئلہ توجہ مبذول کریں۔انسانی قدر و قیمت کی دریافت پوری مخلوقات کے مقابلے میں انسان کی شرافت ومقام انسان کی قابل احترام شخصیت آیئے پوچھیں:

انسان کی وہ ذاتی حیثیت کیا ہے جس کی بنیاد پر وہ ان حقوق کا مالک بن گیا اور گھوڑے گائے اور بکری اور کبوتر سے ممتاز ہو گیا؟

یہاں منشور حقوق انسانی اور مغربی فلسفے میں انسانی قیمت کی دریارفت کے درمیان اساسی تناقض (ایک دوسرے کی مخالفت) کھل کر سامنے آتی ہے۔

مغربی فلسفے میں برسوں سے انسان اپنی قیمت واعتبار کھو چکا ہے۔گزشتہ باتوں میں انسان اور اس کے مرتبہ بلند کے بارے میں جو کچھ کہا گیا اس کی جڑیں سرزمین مشرق میں تھیں آج یہ باتیں مغرب کے اکثر فلسفی نظاموں میں مذاق اور توہین کی نظر سے دیکھی جارہی ہیں۔

ایک یورپین کی نظر میں انسان مشین کی حدتک پستی میں آگیا ہے۔اس کی روح اور اصالت مقام انکار میں واقع ہو چکی ہے کسی علت غائی مقصد تخلیق اور طبیعت کے معین مقصود کا عقیدہ رجعت پسند سمجھا جاتا ہے۔

مغرب میں انسان کے اشرف مخلوقات کے نام کا دم نہیں بھر سکتے کیونکہ یورپ کے عقیدے میں انسان کا اشرف مخلوقات ہونا تمام مخلوقات کا انسان کا طفیلی ہونا ساری دنیا کا مسخر انسان ہونا۔ بطلیموس کے اس پرانے فلسفے کی بات ہے جو غلط ہو چکا، زمین و آسمان کی ہیئت آسمان کی مرکزیت اور آسمانی کروں کا زمین کے گرد گھومنا سب باطل ہوگا تو اب انسان کے اشرف مخلوقات ہونے کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔ یورپ کی نظر میں یہ انسان کی خود پسندی تھی جو اس دور میں انسان کے دماغ میں سمائی تھی۔ آج کا انسان عاجزی اور انکساری اختیار کر چکا ہے، دوسرے موجودات کی طرح وہ اپنے وجود کو ایک مٹھی بھر خاک سے زیادہ نہیں جانتا۔ خاک سے نکلا خاک میں مل کر ختم ہو جائے گا۔

یورپ کا انسان ''عاجزانہ'' طور پر روح کو وجود انسانی کا مستقل پہلو نہیں مانتا وہ اپنے وجود اور گھاس پھوس اور حیوان میں اس جہت سے فرق کا قائل نہیں ہے یورپ کا انسان فکر و عمل روح اور پتھر کے کوئلے کی گرمی میں ماہیت و جوہر کے اعتبار سے فرق نہیں کرتا، وہ سب کچھ مادے اور انرجی کا کرشمہ جانتا ہے۔ یورپ کے انسان کی رائے میں زندگی کا میدان تمام جاندار مخلوق کیلئے۔ جن میں وہ خود بھی ہے۔ خونی میدان ہے۔ جسے زندگی نے ختم نہ ہونے والی جنگ سے وجود بخشا ہے۔ تمام جان رکھنے والی مخلوق ہر ایک اصل (کلیہ) حکمراں ہے اور وہ اصل تنازع للبقا ہے۔ انسان مسلسل کوشش کر رہا ہے کہ اس جنگ سے خود کو بچا لے عدالت نیکی و تعاون، اور خیر خواہ جیسے بہت کے اخلاقی اور انسانی مفہوم اسی ''بنیادی اصل'' تنازع للبقا کے پیدا کردہ ہیں۔ انسان نے ان مفاہیم کو اپنی جگہ بچانے کیلئے خود وضع کیا ہے۔

کچھ طاقت ور مغربی فلسفیوں کی رائے میں انسان مشینی ہے جسے صرف اقتصادی منافع چلاتے ہیں دین و اخلاق، فلسفہ و علم و ادبیات و ہنر سب کچھ اوپر کی

لیپا پوتی ہے۔ اس کے نیچے پیداوار تقسیم دولت کا ہیر پھیر ہے یہ تمام جلوے اور زندگی کے مظاہرے انسانی زندگی کے اقتصادی پہلو ہیں۔

نہیں جناب انسان کیلئے یہ بھی بہت زیادہ ہے اصل محرک اور تمام حرکات اور عمل کی گردش کا بنیادی عامل تو جنسی خواہش ہے۔ اخلاق و فلسفہ علم و دین و ہنر سب لطیف تجلیاں اور مظاہرے ہیں انسان کے وجود عامل تو جنسی احساس ہے۔[1]

سمجھ میں نہیں آتا۔

اگر طے ہے کہ مخلوقات کو بے مقصد مانیں اور طبیعت اندھوں کی طرح عمل کر رہی ہے یہی عقیدہ بنالیں۔

اگر انواع جاندار مخلوق کی زندگی کی ضمانت کا قانون صرف ''تنازع للبقا'' ہے بہتر سے بہتر کا انتخاب ہے۔ باقی سب تبدیلیاں مکمل طور پر اتفاقی ہیں انسان کی بقا اور موجودیت اتفاقی و بے مقصد تبدیلیوں کے سبب ہے کئی ملین برسوں سے اس کے اجداد نے دوسری انواع مخلوق پر جرموں کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اور اب تک وہ سلسلہ موجودہ صورت میں چل رہا ہے یہی فلسفہ صحیح ہے؟

اگر یہ ماننا ضروری ہے کہ انسان ان مشینوں کا نمونہ ہے جو اب وہ خود اپنے ہاتھوں بنا رہا ہے۔

اگر یہی مان لیا گیا ہے کہ روح کا یقین اصالت اور اس کی بقاء کا عقیدہ خودخواہی و خود پسندی اور اپنے بارے میں غیر معمولی مبالغہ ہے۔

---

[1] فرائڈ کے فلسفہ جنسیت کی طرف اشارہ ہے فرائڈ آرٹ کی سب قسمیں حتی بچے کے دودھ پینے کے عمل سے بڑھاپے تک وہ ہر مرحلے میں جنسیت ہی محسوس کرتا ہے اور اس کے بعد دوسرے فلسفی کلیات و نتائج جدید مفکروں کے مسلمات اور یورپ کی فکری نظام کی موجودہ حد بندی کرنے والے ہیں۔

اگر ثابت ہو چکا ہے کہ انسان میں اصل محرک اقتصادی یا جسنی یا بلادستی کا جذبہ ہے۔

اگر بنیادی بات یہی ہے کہ نیک و بد اچھائی اور برائی مجموعی طور پر اضافہ ہیں اور فطرت و وجدان کی آواز مہمل خیال ہے۔

اگر انسان جنس کے لحاظ سے شہوت اور خواہشات نفسانی کا غلام ہے اور قوت کے علاوہ کسی کے سامنے سر نہیں جھکاتا۔

اگر..................

اس کے بعد انسان کی حیثیت اور شرافت اور نا قابل سلب حقوق۔ اور انسان کی قابل احترام شخصیت کا دم بھرنا اور اس کو تمام اقدامات کا نصب العین ومقصد بنانا کیسے ممکن ہے۔

مغرب انسان کے بارے میں تضاد و تناقض سے دو چار ہے

مغربی فلسفے سے جہاں تک ہوسکتا تھا اس نے انسان کی ذاتی حیثیت کو نقصان پہنچایا اور انسانیت کا مقام تحت الثری تک پست کیا۔ایک طرف کو تو مغرب کا فلسفہ،تخلیق انسان اور اس کے وجود کی علت وغرض کے زاویے سے۔ اس کی تخلیق میں کارخانہ تخلیق کے عمل کے زاویے سے۔اس کے ڈھانچے اور اس کے وجود کے تانے بانے اور ہستی کے زاویے سے۔اس کے محرکات عمل کے نقطہ نظر سے۔اس کے وجدان وضمیر کے لحاظ اس حد تک نیچے گرایا جس کا کچھ تذکرہ ہم نے کیا۔

اس کے بعد ایک قدآور اعلان شائع کیا جس میں انسان کی قیمت اس

کا مقام حیثیت اور کرامت وذاتی شرافت اور مقدس حقوق نا قابل تبدیلی اور نا قابل سلب اختیارات کا ڈھول بجایا گیا۔اس فرمان میں تمام افراد بشر کو دعوت دی گئی کہ اس منشور پر ایمان لائیں۔

مغرب پر فرض تھا، پہلے وہ انسان کی جو تشریح کر چکا ہے اس پر نظر ثانی کرے اس کے بعد بلند بالا اعلامیہ حقوق مقدس فطری انسان صادر کرے۔

میں یہ مانتا ہوں سب مغربی فلسفی انسان کی وہی تشریح نہیں کرتے جس کا میں نے تذکرہ ہے۔ بہت سے حضرات کم وبیش انسان کی وہ تعبیر بھی کرتے ہیں جو مشرق والے کرتے ہیں ۔مگر میری نظر اس اندازفکر پر ہے جس نے مغرب کی اکثریت کو متاثر کیا ہے اور جس سے دنیا بھر کے عوام متاثر ہو رہے ہیں۔

انسانی حقوق کا منشور اسے صادر کرنا چاہیے۔ جو انسان کو ایک مادی مرکبات سے تیاز شدہ مشین سے بلندتر درجے پر فائز جانتا ہو۔ جو انسان کے محرکات اور ارادوں کو حیوانی اور شخصی رجحانات کو مجموعہ نہ مانتا ہو۔ جو انسان کیلئے انسانی وجدان کا قائل ہو۔ اعلامیہ بشر مشرق کو صادر کرنا چاہیے جو قانون ۔اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ط [1] میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں۔ پر ایمان رکھتا ہو۔ اور انسان میں خدائی جلوے ڈھونڈھتا ہے۔

حقوق انسانی کا نعرہ اسے لگانا چاہیے جو انسان کے سیر وسفر کیلئے ایک منزل کا قائل ہو اور یہ مانتا ہو کہ انسان اس منزل کیلئے راستے کی مشقتیں جھیلنا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ ۝۶

اے انسان! تو اپنے رب کی حضوری کیلئے کوشش کر رہا ہے تو ایک نہ ایک

---

[1] البقرہ/30

دن اس کے سامنے حاضر ہوگا۔(الانشقاق۔6)

انسانی حقوق کا منشور شائع کرنے کا حق انسان نظام فلسفہ کو حاصل ہے جو قانون ''وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا۪ۙ۝۷ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا۪ۙ۝۸ کا قائل۔اورقسم ہے جان کی اورجس نے اسے ہموار بنایا، پھراس کی بدکاری اور پرہیزگاری اسے سمجھائی۔[1] جوانسان میں بھلائی کی رجحانات مانتا ہو۔

انسانی حقوق کا منشور جاری کرنے کا اسے حق ہے جو انسانی سرشت کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہو۔اوراس کی سرشت کو معتدل ترین و کامل سمجھتا ہو کہ۔لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ۝۴ یہی مطالبہ کرتا ہے ۔یعنی ہم نے انسان کو بہترین اندازے پر بنایا ہے۔[2]

مغربی طرز فکر کے شایاں شان بات منشور حقوق انسانی نہیں ہے کہ وہ انسان کی یہ تشریح کرتے ہی نہیں۔ان کو تو وہ طور طریقے جاری کرنا چاہیے جسے مغربی عملی طور پر انسان کیلئے جائز سمجھتا ہے یعنی انسانی احساسات کا قتل عام، سرمایہ داری کی بے پناہ قوت انسان پر دولت کی برتری، مشین کو معبود سمجھنا ثروت کی خدائی انسانوں سے بیگار ۔حالت یہ ہے کہ اگر اتفاقاً ایک ملیونر اپنی کڑوڑوں کی جائداد اپنے بعد اپنے کتے کے نام لکھ جائے تو اس کتے کا اعزاز آدمی زاد سے بڑھ جاتا ہے دولت مند کتے کیلئے نہ معلوم کتنے آدمی پیشکار ونوکر کی طرح حاضر رہتے ہیں۔منشی سپرانٹنڈنٹ نوکر رکھے جاتے ہیں اور دست بستہ لوگ اس کے سامنے حاضر رہتے اور تعظیم کرتے ہیں۔

---

[1] الشمس۔7/ 8

[2] التین/4

مغرب نے خود کو بھی بھلا دیا اور خدا کو بھی

انسانی معاشرے کا ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ انسان نے بہ تعبیر قرآن ''خود'' کو بھی بھلا دیا ہے اور خدا کو بھی بڑی بات یہ ہے کہ ''خود'' کی توہین کی ہے درون بینی اور ''ضمیر و باطن'' سے توجہ ہٹالی حسی اور مادی دنیا میں اپنی نظر کو محدود کر دیا، مدیات کا مزہ چکھنے کے علاوہ کوئی مقصد نہ دیکھتا ہے نہ سوچتا ہے، خلقت کو بے مقصد سمجھتا ہے خود اپنا انکار کر رہے اپنی روح ہاتھ سے دے بیٹھا ہے۔ آج کے انسان کی اکثر بدنصیبوں کا سرچشمہ یہی انداز فکر ہے۔ افسوس کہ یہ سوچ دنیا پر چھائی جا رہی ہے۔ انسان کے بارے میں اس انداز فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمدن جس قدر پھیلتا اور عظیم تر ہوتا جاتا ہے متمدن اسی قدر حقارت میں گرتا جا رہا ہے۔ انسان کے بارے میں یہ طرز تفکر موجب ہوا کہ واقعی انسان ہمیشہ ماضی میں تلاش کیا جائے اور آج کے تمدن کے بڑے کارخانے کی دست رس میں ہے کہ ہر اعلی درجے کی چیز تیار کر دے۔ بس انسان نہیں بنا سکتی۔

گاندھی کہتے ہیں:

''یورپ والے زمین کی خدائی کا لقب حاصل کرنے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے زمین کی تمام نعمتیں اور ان کے امکانات قبضے میں کر لیے اور ان کے مالک بن بیٹھے، دوسری قومیں اسے خدا کی قدرت سمجھ بیٹھیں لیکن اہل یورپ ایک چیز سے عاجز رہے اور وہ اپنے اندر تامل کرنا ہے، جھوٹے نئے تمدن کی جھلک چمک کو مہمل سمجھنے کیلئے اتنی ہی دلیل کافی ہے۔

اگر مغربی تمدن نے اہل مغرب کو شراب نوشی اور جنسی عمل پر اکسایا ہے تو اس کا سبب ''خود تلاشی'' کو بھلانا اور ضائع کرنا ہے۔

اس کی عملی قوت نے اسے انکشاف، ایجاد اور وسائل جنگی تیار کرنے پر اس لئے ابھارا کہ وہ ''اپنے آپ'' سے فراری ہے۔ اسے غیر معمولی قدرت اور تسلط اپنے اوپر باقی نہیں رہا۔۔تنہائی اور خاموشی سے خوف، دولت سے وابستگی نے مغربی انسان کو اندر کی صدا سننے سے معذور بنا دیا، اس کی مسلسل عمل و کارکردگی کا ایک محرک یہی ہے۔ دنیا فتح کرنے کی ہوس کا باعث ہے ''اپنے اوپر حکومت'' نہ کر سکنے کی ناتوانائی ہے۔ اسی بنا پر مغرب کا انسان پوری دنیا میں بحران وفساد پھیلا رہا ہے............آدمی جب اپنی روح کھودے تو عالم کی فتح اس کے کس مرض کی دوا ہوگی............جن لوگوں کو انجیل نے یہ تعلیم دی کہ وہ حقیقت، محبت اور صلح کے مبشر بنیں وہ لوگ سونے اور غلاموں کی جستجو میں سرگردان ہیں۔ خداوند کی بادشاہی میں انجیل کی تعلیم کے مطابق بخشش وعدالت حربہ استعمال کرتے ہیں۔ کلام الٰہی شائع کرنے کے بجائے قوموں کے سروں پر بم برساتے ہیں............''

اسی سبب سے انسانی حقوق کا منشور دوسروں سے زیادہ بڑھ چڑھ کر خود اہل یورپ نے ٹھکرایا جو فلسفہ اہل مغرب نے عملی زندگی میں اپنا رکھا ہے اس کے بعد خود اہل مغرب کیلئے سوائے منشور حقوق انسانی، غلط قرار دینے کے اور کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔

چھٹا حصہ

عائلی حقوق کی فطری بنیادیں

کتاب خلقت انسان کے اصلی حقوق پہنچوانے کی تنہا سندی کتاب حوالہ ہے؟

''مدنی'' معاشرے میں باہمی قرارداد کا پہلو اور عائلی معاشرے میں فطری پہلو کا غلبہ ہوتا ہے۔

عائلی حقوق میں چار زمانوں کا مفروضہ، سوشلزم کے مفروضہ مالکیت کی تقلید سے پیدا ہوا ہے۔

کیا میاں بیوی دو حقوقی فطرتیں رکھتے ہیں؟

(خلاصہ مطالب از مؤلف)

عائلی حقوق کی فطری بنیادیں (۱)

انسانی حقوق کا منشور اس بنیاد اور روح پر قائم ہے کہ انسان ایک نوع کی حیثیت اور ذاتی شخصیت کی بنا پر قابل احترام ہے اور عین خلقت و آفرینش میں، حقوق اور آزادیوں کا ایک سلسلہ اسے عطا کیا گیا ہے جنہیں اس سے نہ چھینا جا سکتا ہے نہ بدلا جا سکتا ہے۔ ہم اس پر گفتگو کر چکے۔

یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ اس روح و اساس کو اسلام کی تائید حاصل ہے اور مشرقی فلسفے بھی اس کے حق میں ہیں۔ اس منشور کی روح و اساس سے جو بات جوڑ نہیں کھاتی اور سے بے بنیاد ظاہر کرتی ہے، وہ مغربی فلسفوں کی وہ بہت سی تشریحیں ہیں جو انسان اور اس کی ہستی کے تانے بانے کے بارے میں کی جاتی ہیں۔

یہ بات دلیل کی محتاج نہیں کہ انسانی حقوق پہچاننے کیلئے فقط ایک کتاب ایسی ہے جو حوالہ بننے کی پوری گنجائش رکھتی ہے اور وہ ہے آفرینش کی بیش بہا کتاب اس عظیم کتاب کے صفحے صفحے اور سطر سطر میں انسانوں کے اصلی حقوق مشترک اور زن و مرد کے ایک دوسرے کے مقابلے میں حقوق کے خدوخال پہچانے جا سکتے ہیں۔

تعجب ہے، بعض سادہ دل کسی طرح تیار نہیں کہ اس عظیم کتاب حوالہ کو سندی درجہ دین۔ ان لوگوں کے نزدیک حوالے کی تنہا صلاحیت و سندیت ان لوگوں کو حاصل ہے جنہوں نے ''منشور'' کی تیاری میں حصہ لیا اور آج سارے جہاں کی قیادت وحکومت کے مدعی ہیں۔ چاہے وہ خود اس اعلامیے کے دفعات کی پابندی نہ کریں۔ دوسروں کو بہرحال یہ حق نہیں ہے کہ ان کی بات میں چون و چرا کریں۔ لیکن ہم انہیں ''حقوق انسانی'' کے حوالے سے ''چون و چرا'' کا حق رکھتے ہیں اور تخلیق کے عظیم

کارخانے کو اللہ کی بولتی کتاب جانتے اور اسی کو اکیلا سندی حوالہ مانتے ہیں۔

محترم قارئین!

معذرت خواہ ہوں، مقالات کے سلسلے میں کچھ مسائل ایسے آ گئے جن میں فلسفے کا رنگ اور ذرا خشکی محسوس ہوتی ہوگی ممکن ہے بعض حضرات اس سے تھکن بھی محسوس کرتے ہوں، میں حتی الامکان ایسے مسائل سے پہلو بچاتا ہوں لیکن مسائل حقوق خواتین کے ذیل میں کچھ خشک فلسفیانہ بحثوں کا آنا ضروری اور ان سے بچنا ممکن نہیں تھا۔

طبیعی حقوق اور طبیعت کی مقصدیت میں ربط

ہمارے نزدیک طبیعی و فطری حقوق وہاں سے پیدا ہوتے ہیں جہاں قوت تخلیق نے اپنی روشن نگاہی اور مقصدیت کے پیش نظر موجودات کو ان کمالات کی طرف رواں کیا ہے جن کی صلاحیت ان کے وجود میں ودیعت فرمائی ہے۔

ہر فطری صلاحیت ایک طبیعی حق کی بنیاد ہے اور اسے ایک ''طبیعی سند'' حاصل ہے۔ مثلاً انسان کا بچہ پڑھنے اور اسکول جانے کا حق رکھتا ہے بکری کے بچے کو یہ حق حاصل نہیں، کیوں؟

کیونکہ انسان کے فرزند میں سبق پڑھنے اور دانشور بننے کی صلاحیت ہے اور وہ انسان کا فرزند ہے۔ لیکن بکری کے بچے میں یہ صلاحیت نہیں ہے۔

قوت تخلیق نے وجود انساں میں اس مطالبے کی دستاویز رکھی ہے اور وجود گوسفند میں یہ دستاویز نہیں رکھی۔

سوچنے، ووٹ دینے آزاد ارادہ رکھنے کا حق بھی اسی طرح ہے۔

کچھ لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ ''فطری حقوق'' کا مفروضہ اور یہ کہ خلقت

و پیدائش نے انسان کوایک قسم کے حقوق سے خصوصیت دی ہے ۔گھٹیا دعوی اور خود پسندی کی بات ہے۔اس مفروضہ کودور کردینا چاہیے۔ انسان وغیر انسان میں حقوق کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔

نہیں ، بات یوں ہی نہیں ۔فطری صلاحیتوں میں اختلاف ہے ۔قوۃ خلاقہ (خالق اکبر) نے انواع موجودات میں ہر قسم کی ایک دائرہ حرکت دیا ہے اس کو اسی قسم کی سعادت عطا کی ہے وہ موجود اپنے مدار میں حرکت کرتا ہے۔قوت تخلیق نے بھی ایک غرض معین کی ہے ۔ یہ دستاویز اتفاق اور بے خبری کے عالم میں ان موجودات کے ہاتھ میں نہیں دی گئیں ۔

معاشرتی حقوق

تمام افرادانسانی خاندانی (عائلی)حقوق کے علاوہ اجتماعی (معاشرتی) حقوق کے مالک ہیں انسان خاندان کے دائرے سے نکل کرایک بڑے معاشرے میں ایک دوسرے کے مقابلے میں کچھ حقوق پیدا کرتے ہیں ۔ یہ حقوق مساوات کی بنیاد اور مشابہ صورت حال کی وجہ سے مساوی حقوق بھی رکھتے ہیں اور مشابہ حقوق بھی رکھتے ہیں۔یعنی ان کے ابتدائی فطری حقوق ایک دوسرے کے برابراورایک دوسرے کے مانند ہیں۔ سب کوایک جیسا حق ہے کہ کائنات کے انعامات سے فائدہ اٹھائیں ۔سب کومماثل حق حاصل ہے کام کریں سب کومماثل حق ہے زندگی کے میدان میں ہونے والی دوڑ میں شرکت کریں اورآگے بڑھیں سب کو برابر کا حق ہے کہ سماجی منصبوں میں سے جس منصب کیلئے چاہیں اپنا نام پیش کریں، پھراسے حاصل کرنے کے واسطے جائز طریقے استعمال کریں سب کو برابر کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی علمی وعملی صلاحیتوں کوظاہر کریں۔

ہاں یہی ابتدائی فطری حقوق کی مساوات آہستہ آہستہ اکتسابی اور عملی حقوق میں غیر مساوی حقوق کی صورت پیدا ہونے لگتی ہے۔ یعنی سب کو برابر کا حق ہے کام کریں زندگی کی دوڑ میں مقابلہ کریں مگر جیسے ہی اس مقابلے میں ذمے داری ادا کرنے اور مقابلے میں حصہ لینے کا مرحلہ آتا ہے، پھر مقابلے میں سب دریا سے ایک طرح نہیں نکلتے کچھ لوگوں کی صلاحیتیں زیادہ ہیں کچھ کی کم ہیں۔ بعض زیادہ کام کرنے والے ہیں کچھ کم بعض زیادہ علم رکھنے والے ہیں زیادہ باکمال ہیں، بڑے ہنرمند ہیں زیادہ کارآمد ہیں زیادہ لائق ہیں۔ قہری نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے حاصل کردہ حقوق غیر مساوی ہوں گے اور اگر ہم ان کے حاصل کردہ حقوق کو ابتدائی فطری حقوق کی طرح مساوی حقوق کی صف میں کھڑا کردیں تو ہمارا یہ عمل ظلم وستم کے علاوہ کچھ نہ ہوگا!

کیا معاشرتی اور ابتدائی فطری حقوق کے لحاظ سے تمام افراد کی حیثیت مساوی اور مشابہ ہے؟

انسانی حالات کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ افراد بشر میں کوئی بھی حاکم یا محکوم افسر یا ماتحت سپاہی یا وزیر نہیں پیدا ہوا، یہ خصوصیات اکتسابی حقوق ہیں اور افراد کو قابلیت وصلاحیت وکارکردگی کے ذریعے معاشرے سے اپنا یہ حق لینا چاہیے۔ معاشرہ بھی ایک طے شدہ قرارداد کے ذریعے یہ حق دیتا ہے۔

انسان اور حیوان کی معاشرتی زندگی میں یہی فرق ہے جیسے شہد کی مکھی اس طرح کے حیوانات کی زندگی کا ڈھانچہ فی صدی فطری ہے ان کے منصب اور ان کے کام فطرت نے تقسیم کردیے ہیں خود انہیں کوئی اختیار نہیں۔ فطری طور پر ان میں کوئی حاکم ہے کوئی محکوم کوئی کاری گر ہے کوئی انجینئر کوئی پہرے دار پیدا ہوا ہے۔ انسانی معاشرہ اس طرح کا نہیں ہے۔

اسی وجہ سے بعض دانشوروں نے قدیم فلاسفہ کے نظریے کو رد کردیا ہے

کہ ''انسان فطرتاً معاشرتی مخلوق ہے'' دانش ور کہتے ہیں کہ نہیں انسانی معاشرہ سوفی صد طے شدہ اصولوں کا پابند ہے۔

عائلی حقوق

یہ غیر خانوادگی و عائلی (گھریلو) معاشرے کی بات تھی۔ گھریلو معاشرہ کیا ہے؟ کیا افراد، گھریلو معاشرے میں ابتدائی فطری حقوق میں مشابہت و یکسانیت رکھتے ہیں اور اکتسابی حقوق میں فرق ہے؟ یا گھریلو معاشرہ یعنی وہ معاشرہ جس میں میاں بیوی، ماں باپ، اولاد اور بہن بھائی ہوں۔ غیر خاندانی معاشرے سے ابتدائی حقوق میں فرق رکھتا ہے اور فطرت کے فقانون نے خاندانی حقوق کو خاص شکل وصورت میں وضع کیا ہے۔

یہاں دو مفروضے موجود ہیں:

پہلا مفروضہ: میاں بیوی باپ بیٹا، ماں اور اولاد ہونا دوسری معاشرتی اوامداد باہمی جیسے تعلقات کی طرح قومی یا سرکاری اداروں میں اس کا سبب نہیں کہ چند افراد فطری طور پر خاص صورت وحالت حاصل کرلیں مثلاً ایک افسر بن جائے دوسرا ماتحت، ایک حکمران ہو دوسرا محکوم ایک زیادہ تنخواہ لے دوسرا کم۔ بیوی یا شوہر باب یا ماں اور اولاد ہونا بھی اس کا سبب نہیں کہ اس بنیاد پر وہ خاص پوزیشن حاصل کرے۔ فقط کارکردگی کی بنیادیں پر ایک شخص کا منصب معین ہوسکتا ہے۔

''عائلی حقوق میں عورت مرد کے حقوق کے مشابہت'' کا مفروضہ۔ جسے غلطی سے ''مساوی حقوق'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی فرض کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس مفروضہ کا مطلب یہ ہے کہ زن و مرد (میاں بیوی) کی صلاحیتیں اور ضرورتیں مشابہ ہیں اور مشابہ حقوق کی دستاویزیں فطرت کی طرف سے انہیں مل چکی ہیں اور یوں

،خاندانی زندگی میں وہ شریک ہیں لہٰذا عائلی حقوق ، یکسانیت ،مماثلت اور مشابہت کی بنیاد پر مرتب ہوں۔

دوسرا مفروضہ: نہیں ان کے ابتدائی طبیعی فطری حقوق بھی الگ الگ ہیں۔

شوہر ہونا ،شوہر ہونے کی بنا پر خاص فرائض وحقوق ثابت کرتا ہے اور بیوی ہونا، بیوی ہونے کی وجہ سے خاص ذمہ داریوں اور حق ثابت کرتی ہے۔اسی طرح باپ یا ماں اور اولاد ہونے کی بات ہے۔ بہرحال خاندانی معاشرہ دوسری کمپنیوں اور امداد باہمی کے اداروں سے جدا ہے''عورت ومرد کے عائلی حقوق میں مشابہت نہیں'' کا مفروضہ ۔ جسے اسلام نے منظور کا یاہے۔اسی کلیہ پر مبنی ہے۔

ان دونوں مفروضوں میں کون سا مفروضہ صحیح ہے اور اس کے صحیح ہونے کی صورت کیاہے۔اس کو سمجھنا ہے۔

عائلی حقوق کی فطری بنیادیں (۲)

محترم مطالعہ کرنے والے اچھی طرح نتائج دریافت کرسکیں اس لیے گزشتہ پیراگراف میں جو حقائق عرض کیے ہیں ان کا خلاصہ دیکھتے چلیں:

۱۔فطری حقوق اس لئے پیدا ہوئے کہ فطرت کا ایک مقصد ہے اس مقصد کی خاطر موجودات کے اندر صلاحیتیں اور استحقاق ودیعت ہوئے۔

۲۔انسان، انسان ہونے کے زاویے سے خاص حقوق اور ان کے سلسلے کا مالک ہے جسے ''انسانی حقوق'' کا نام دیا گیا ہے حیوانات اس قسم کے حقوق سے بہرہ ورنہیں ہیں۔

۳۔فطری حقوق کا تعین اور ان کی پہچان اور کیفیت سمجھنے کے خلقت وتخلیق وپیدائش کا مطالعہ کرنا چاہیے، ہرفطری صلاحیت ایک فطری حق کیلئے ایک فطری دستاویز ہے۔

۴۔انسانی افراد تمدنی اور بڑے معاشرے میں فطری حقوق میں مساوی و مشابہ حقوق رکھتے ہیں البتہ کارکردگی کی بنیاد پر ان میں فرق ہوتا ہے۔اس کا تعلق کام اورذمہ داری انجام دینے سے ہے۔ نیز فرائض کی انجام دہی میں مقابلہ دیکھا جاتا ہے۔

۵۔چونکہ تمام انسان انفرادی طور پر شہری سماج میں مساوی اور مشابہ فطری حقوق کے مالک ہیں۔انسانی فطرت کے مطالعے سے ثابت ہو چکا ہے کہ افراد انسان (دوسری معاشرتی پسند جانداروں کے۔جیسے شہد کی مکھی۔ برخلاف) فطرت کی طرف سے حاکم ومحکوم،فرماں رواوفرماں بردار، مزدوریا کارخانہ داری جرنیل، سپاہی بن

کر دنیا میں نہیں آیا کام اور منصب اور ذمہ داریاں فطرت نے تقسیم نہیں کی ہیں۔

۶۔خاندانی حقوق میں عورت و مرد کے حقوق کی مشابہت کا مفروضہ اس بات پر قائم ہے کہ خاندانی و عائلی معاشرے کا معاملہ ،شہری معاشرے کے معاملے سے جدا ہے زن و مرد، اپنی صلاحیتوں اور ملتی جلتی ضرورتوں کے ساتھ خاندانی زندگی میں شرکت نہیں کرتے دونوں کے پاس فطرت کی طرف سے عطا کردہ ملتی جلتی دستاویزیں نہیں ہیں۔قانون تخلیق نے انہیں ملتی جلتی شکل صورت میں نہیں قرار دیا، اس نے ہر ایک کیلئے الگ الگ دائرہ کار اور معین وضع پیش نظر رکھی ہے۔

اب دیکھتے ہیں دونوں مفروضوں میں کون سا مفروضہ صحیح ہے اور کس انداز سے ان دونوں مفروضوں کو سمجھا جائے؟

اس معیار کی بنا پر جو پہلے مل چکا ہے دونوں مفروضوں میں سے کون سا مفروضہ صحیح ہے ؟ دریافت کرنا زیادہ مشکل بات نہیں۔ عورت و مرد کی فطری صلاحیتوں اور ضرورتوں کا مطالعہ کرلیں۔ بالفاظ دیگر، قانون خلقت نے جو فطری دستاویز ہر ایک کو الگ الگ دی اسے دیکھیں بات واضح ہوجائے گی۔

خاندانی زندگی فطری ہے یا۔باہمی مفاہمتی زندگی؟

ہم گزشتہ مقالے میں بیان کرچکے ہیں کہ انسان کی معاشرتی زندگی کے بارے میں دو نظریے ہیں:

(الف) انسان کی معاشرتی زندگی طبیعی و فطری ہے۔اصطلاح میں انسان کو ''مدنی بالطبع'' کہتے ہیں۔

(ب) معاشرتی زندگی ایک مفاہمتی عمل ہے جسے انسان خود منتخب کرتا ہے اور اس انتخاب کا سبب اندرونی نہیں بیرونی عوامل کے دباؤ کی وجہ سے ہوتا ہے۔

یہ تو بات ہوئی اجتماعی زندگی کی خاندانی زندگی کیا ہے؟ یہاں بھی دو نظریے ہیں؟ نہیں!۔اس مسئلہ میں ایک نظریے کے علاوہ کوئی نظریہ نہیں ہے۔خاندانی زندگی سوفی صد طبیعی اور فطری ہے۔انسان فطرتاً گھریلو پیدا ہوا ہے۔ بالفرض ،شہری زندگی کے بارے میں فطری ہونے نہ ہونے کی بات ہو بھی،اس وقت بھی انسان کی فطرت میں گھریلو زندگی کا انکار نہیں کر سکتے ۔اسی طرح بہت سے جانور جو فطرتاً اجتماعی زندگی تو نہیں رکھتے اس کے باوجود ایک قسم کی عائلی زندگی ۔جوڑا بن کر رہنے کی زندگی ۔بسر کرتے ہیں جیسے کبوتر اور بعض حشرات جو فطرتاً جفت رہتے ہیں۔

خاندانی زندگی کا معاملہ اجتماعی زندگی کے معاملے سے مختلف ہے ۔فطرت میں کچھ ایسا نازک عمل ہوا ہے کہ انسان اور بعض جانور گھریلو زندگی اور خاندانی مرکزیت حاصل کرتے ہیں انہیں صاحب اولاد ہونے کی خواہش ہوتی ہے۔

تاریخی فرینے کسی ایسے عہد کی نشان دہی نہیں کرتے جب انسان گھریلو زندگی نہ رکھتا ہو۔یعنی میاں بیوی الگ الگ زندگی بسر کرتے ہوں ۔یا جنسی تعلقات مشترک اور عمومی رہے ہوں۔آج دنیا میں وحشی قبیلوں کا سماجی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ماضی میں انسانی زندگی ۔ماں کی بادشاہی ۔یا۔باپ کی بادشاہی کی صورت ہی میں پائی جاتی ہے۔

چار عہدوں کا مفروضہ

ملکیت کے مسئلے میں یہ مسلم ہے کہ شروع میں مالکیت مشترک تھی اور نجی وخصوصی ملکیت بعد میں وجود پذیر ہوئی ۔لیکن ''جنسیت'' کے بارے میں یہ بات نہیں ہے۔ملکیت ابتداء زندگانی انسان میں اس وجہ سے مشترک تھی کہ انسان ایک قبیلہ تھا اور خاندانی صورت رکھتا تھا۔یعنی قبیلے کے افراد ایک ساتھ زندگی بسر کرتے

تھے۔خاندانی احساسات سے بہرہ ور تھے۔لہٰذا ملکیت بھی مشترک تھی۔

شروع کے ادوار میں فرض کریں کہ قوانین ورسم ورواج نہ تھے جس کی بنیاد پرعورت ومرد دونوں ایک دوسرے کوذمہ داراورجواب دہ قرار دیتے۔اس دور میں خودان کی فطرت اورطبیعی احساسات ان کوفرائض وحقوق کا پابند کرتے تھے۔ ہرگزان کی جنسی زندگی بلاشرط وبے پابندی کے نہیں تھی۔یونہی وہ جانور جو''جفت'' زندگی گزارتے ہیں ان کے پاس کوئی اجتماعی یاقراردادی قانون نہیں رکھتے اس کے باوجودفطری قانون کے مطابق حقوق وفرائض کی نگہداشت کرتے ہیں اوران کی زندگی بےشرط وقیدو پابندی نہیں ہے۔

بیگم مہرانگیزمنوچہریاں نے اپنی کتاب''انتقاد برقوانین اساسی ومدنی ایران'' کےمقدمے میں لکھاہے:

''معاشرتی جائزہ رکھنے والے زاویہ نظرسے زن ومرد کی زندگی زمین کے مختلف خطوں میں چارمیں سےایک راستے سے گزرتی ہے:

۱۔فطری مرحلہ۔

۲۔مرد کےغلبہ کادور۔

۳۔عورت کےاحتجاج کازمانہ۔

۴۔زن ومرد کے مساوی حقوق کی منزل۔

پہلے مرحلے میں زن ومرد،بغیرکسی قیدوشرط کے باہمی جنسی میل ملاپ رکھتے تھے............

معاشرہ شناسی کویہ دعویٰ منظورنہیں۔جامعہ شناسی ومعاشرہ آگاہی زیادہ سے زیادہ یہ بات مان سکتی ہے کہ کہیں اوراتفاقاً کچھ وحشی قبائل میں چند بھائیوں نے چند بہنوں سے مشترکہ طورشادیوں کی ہوں اوروہ سب بھائی ان سب بہنوں سے جنسی عمل

کرتے ہوں بچے بھی سب کے مشترک ہوں یالڑکےلڑکیاں شادی سے پہلے محدود ومخصوص نہ ہوں لیکن شادی انہیں محدود مخصوص کردیتی ہو۔ اوراگراتفاق دراتفاق بعض وحشی قبائل میں جنسی عمل اس سے بھی زیادہ عام تھا۔ یہاں اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں کہ عورت ''قومی'' ہوتی ہوگی۔ یہ صورت استثنائی ہے، عام دستوراوروضع فطرت سے انحراف۔

ویل ڈیورانٹ نے ''تاریخ تمدن'' جلداول صفحہ 57 پرلکھا ہے۔

''ازدواج ہمارے حیوانی اجداد کی ایجاد ہے کچھ پرندوں میں دیکھا گیا ہے کہ دراصل ہر پرندہ ایک جفت پراکتفا کرتا ہے۔ گوریلے اورنگوٹان، نرومادہ کا سلسلہ بچے کی پرورش تک باقی رکھتے ہیں اوریہ تعلق بڑی حدتک عورت مرد کے تعلق جیسا ہوتا ہے، اورجب مادہ کسی دوسرے نرسے نزدیکی کرتی ہے تواسے اپنے ''نر'' کی بڑی سختی سہنا پڑتی ہے۔

ڈی گریس پگنی نے بورنیوکے اورنگوٹن کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایسے خاندانوں میں زندگی گزارتے ہیں جونرومادہ اوران کے بچوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹرساواژ (DR. SAVAGE) نے گوریلوں کے سلسلے میں کہا ہے: ان کی عادت ہے کہ ماں باپ درخت کے نیچے بیٹھ کرپھل اورمیوے کھاتے اورآپس میں کھیلتے ہیں۔ ان کے بچے درختوں پر ماں باپ کے گرد ایک شاخ سے دوری شاخ پرآتے جاتے ہیں۔

شادی توظہورانسان سے پہلے تاریخ میں موجود ہے، ایسے سماج جن میں شادی نہ ہوبہت کم ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اگرکوئی تحقیق کرے توکچھ سماج ڈھونڈسکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خاندانی (گھریلو) احساس انسان کا ایک فطری احساس

ہے،تمدن یا عادت کا پیدا کردہ نہیں ہے۔ جیسے بہت حیوانات فطری اور سرشت کے طور پر خاندانی رجحانات رکھتے ہیں۔

لہٰذا انسان پر کوئی دور ایسا نہیں گزرا کہ جنس زن اور جنس مرد کلی طور پر بلا قید وشرط ومعاہدہ۔خواہ وہ فطری ہی کیوں نہ ہو۔ زندگی بسر کرتے ہوں۔اس طرح کے دور کا مفروضہ جنسی اشتراکی دعویٰ ہے اور یہ دعویٰ خود اشتراکی طرفداروں نے بھی دولت کی اشتراکیت کے آغاز میں نہیں کیا تھا۔

زن ومرد کے جنسی تعلقات میں چار ادوار کا مفروضہ ایک تقلیدی مفروضہ ہے جو مالکیت کے بارے میں سوسلسٹوں کے چاردوروں سے حاصل کیا ہے ۔سوشلسٹ کہتے ہیں کہ انسان نے مالکیت کے چار دور گزارے ہیں۔

پہلا دور۔ابتدائی مشترک ملکیت۔

دوسرا دور۔فیوڈل ازم (جاگیرداری)

تیسرا دور۔کیٹپلزم (سرمایہ دری)

چوتھا دور۔سوشلزم اور کمیونزم۔

جوابتدائی اشتراکیت کی طرف بازگشت ہے مگر ذرا اونچی سطح پر۔

خوشی کی بات ہے کہ بیگم منوچہریاں نے چوتھے دور کا نام ”حقوق زن ومرد کی برابری“ رکھا ہے اور اس پہلو سے انہوں نے سوشلسٹوں کی تقلید نہیں کی اور آخر دور کو ابتدائی اشتراکیت کی طرف بازگشت کا نام نہ دیا۔

اگرچہ محترمہ کے خیال میں بقول ان کے چوتھے دور اور پہلے دور میں ”زیادہ مشابہت“ ہے انہوں نے تشریح کی ہے:

”چوتھا مرحلہ پہلے مرحلے سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے عورت ومرد کسی بالا دستی اور برتری کے بغیر مل جل کر زندگی بسر کرتے تھے۔“

''شباہت زیادہ'' زیادہ مشابہت۔کا مطلب میں ابھی نہیں سمجھ سکا۔

اگران کا مطلب یہ ہے کہ۔بلادستی و برتری مرد کو حاصل نہ ہو،اور ایک دوسرے کے درمیان برابر کے معاہدے اور شرائط ہوں ،تو یہ بات تو دلیل بننے کے قابل نہیں ہے کہ یہ دوران دوروں سے مشابہت رکھتا جو محترمہ کے نزدیک شرط وقیدو پابندی کے ہر بندھن سے آزاد تھے۔جب مردوزن گھریلوزندگی ہی نہ رکھتے تھے۔

اوراگران کا مطلب یہ ہے کہ چوتھے مرحلے میں آہستہ آہستہ تمام بندھن ٹوٹ جائیں گے اور گھریلوزندگی منسوخ ہوجائے گی اور افراد بشر میں ایک قسم کا جنسی اشتراک حکمرانی کرے گا۔معلوم ہوتا ہے کہ''حقوق کی برابری'' سے ان کا مطلب اس مطلب ومدعا کے علاوہ ہے جو برابری حقوق کے حامیوں کے نزدیک صحیح ہے۔کیونکہ محترمہ مذکورہ بالامفہوم ومدعا کی بڑی سخت حامی ہیں اور یہ بات ان کیلئے اتفاق سے بڑی وحشت ناک ہوگی۔

اب ہمیں زن ومرد کے گھریلوحقوق کی فطرت کی طرف توجہ کرنا چاہیے اس بارے میں دو چیزوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

ایک سوال یہ ہے کہ۔زن ومرد طبیعت وفطرت کے لحاظ سے فرق رکھتے ہیں یا نہیں؟ بالفاظ دیگر عورت ومرد میں فقط تولید وتناسل کے اعضا کا فرق ہے یا اس سے زیادہ گہرا فرق موجود ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ۔اگر دوسری نوعیت قسم کے اختلاف بھی معلوم ہیں تو کیا وہ اختلافات ایسے ہیں جو حقوق وفرائض پر اثرانداز ہوتے ہیں۔یا ایسے اختلافات ہیں جن کا فطرت انسانی سے تعلق نہیں ہے جیسے رنگ ونسل۔

عورت فطرت کے زاویہ نظر سے

پہلی بات کے بارے میں خیال ہے کہ بحث کی گنجائش نہیں ہے اس بارے میں تھوڑا سا بھی مطالعہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ فرق واختلاف زن و مرد فقط تولید وتناسل کے اعضاء ہی میں نہیں، دوسری باتوں میں بھی فرق ہے بحث اس میں ہے کہ باقی اختلافات عورت و مرد کے حقوق وفرائض پر اثر انداز ہوتے ہیں یا نہیں۔

مغربی دانشوروں اور ماہرین نے پہلے حصے پر مناسب طریقے سے گفتگو کی ہے حیاتیاتی ونفسیاتی اور معاشرتی پہلوؤں کے مطالعے کے بعد ان لوگوں نے تھوڑے سے بھی انکار کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ان لوگوں نے جس طرح توجہ نہیں کی وہ ہے ان اختلافات کا جائزہ جو خاندانی حقوق اور ذمہ داریوں پر اثر ڈالتے ہیں اور مرد وعورت کو غیر مشابہ قرار دیتے ہیں۔

فرانس کے مشہور فیزیالوجسٹ ، ایلکسس کارلز۔ جو بیالوجسٹ اور اعلی درجے کے سرجن تھے۔موصوف نے اپنی بہت عمدہ کتاب میں دونوں کا اعتراف کیا ہے موصوف کی کتاب کا فارسی ترجمہ ''انسان موجود ناشناختہ کے نام سے چھپ چکا ہے ۔ یعنی موصوف کے بقول ۔زن ومرد قانون تخلیق کے مطابق مختلف طور پر پیدا ہوئے ہیں اور یہ بھی کہا ہے کہ دونوں کے اختلافات اور فرق ان کے فرائض وحقوق پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور ان میں بھی فرق ڈالتے ہیں۔

''جنسی عمل اور تولید مثل'' کے عنوان سے ایک فصل قلم بند کی ہے (طبع سوم صفحہ 100) میں لکھا ہے:

''بیضے اور تخم دان بڑے وسیع عمل کرتے ہیں ۔ پہلے تو نر یا مادہ خلیے بناتے ہیں جن کی پیوستگی سے نیا انسان وجود میں آتا ہے۔اور عین اسی دوران ایسے مادوں کی

خون پر زیرش کرتے ہیں جو رگوں ، پٹھوں اور ڈھانچے نیز شعور تمیں مرد وعورت کے اثر ظاہر کرتے ہیں۔ یوں وہ ہمارے تمام بدنی عمل میں تیزی بخشتے ہیں۔

بیضوں سے ہونے والی زیرش ،تہور، جوش وخروش اورخشونت وسختی پیدا کرتی ہے اور یہی خصوصیات جنگی بیلوں کو اس گائے سے ممتاز کرتے ہیں جو کھیتوں میں جتائی کا کام کرتی ہے۔ تخمدان بھی وجود زن میں اسی طرح کے اثرات ڈالتا ہے ....مرد وعورت میں جو اختلاف موجود ہے وہ فقط جنسی بدن بچہ دانی اور نظام تولید اور خاص طرز تعلیم ہی پر منتج نہیں ہوتا بلکہ ایک اور گہری علت ہے اس اختلاف کی اور وہ ان کیمیائی مادوں کی زیرش ہے جو تناسلی غددوں سے خون پر ہوتی ہے۔

اس اصلی اور ہم ا نکتے پر توجہ نہ کرنے کی وجہ سے انقلاب خواتین کے طرف دار سوچتے ہیں کہ دونوں جنسوں کی ایک تعلیم وتربیت دی جائے۔ دونوں کے مصروفیات اختیارات اور ذمہ داریاں ایک قسم کی دی جائیں۔ عورت بہت سے پہلوؤں سے مرد سے مختلف ہے بدن کے خلیے، اعضا، کی قوت وساخت، خاص کر اعصابی سلسلہ اس کی جنس کی نشانیاں اس کے چہرے پر نمایاں ہیں۔

فزیالوجی کے قانون قاعدے ستاروں کی دنیا جیسے ہیں سخت اور ناقابل تبدیلی۔ ممکن نہیں کہ انسانی رجحانات وارادے ان میں دخل دے سکیں۔ ہم مجبور ہیں جس طرح وہ ہیں اسی طرح انہیں مان لیں۔

خواتین کو مردوں کی اندھی تقلید کیے بغیر کوشش کرنا چاہیے کہ اپنی فطرت کے عطا کئے ہوئے انعامات کو وسعت دیں اور اپنی خاص سرشت وخمیر کے مطابق اسی راہ میں آگے بڑھیں۔ بشریت کے ارتقا میں ان کی ذمہ داریاں مردوں سے زیادہ اہم ہیں ان ذمہ داریاں کو سبک نہ سمجھیں اور ان سے پہلوتہی نہ کریں۔

کارل نے مرد کے مادہ تولید اور عورت کے مادہ تولید میں خلیوں اور ان کے

باہم پیوست ہونے کی کیفیت بتائی اور یہ کہ تولید کیلئے مادہ کا ہونا ضروری ہے برخلاف وجود نر کے اور یہ کہ حمل عورت کے جسم کو مکمل کرتا ہے فصل کے آخر میں لکھا ہے:

''ہمیں جوان لڑکیوں کیلئے وہ طرز فکر اوراس قسم کی زندگی اور فکری انتظامات اور مقاصد اور آئیڈیالوجی نہ رکھنا چاہیے جو نوجوان لڑکوں کیلئے ہوا کرتے ہیں تعلیم وتربیت کے ماہرین کو مرد وزن کے اختلافات اعضاء جنس، مرد وزن کے نفسیات اوران کے فطری فرائض کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ہماری آئندہ نسل کی بنیاد و تعمیر اس بنیادی نکتے پر بڑی اہمیت حاصل کر سکے گی۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا اس بڑے دانشور نے زن ومرد کے بڑے فطری فرق بھی بتائے اور یہ نظریہ بھی ظاہر کیا کہ ان اختلافات کے سبب فرائض وحقوق میں مشابہت نہیں ہے۔

آئندہ فصل میں ہم دوسرے دانشوروں کے نظریے بیاں کریں گے کہ وہ لوگ زن ومرد میں کیا کیا اختلاف مانتے ہیں، پھر نتیجہ حاصل کریں گے کہ زن ومرد کن حصوں میں صلاحیتوں اور ضرورتوں میں مشابہ ہیں اور اس وجہ سے انہیں مشابہ حقوق رکھنا چاہیے اور کن حصوں میں مشابہ حالت نہیں رکھتے ،اور ایسے حالات میں حقوق وفرائض غیر مشابہ حاصل ہونا چاہیے۔ زن ومرد کے عائلی حقوق وفرائض یہ حصہ کتاب نازک ترین واہم ترین حصوں میں ہے۔

ساتواں حصہ

عورت و مرد کے فرق

کیا عورت و مرد میں فرق کا خیال قرون وسطی کی سوچ ہے۔

عورت کے حقوق نے افلاطون وارسطو کو آمنے سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔

عورت و مرد کی تخلیق میں قانون خلقت نے دونوں کے جوڑ کو زیادہ مضبوط بنایا ہے۔

مرد، دنیا پر قبضہ کرنے والا ہے اور عورت مرد کو قابو میں رکھنے والی ہے۔

مغرب کے نئے مقلدوں کو زن و مرد کے جن تعلقات نے غرق سرور کر رکھا ہے خود اہل مغرب اس کے خمار کا دور گزار رہے ہیں۔

خلاصہ مطالب از مولفؒ

عورت و مرد میں فرق و اختلاف (۱)

عورت و مرد کے فرق و اختلافات! عجب مہمل بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے باوجودیکہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں زندگی گزر رہی ہے۔ پھر بھی کونے کھدرے میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جن کے سوچنے کا انداز قرون وسطی جیسا ہے۔ پرانے خیالات گھسے پسے افکار، اختلاف زن و مرد یہ سمجھتے ہیں۔ عورت و مرد کے درمیان فرق ہے شائد چاہتے ہیں کہ قرون وسطی کے لوگوں کی طرح یہ نتیجہ نکال لیں کہ عورت کی جنس گھٹیا ہے، عورت انسان کامل نہیں ہے۔ عورت حیوان اور انسان کے درمیان برزخ ہے۔ عورت میں یہ صلاحیت و قابلیت نہیں ہے کہ زندگی میں مستقل و آزاد ہو، اسے بہرحال مرد کے ماتحت اور اس کی اس سرپرستی میں رہنا چاہیے۔ آج کی دنیا میں ان پرانی باتوں کا فائدہ کیا ہے۔ آج سب کو معلوم ہو چکا ہے کہ یہ باتیں جھوٹ اور جعل سازی تھیں۔ مردوں نے زور ظلم سے عورت کو دبا رکھا تھا۔ اب سب جان گئے ہیں کہ بات برخلاف تھی عورت کی جنس برتر اور مرد کی جنس پست تر اور ناقص تر ہے۔

خیر، جناب! علوم کی حیرت انگیز ترقی کی روشنی میں عورت و مرد کا فرق کھل کر سامنے آ گیا ہے جعل سازی اور بہتان کی بات نہیں۔ علمی اور تجرباتی حقیقتیں ہیں۔ مگر یہ فرق اس بحث سے قطعاً غیر متعلق ہیں کہ مرد یا عورت برتر جنس ہے اور دوسری جنس گھٹیا ہے اور ناقص ہے۔ قانون تخلیق کے سامنے ان کی اونچ نیچ سے مقصد ہی کچھ اور ہے، قانون خلقت نے یہ فرق اس لئے رکھا تھا کہ زن و مرد کی خاندانی زندگی کے تعلق کو زیادہ مضبوط کرے ان کی اکائی کی نیو اچھی رکھی جائے قانون خلقت نے یہ

فرق اس لئے رکھا کہ زن و مرد اپنے ہاتھوں عائلی فرائض خود بانٹ لیں اور جس کے دوسرے اعضا کی طرف اختلافات کے باوجود ایک جسم بنائیں۔ اگر قانون خلقت نے آنکھ، کان، ہاتھ، پاؤں اور ریڑھ کی ہڈی کے جوڑ بنائے تو اس کا مطلب یہ تونہیں ہے کہ وہ ان پر خاص نظر رکھتا اور ان میں فرق چاہتا ہے۔ ایک پر دوسرے کے مقابلے میں ظلم جائز سمجھتا ہے۔

نقص وکمال یا تناسب

یہ موضوع میرے تعجب کا باعث ہے۔ بعض حضرات اس پر اصرار کرتے اور زور دیتے ہیں کہ جسمانی اور نفسیاتی صلاحیتوں کے لحاظ سے زن و مرد کا فرق ۔عورت کے ناقص اور مرد کے کامل ہونے کی دلیل ہے، اس کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ قانوق خلقت نے مصلحت کی بنا پر عورت کو ناقص پیدا کیا ہے۔

عورت کے ناقص الخلقت ہونے کی بات ہم مشرق کے رہنے والوں سے پہلے اہل مغرب میں چل چکی ہے۔ وہاں مذہب وکلیسا کہتے ہیں:

عورت کو عورت ہونے پر شرمندہ ہونا چاہیے۔ کبھی کہا جاتا ہے۔ عورت وہ مخلوق ہے جس کی زلفیں بڑی اور عقل چھوٹی ہے۔ عورت آخری وحشی ہے جسے مرد نے رام کیا ہے۔ وغیرہ۔

اس سے زیادہ عجیب یہ بات کہ اخیری دوری میں کچھ یورپ والے ایک سواسی درجے کے گردش یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ایک ہزار ایک دلیلوں سے مرد کو مخلوق ناقص و پست وزبوں اور عورت کو مخلوق کل و برتر ثابت کر دکھائیں۔

اگر آپ نے اشلے مونٹیگو کی تالیف ''زن وجنس برتر'' مجلہ ''زن روز'' میں پڑھی ہے۔ تو محسوس کیا ہوگا کہ یہ شخص کس زور آوری اور بے معنی تانے بانے سے یہ

ثابت کرنا چاہتا ہے کہ عورت و مرد سے کامل تر ہے۔ کتاب میں فزیالوجی ،نفسیات اور معاشرتی شماریات کی حد تک کارآمد اطلاعات ہیں اور وزنی چیز ہے۔اس کے بعد جو مصنف نے نتائج حاصل کرنا چاہے ہیں۔ اور اپنا مقصد (جو کتاب کا نام سے عیاں ہے) ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔اس میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں۔ آخر،ایک دن عورت کو اتنا حقیر و پست و زبوں کیوں کہا تھا کہ آج مجبور ہو کر گزشتہ کی تلافی کرنا پڑ رہی ہے اور اس میں بھی وہ سب نقائص اور کمزوریاں جو عورتوں کے ذمے لگائی تھیں اب انہیں کو مرد کے سر تھوپنے کی مہم شروع کرنا پڑی ہے۔ کیوں ضروری ہے کہ زن و مرد کے فرق کو کسی کے ناقص اور کسی کے کامل ہونے پر زور دیں پھر کبھی مرد کا دامن پکڑیں کبھی عورت کا۔

ایشلی مونٹیگو ایک طرف تو زور دیتے ہیں کہ زن کو جنس کے اعتبار سے مرد پر برتری حاصل ہے اور دوسری طرف مرد کے خصوصیات جتاتے ہیں کہ مرد تاریخی اور اجتماعی لحاظ سے تاریخ کا خالق ہے،فطری عوامل نہیں۔

مرد و عورت کا فرق تناسب (ایک مناسبت پر مبنی) نہ نقص و کمال قانون خلقت چاہتا تھا کہ ان اختلافات سے عورت و مرد میں زیادہ مناسبت رہے کیونکہ دونوں بہرحال مشترک زندگی گزاریں گے۔ الگ الگ زندگی بسر کرنا قانون خلقت سے انحراف ہے۔ یہ مطلب بعد میں آنے والے توضیحات میں زیادہ روشن ہوگی اور تفاوتوں کی نوعیت اور کھلی گی۔

نظریہ افلاطون

یہ مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے جو ہماری صدی میں زیر بحث آیا۔کم از کم ایک ہزار چار سو برس پہلے یہ بحث ہو چکی ہے۔ افلاطون کی کتاب جمہوریت میں اس

کا تذکرہ ہے۔

افلاطون نے بڑی صفائی سے کہا ہے کہ عورت و مرد مشابہ صلاحیتوں کے مالک ہیں ،عورتیں بھی وہی ذمہ داریاں سنبھال سکتی ہیں جو مرد سنبھالتے ہیں۔انہیں وہی حقوق ملنا چاہے جن سے مرد فائدا ٹھاتے ہیں۔

عورت کے بارے میں بیسویں صدی کے مسائل جنہیں نیا کہا جاتا ہے سب کا سرچشمہ افلاطون کے افکار میں ہے بلکہ اس صدی کے لوگ جسے حدافراط اورنا قابل قبول کہتے ہیں وہ افلاطون کے یہاں موجود ہے۔لوگ اتنے بڑے آدمی سے تعجب کرتے ہیں جو شخص ''پدرفلسفہ'' ہووہ ایسی باتیں کرے!فلاطون نے رسالہ جمہوریت کی پانچویں فصل اسی موضوع سے مخصوص کی ہے اورزن وفرزندکی اشتراکیت نسل کی اصلاح وبہبود ،بعض زن ومرد افراد کی تولید وتناسل سے محرومی اوران افراد کو یہ حق دینا جواعلی درجے کے صفات سے متصف ہوں خاندان سے باہر اولاد کی تربیت وپرورش کا ضابطہ،تناسل وتوالد کیلئے معین عمروں کا تعین یعنی زن ومرد جنسی اوراولاد پیدا کرنے کیلئے ایسی عمروں کا تعین جن میں جوش اورزندگی کی توانائی بھر پور ہو۔

افلاطون کا عقیدہ ہے جس طرح مردوں کو جنگی تعلیم وتربیت دی جاتی ہے عورتوں کو بھی اسی طرح تربیت دی جائے مردوں کی طرح خواتین بھی ورزشی مقابلوں اورکھیلوں میں شرکت کیا کریں۔

اس کے باوجود دو نکتے افلاطون نے ضرور لکھے ہیں:

ا۔وہ مانتا ہے کہ عورتیں جسمانی ،روحانی اوردماغی طور پر مردوں سے کمزور ہیں۔یعنی مردوزن کے تفاوت کو کمیت (مقداری) کے لحاظ سے تسلیم کرتا ہے۔اگر کیفیت میں اورصلاحیتوں میں اس کے خلاف ہے۔افلاطون کے خیال میں مردوزن میں مماثل صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ایک بات یہ ہے کہ ہر شعبے میں وہ مردوں سے

زیادہ کمزور ہیں اور اس سے کام لینے اور کام کرنے پر کوئی اثر نہیں پڑتا جو کام مرد کر سکتا ہے وہ عورت بھی انجام دے سکتی ہے۔

افلاطون عورت کو مرد سے کمزور تر ماننے کی بنیاد پر خدا کا شکرادا کرتا ہے کہ مرد پیدا ہوا عورت نہیں۔ وہ کہتا ہے۔

''خدا کا شکر ادا کرتا ہوں یونانی پیدا ہوا ہوں غیر یونانی نہیں ہوں۔ آزاد خلق ہوا ہوں، غلام نہیں، مرد پیدا ہوا ہوں، عورت نہیں۔

۲۔ افلاطون نے نسلی بہبود، عورت و مرد کی مساوی صلاحیتوں کے مطابق پرورش زن وفرزند وغیرہ کی مشترک ملکیت (اشتراکیت) کا جو نظام بنایا ہے اس میں حاکم طبقہ کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔ یعنی فلسفی حاکم اور حاکم فلسفی۔ جنہیں افلاطون تنہا حکومت کے لائق سمجھتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ افلاطون سیاسی رویوں میں ڈیموکریسی کے خلاف اور ارسٹو کراسی کا حامی ہے گزشتہ نظریوں میں ساری باتیں ارسٹو کریٹ سے وابستہ ہیں ان کے علاوہ دوسرے طبقات کے بارے میں وہ کوئی رائے نہیں دیتا۔

ارسطو۔ افلاطون کے مقابلے میں

پرانے زمانے کے لوگوں میں افلاطون کے بعد جس کے نظریات وافکار جو ہماری دسترس میں ہیں وہ اس کے شاگرد ارسطو کے ہیں۔ ارسطو نے اپنی کتاب ''سیاست'' میں زن ومرد کے فرق پر اظہار رائے کرتے ہوئے اپنے استاد افلاطون کی سخت مخالفت کی۔ ارسطو کے نزدیک زن ومرد میں اختلاف کمیت (مقداری) ہی پہلو سے نہیں۔ کیف (کیفیت) کے لحاظ سے بھی ہے۔ قانون خلقت نے ہر ایک کے ذمہ جو فرائض عائد کیے اور جو حقوق تجویز کیے ہیں ان میں زیادہ مقامات باہمی مختلف

ہیں۔ارسطو کے عقیدے میں عورت و مرد کے اخلاقی فضائل بھی اکثر مقامات پر جدا جدا ہیں۔ ایک خلق مرد کیلئے باعث شرف ہوسکتا ہے اور وہی خلق عورت کیلئے فضیلت نہ ہو۔اسی طرح اس کے برعکس ایک خلق عورت کے واسطے فضیلت ہو اور مرد کیلئے نہ ہو۔

ارسطو کے نظریات نے پرانے زمانے میں ہی افلاطون کے خیالات کومنسوخ کر دیا اس کے بعد آنے والے دانشوروں نے اس کے نظریات کو افلاطون کے خیالات پر ترجیح دی۔

آج کی دنیا کی نظر

یہ باتیں تھیں ماضی بعید کی ،اب دیکھیں نئ دنیا کیا کہتی ہے ،آج کی دنیا اندازہ وگمان کی بات کے بجائے مشاہدو تجربہ پر بنیاد رکھتی ہے۔جب اعداد وشمار کی بات ہوتی ہے تو چشم دید حقائق سامنے ہوتے ہیں جدید دنیا میں فزیکس کے گہرے مطالعات ،نفسیات و معاشرے کے حقائق کی روشنی میں بہت زیادہ اختلاف اور فرق معلوم ہوئے ہیں،ایسے انکشافات جسے پرانی دنیا دریافت نہیں کرسکی تھیں۔

ماضی بعید میں مرد وزن کے اقدار متعین کرتے ہوئے فقط ایک کے جسم کی قوت اور موٹائی اور دوسرے کے جسم کی چھوٹائی ،ایک کا جسم بھاری بھرکم دوسرا نازک اندام ایک قدآور دوسرا ذرا دبتے قدوالی۔ایک کی آواز میں زیادہ گرج دوسرے کی آواز میں لطافت ونرمی ۔ایک کے جسم پر گھنے بال اور دوسرے کا جسم آئینہ اور کندن ۔اس سے آگے بڑھ کر تو بلوغ کی حد تک جو دونوں میں الگ الگ سن وسال میں ہے۔ یا پھر عقل واحساسات کا حساب لگاتے تھے۔ مرد کو مظہر عقل اور عورت کو مظہر مہر ومحبت کہتے تھے۔

آج ۔۔ ان باتوں سے آگے بڑھ کر متعدد پہلوا جاگر ہوئے ہیں یہ معلوم ہوا کہ زن ومرد کی دنیا اکثر معاملات میں الگ الگ اوران معاملات میں فرق ہے۔

اہل تحقیق نے جو کچھ لکھا ہے ہم اس سے زن ومرد کے مجموعی تفاوت اوراختلافات کا تذکرہ کریں گے اوران اختلافات کے فلسفے پرروشنی ڈالیں گے۔ یہ بھی غور کریں گے کہ ان اختلافات کی بنیاد فطرت ہے اورکتنی باتیں ہیں جو تاریخی ،ثقافتی ومعاشرتی عوامل سے پیدا ہوئی ہیں۔ یہ تفاوت ایسے ہیں جنہیں ہر شخص تھوڑے سے مطالعے اورتجربہ سے دریافت کرسکتا ہے اورکچھ ایسے ہیں جن کا انکار ممکن نہیں ہے۔

دورنگی

مرد،متوسط طور پر بھاری اورگٹھے بدن کا اورعورت ،چھوٹی اورزیادہ نازک اندام ہوتی ہے۔مرد کا قد لمبا،عورت کا قدم چھوٹا ہوتا ہے مرد میں کھردرا پن اورعور کے جسم میں نرمی ولطافت ،مرد کی آوازموٹی اور بھاری ،عورت کی آواز نازک اوردل کش ۔عورت کا بدن جلدی بڑھتا ہے۔مرد کی جسمانی نشوونما سست ہوتی ہے ۔یہاں تک کہا گیا ہے کہ لڑکی شکم مادر میں لڑکے سے زیادہ جلدی بڑھتی ہے۔مرد کے رگ پٹھےاورجسمانی قوت عورت سے زیادہ ہوتی ہے۔عورت میں بیماری سے مقابلہ کرنے کی قوت مرد سے زیادہ ہوتی ہے۔عورت ،مرد سے پہلے بالغ ہوجاتی ہے،اس میں مرد سے پہلے تولید کی قوت آجاتی ہےاور پہلے ختم ہوجاتی ہے۔مرد کے یہاں اس کے برعکس ہے۔ لڑکی ،لڑکے سے پہلے بولتی ہے عورت کے متوسط مغز سے ،مرد کا متوسط مغز بڑا ہوتا ہے۔لیکن مجموعی جسم کی نسبت سے عورت کا مغز بڑا ہوتا ہے۔ مرد کے پھیپھڑے عورت کے پھیپھڑوں سے زیادہ سانس میں ہوا کھینچتے ہیں۔عورت کے دل

کی دھڑکن مرد کے دل کی دھڑکن زیادہ تیز ہوتی ہے۔

نفسیاتی فرق

مرد، ورزش، شکاراور دوڑ دھوپ کے کام سے بہ نسبت عورت کی دل چسپی رکھتا ہے۔مرد کے احساسات رزم ومقابلہ وجنگجوئی عورت کے رجحانات بزم دوستی صلح پسندی چاہتے ہیں۔مرد حد سے آگے بڑھنے اور ہنگامہ آرائی عورت پرسکوں اور خاموشی تر جذبات رکھتی ہے۔عورت اپنے لئے اور غیروں کے لئے سخت رویے سے بچتی ہے اسی وجہ سے عورتوں کی خودکشی مردوں سے کم ہے۔مرد خودکشی کے معاملے میں بھی عورت سے زیادہ سخت ہے، بندوق، پستول سے اور پھندا ڈال کر مرنے کے واقعات اور اونچی عمارتوں سے کود کر جان دینے کے قصے مرد کے زیادہ ہیں۔عورت، خواب آور گولیاں، افیون..........کھا کر مرجاتی ہے۔

عورت کے نفسیات اور احساسات مرد کے مقابلے میں زیادہ مشتعل ہوجاتے ہیں عورت مرد سے جلدی جوش میں آجاتی ہے یعنی عورت جن معاملات میں اسے خاص لگاؤ یا خطرہ ہو، تیزی اور جلدی سے اپنے احساسات میں بہہ جاتی ہے اور مرد بہ نسبت عورت کے زیادہ سرد مزاج ہے۔عورت طبعاً زیوروآرائش جمال وزیبائش چاہتی ہے اسے رنگارنگ فیشن درکار ہیں۔مرد اس کے خلاف ہے۔مرد کے مقابلے میں عورت کے احساسات زیادہ ناپائیدر ہیں۔عورت مرد سے زیادہ احتیاط طلب زیادہ مذہبی، زیادہ باتونی، زیدہ ڈرپوک اور زیادہ تکلف پسند ہے عورت نفسیاتی طور پر مادرانہ جذبات رکھتی ہے۔ یہ نفسیات بچپنے ہی سے اس میں موجود ہوتے ہیں۔اسے مرد سے زیادہ خاندان اور گھر سے تعلق خاطر ہوتا اور بلاارادہ گھریلو فکر میں رہتی ہیں۔عورت دلیل واستدلال اور خشک عقلی بحثوں میں مرد کے برابر نہیں پہنچ

سکتی، ہاں ادب، نقاشی اور ذوق ونفسیات سے نازک تعلق رکھنے والوں میں مرد سے کم نہیں ۔مرد راز کو چھپاتے اور تکلیف دہ معاملات کو اپنے اندر محفوظ رکھنے کی زیادہ قوت رکھتا ہے۔اور اسی دلیل سے راز داری کی بدولت پیدا ہونے والی آزمائشیں مرد کو زیادہ جھیلنا پڑتی ہیں۔ بخلاف عورتوں کے۔خواتین،مرد سے زیادہ رحم دل ہیں،فوراً انہیں رونا آتا اور کبھی کبھی غش بھی کھا جاتی ہیں۔

احساسات کا تناظر

مرد اپنی خواہشات کا غلام ہے عورت محبت کی بندھی ہوئی مرد جس عورت سے محبت کرتا ہے اسے جتنا اور پسند کرتا ہے عورت اس سے محبت کرتی ہے جس کی قدر و قیمت جانتی ہو اور جس نے اس سے محبت کا اظہار کر دیا ہو۔،مرد کی خواہش کہ عورت کے ساتھ رہے اور عورت بھی اس کا ساتھ دے اسے اختیار دے ۔عورت مرد کا دل موھنے اور دل کی راہ سے اس پر چھانے کی فکر میں رہتی ہے۔مرد عورت کے سر پر سوار ہونا چاہتا ہے عورت مرد کے دل میں سمانا چاہتی ہے ۔مرد عورت کو پکڑنا چاہتا ہے۔ عورت بھی مرد کو جذب کرنا چاہتی ہے ۔عورت مرد میں دلیری و بہادری اور مرد عورت میں دلیری و زیبائش دیکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔عورت کے نزدیک سب سے بڑی چیز ہے کہ مرد اس کی حمایت کرے۔عورت مرد سے زیادہ خواہشات پر قابو رکھتی ہے۔مرد کی خواہش حملہ آور اور پہل کرنے والی ہے۔عورت کی خواہش میں انفال اور تحریک ہے۔

عورت مرد کے فرق (۲)

پروفیسر ریک کے نظریات

مشہور امریکی ماہر نفسیات، پروفیسر ریک کے نظریات ''زن روز'' کے شمارنمبر 90 میں چھپ چکے ہیں۔ پروفیسر مدتوں ''زن ومرد'' کے مسائل پر تحقیق کرتے اورنتائج حاصل کرتے رہے پھرانہوں نے ایک ضخیم کتاب میں دونوں کے درمیان فرق بتائے ہیں۔

پروفیسر موصوف کے بقول!

مرد کی دنیا، عورت کی دنیا سے بہت مختلف ہے۔ اگر عورت مرد کی طرح نہیں سوچتی یااس جیسا کام نہیں کرتے تواس کا سبب دونوں کی دنیاؤں کا فرق ہے۔

پروفیسر نے لکھا ہے:

تورات کے بموجب ''زن ومرد ایک گوشت سے وجود میں آئے۔'' ٹھیک ہے دونوں ایک گوشت سے پیدا ہوئے ہیں، مگر دونوں کے جسم مختلف ہیں۔ پھر دونوں ترکیب میں مکمل طور پر ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ علاویں بریں، دونوں کے احساسات کبھی مماثل نہیں ہوسکتے۔ حادثات اور اتفاقات کے وقت دونوں کا ردعمل ایک نہیں ہوسکتا۔ زن ومرد اپنے جنسی تقاضوں کے مطابق مختلف اقدام کرتے ہیں جیسے دوسیارے دورمداروں میں الگ الگ حرکت کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو سمجھیں اورایک دوسرے کی تکمیل کریں، ممکن ہے۔ مگر کبھی ایک نہیں ہوسکتے۔ یعنی دونوں زندگی ساتھ بسر کرسکتے ہیں، ایک دوسرے کے عاشق اور ایک دوسرے کے صفات واخلاق قبول کرکے تھکاوٹ اور اکتاہٹ محسوس نہ کریں۔

پروفیسر ریک نے زن ومرد کے تقابلی مطالعے میں جو اختلافات قلم بند کئے ان میں ہے:

۱۔مرد، اپنے چاہنے والی عورت کے ساتھ ہمیشہ رہنے کے خیال سے اکتاہٹ محسوس کرتا ہے۔لیکن عورت کیلئے اس سے بہتر کوئی لذت نہیں کہ وہ ہمیشہ ایک چاہنے والے مرد کے پہلو میں رہے۔

۲۔مرد کا دل چاہتا ہے کہ ہمیشہ ایک حالت میں رہے ،عورت کی خواہش رہتی ہے کہ ہر آن نئی نویلی ہو۔ ہر صبح کو نئے حلیے میں بستر سے اٹھے۔

۳۔بہترین جملہ جو ایک مرد کسی عورت سے کہہ سکتا ہے۔وہ عام محاورہ ہے۔ ''پیاری میں تمہیں چاہتا ہوں''۔خوبصورت ترین جملہ جو عورت اپنے چاہنے والے سے کہہ سکتی ہے۔وہ ہے۔''مجھے تم پر ناز ہے''۔

۴۔اگر کوئی شخص زندگی میں کئی محبوب عورتوں کے ساتھ رہ چکا ہو تو دوسری عورتوں کی نظر میں وہ جاذب توجہ ہوتا ہے۔مرد کو وہ عورت بدی معلوم ہوتی ہے جو کئی مردوں کے ساتھ زندگی گزار چکی ہو۔

۵۔مرد کو بڑھاپے میں بدبختی کا احساس ہو جاتا ہے کیونکہ اپنے روزانہ مشغلے یعنی کام کو ہاتھ سے دیتے ہیں۔مگر عورت بڑھاپے سے خوش ہوتی ہے کہ بہترین چیزیں اس کے سامنے ہوتی ہیں۔گھر اور چند نواسے پوتے۔

۶۔مرد کی نظر میں خوش نصیبی کے معنی ہیں معاشرے میں ایک شخصیت اور مقام حاصل کر لے۔

۷۔عورت کے نزدیک خوش نصیبی کے معنی ہیں ایک آدمی کے دل پر قابو اور اسے زندگی بھر کیلئے اپنا بنا لینا۔

۸۔مرد، ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ محبوب عورت کا اپنے مذہب وقوم میں داخل

کر لے۔

۹۔عورت کیلئے شادی کے بعد خاندانی نام، دین وعلت اپنے محبوب مرد کی خاطر بدل لینا آسان کام ہے۔

شاہ کار خلقت

زن ومر کے ایسے فرق جن سے دونوں کی خاندانی ذمہ داریوں اورحقوق میں فرق پیدا ہوتے ہیں یا نہیں۔ اس سے قطع نظر یہ مسئلہ بجائے خود خلقت کا شاہکار ہے، درس توحید ومعرفت خدا ہے جہاں وکائنات کے حکیمانہ ومدبرانہ نظام پر ایک آیت ونشان ہے۔ ایک واضح مثال ہے کہ خلقت کے معاملات کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں۔فطرت اندھیرے میں اندھے کی طرح رستہ نہیں طے کر رہی ہے۔علت غائی کے عمل دخل بغیر تخلیق وو جود کائنات آئے دن رونما نہیں ہو رہا ہے اس دعوے پر یہ بحث دلیل ہے۔

تخلیق کی عظیم قوت نے حفظ نوع اور مقصد تک پہنچنے کے واسطے تولید وتناسل کا انتظام کیا ہے۔اس کے کارخانے سے ہمیشہ جنس نر اور جنس مادہ وجود میں آرہی ہے۔ پھر نسل کی بقا ودوام کیلئے دونوں جنسوں کی باہم مدد اور تعاون ووحدت کی نیو رکھی ہے۔خصوصاً نوع انسان میں ان دونوں کی مدد سے وہ اس دور کو مکمل کر رہی ہے۔قوت تخلیق نے ہر صاحب حیات کی خاصیت خودخواہی ومنفعت طلبی کو خدمت وتعاون عفوو ایثار سے بدل دیا ہے۔ان کو ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا طلب گار بنا دیا ہے۔اس نے منصوبے کو عملی شکل دینے کیلئے اور دونوں کی جسم وروح کو جوڑنے کے واسطے عجیب قسم کی جسمانی وروحانی فرق رکھے ہیں۔تا کہ وہ آپس میں زیادہ سے زیادہ جذب وانجذب حاصل کر سکیں ایک دوسرے کے عاشق وطلب گار ہوں ۔اگر

عورت میں جسم وجان، خلق ومزاج مردانہ ہوتا تو مرد سے کام لینا اور مرد کو اپنا شیفتۂ وصال بنانا محال ہوتا۔ اور اگر مرد میں اوصاف جسمانی وروحانی وہ ہوتے جو عورت میں ہیں تو عورت اسے اپنی زندگی کا ہیرو نہ مانتی وہ اس کے دل کو جتینا اپنے فن شکار کا بہترین شاہ کار نہ سمجھتی۔ اصل مرد جہاں گیر اور زن مرد گیر پیدا ہوئی ہے۔

قانون خلقت نے زن ومرد کو ایک دوسرے کا طلب گار بنایا ہے۔ یہ ربط عام چیزوں کا عام چیزوں جیسا نہیں، وہ تعلق جو انسان خودخواہی سے محسوس کرتا ہے۔ یعنی انسان چیزوں کو اپنی خواہش کی بنا پر طلب کرتا ہے۔ انہیں استعمال کی نظر سے دیکھتا ہے۔ انہیں حاصل کر کے اپنے وجود وآرام پر قربان کرتا ہے میاں بیوی کا تعلق یہ کہ دونوں ایک دوسرے کی خوش نصیبی وراحت کی فکر میں رہتے ہیں خودفراموشی اور ایک دوسرے پر جاں نثاری سے لذت یاب ہوتے ہیں۔

خواہشات سے بلند تر رشتہ

بعض حضرات ’’شہوت‘‘ اور ’’رفت‘‘ (خواہش ودل جوئی) میں فرق نہیں کرتے۔ تعجب تو اس پر ہے۔ ان کے خیال میں میاں بیوی کو صرف لالچ اور شہوت کا رشتہ جوڑتا ہے۔ نفع اندوزی وحسن خدمت جیسے آدمی، کھانے پینے، پہننے اور سواریوں سے ربط رکھتا ہے۔ ان کو یہ معلوم نہیں کہ خلقت وفطرت میں خودخواہی اور نفع اندوزی کے علاوہ اور بھی رابطے موجود ہیں۔ یہ رابطے خودخواہی کے جذبے سے نہیں پیدا ہوتے۔ ان کے علاوہ سرچشموں سے ابھرتے ہیں وہ رشتے جان نثاری عفوودرگزر اپنی تکلیفوں کو بھولنا، غیر کی راحت وآرام کا خیال رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ رشتے انسان کی انسانیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ باتیں جانوروں کے یہاں بھی دکھائی دیتی ہیں جب وہ اپنی جفت یا بچوں پر وقت آنے یا حفاظت کے لمحے ان

کا اظہار کرتے ہیں۔

ان لوگوں کا خیال ہے کہ مرد ہمیشہ عورت کو اسی نظر سے دیکھتا ہے جیسے بے شادی شدہ جوان ایک ہرجائی عورت کو کبھی دیکھ لے۔یعنی دونوں کا تعلق شہوت کا ہے اور بس۔درحقیقت ایسا نہیں یہ رشتہ شہوت سے بالاتر ہے۔اور وہی بلند بندھن دونوں کا پیوند ملاتا ہے۔وہ رشتہ عالی قرآن مجید کی زبان سے ''مودت ورحمت'' کہنا چاہیے:

وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنۡ خَلَقَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡكُنُوۡۤا اِلَيۡهَا وَجَعَلَ بَيۡنَكُمۡ مَّوَدَّةً وَّرَحۡمَةً ؕ

اوراس کی نشانیوں میں سے ہے اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس میں جوڑا پیدا کیا کہ تم اس کے پاس سکون حاصل کرواورتم دونوں ''مودۃ'' (پرخلوص محبت)اوررحمت (مہربانی) پیدا کی۔(سورہ روم۔21)

کتنی بڑی غلط فہمی ہوگی ،اگر ہم تاریخ روابط زن وشوہر فقط خدمت حاصل کرنے اور استحصال اورتنازع بقاء کے نام سے تعبیر کریں اورکیا کیا مہمل باتیں اس سلسلے میں کئی گئی ہیں۔ سچ عرض کرتا ہوں بعض اوقات ان تحریروں کو پڑھتا اور دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔یہ لوگ زن ومرد کے روابط کی تاریخ میں صرف ایک اصل اورایک قانون استعمال کرتے ہیں۔''تضاد'' زن ومرد،سماجی دوطبقوں کی طرح الگ الگ برسرپیکار رہنے والے دوطبقے ہیں۔ان کے مفروضے ہر تعجب اوران کی جہالت ونادانی پرغم کھاتا ہوں۔اگر والدین اوراولاد کی تاریخ روابط کو استثمار اورحسن خدمت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے تو روابط زن ومرد کی تاریخ بھی اس نظر سے دیکھی جاسکتی ہے۔ٹھیک ہے۔مرد ہمیشہ عورت سے زیادہ زورآور تھا۔لیکن قانون خلقت نے مرد کے خمیر کو ایسا بنایا ہے کہ وہ غلاموں اورکنیزوں اورکمزوروں کی طرح اپنی بیوی پرظلم

وستم کو روانہ رکھے، جیسے وہ سلوک اپنی اولاد پر جائز نہیں جانتا۔

مرد عورتوں پر ستم کرتے ہیں۔ میں اس کا منکر نہیں ہوں۔ہاں، وہ تشریح نہیں مانتا جو اس رویے کے بارے میں کی جاتی ہے۔مردوں نے پوری تاریخ میں عورتوں پر بہت ستم ڈھائے ہیں۔لیکن ان مظالم کی بنیاد وہی اسباب تھے جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی محبوب اولاد پر ستم ڈھائے تھے۔بلکہ انہیں اسباب کی بنا پر خود انسان نے اپنے اوپر بھی ظلم کیے۔اس کی بنیاد تھی جہالت وعادت یا تعصب اس کا حس فائدہ طلبی سے کیا تعلق۔اگر کبھی مناسب وقت ملا،تو تاریخ تعلقات زن وشوہر پر تفصیلی گفتگو کروں گا۔

زن ومرد کے باہمی نفسیات واحساسات

گھریلو رابطہ ہی عورت ومرد میں مختلف چیزوں کے روابط میں فرق پیدا نہیں کرتا، بلکہ خود ان دونوں کا باہمی تعلق بھی مشابہ رہتا ہے مرد کا عورت سے رابطہ اور اس کی نوعیت ویسی نہیں ہوتی جو نوعیت عورت کی رشتے کی بنیاد پر مرد سے ہوتی ہے دونوں میں دونوں طرف سے فرق ہوتا ہے۔طرفین میں کشش کے باوجود لیکن اجسام بے جان کے برعکس چھوٹا جسم بڑے جسم کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔کیونکہ قوت تخلیق نے مرد کو مظہر طلب وعشق اور عورت کو مظہر محبوبیت ومعشوقیت بنایا ہے مرد کے احساسات نیازمندانہ عورت کے احساسات نازآفرینی ہے۔ مرد کے احساسات طالبانہ اوراحساسات زن مطلوبانہ ہیں۔

کچھ دن ہوئے ایک روزنامے میں اس روسی لڑکی کی تصویر چھپی تھی جس نے خودکشی کی تھی۔اس نوجوان لڑکی نے ایک تحریر چھوڑی جس میں تھا کہ مجھے اب تک کسی مرد نے نہیں چھوا اس لئے مجھے زندگی برداشت نہیں۔

ایک لڑکی اگر کسی مرد کی محبوب نہیں بن سکتی تو اپنے اندر بہت بڑی شکست محسوس کرتی ہے۔ اسے کسی مرد نے چھوا نہیں ۔تو جوان لڑکا زندگی سے کب مایوس ہوتا ہے؟ جب اس کو کسی لڑکی نے چوما ہو؟ نہیں ۔ وہ مایوس اس وقت ہوتا ہے جب کسی لڑکی کو چوم سکے۔

طویل اور جامع بحث کے دوران ''ویل ڈیورانٹ'' لکھتا ہے اگر شوہر کے حصول میں دخترانہ امتیاز فقط علم وفکر میں ہوتا۔ دل ربائی وبھول پن اور چالاکی بے کار ہو جاتی تو ساٹھ فی صد اعلی تعلیم یافتہ لڑکیاں بن بیاہی نہ رہتیں............

''اعلی درجے کی مفکر وتعلیم یافتہ خاتون بیگم مونیا کوالوسکی'' شکایت کرتی تھیں، کوئی شخص ان سے شادی نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا: مجھے کوئی کیوں نہیں چاہتا؟ میں دوسری عورتوں سے بہتر ہوسکتی ہوں، باوجود اس کے بے حیثیت وکم اہمیت عورتوں سے عشق کیا جاتا ہے مگر مجھ سے نہیں۔

آپ نے دیکھا، یہ محترمہ کس طرح کے احساس شکست میں مبتلا ہیں اور وہ بھی مرد کے مقابلے میں وہ کہتی ہیں مجھے کوئی کیوں نہیں چاہتا؟

مرد، اس وقت شکست محسوس کرتا ہے جب شادی کے مرحلے میں وہ اپنی محبوبہ کو حاصل نہ کر سکے یا محبوبہ تو مل جائے مگر وہ اس کے قابو میں نہ آئے۔

ان سب چیزوں کا ایک فلسفہ ہے ۔گہرا اور مضبوط اتحاد وتعلق ۔ یہ رشتہ استوار کیوں درکار ہے؟ تاکہ زن ومرد زندگی سے زیادہ لذت حاصل کرسکیں ؟ نہیں! فقط یہی نہیں انسانی معاشرے کی اساس اور نسل آئندہ کی نیو اس سطح پر استوار ہوتی ہے۔

ماہر نفسیات خاتون کا نظریہ

رسالہ ''زن روز'' شمارہ ایک سو ایک میں ''کلوڈ االسن'' کے قلم سے ایک نفسیاتی بحث شائع ہوئی ہے۔

یہ محترمہ خاتون کہتی ہے:

ایک خاتون نفسیاتی ماہر کے طور پر میرا سب سے زیادہ رجحان مردوں کے نفسیات کے مطالعے کی طرف تھا۔ کچھ دن پہلے مجھے یہ ذمہ داری سونپ گئی کہ میں زن و مرد کے نفسیاتی عوامل پر تحقیق کروں، اس تحقیق کے نتیجہ میں مجھے معلوم ہوا:

ا۔تمام عورتوں کی خواہش ہوتی ہے کہ کسی شخص کی نگرانی میں کام کریں انہیں محکوم ہونے اور نگران کار کے ماتحت کام کرنے میں خوشی ہوتی ہے۔

۲۔عورتیں یہ چاہتی ہیں کہ لوگ ان کے وجود کو موثر اور ان کو نیاز مندی کا مرکز جانیں اس کے بعد یہ محترمہ اپنی رائے کا اظہار یوں کرتی ہیں۔

میرے خیال میں ان دونوں نفسیاتی احساسات کی بنیاد یہ ہے کہ خواتین جذبات کی تابع اور مرد عقل کے تابع ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ خواتین ہوشمندی میں مردوں کے برابر ہی نہیں بلکہ بعض اوقات اس معاملے میں وہ برتر بھی نکلتی ہیں۔خواتین کا نقطہ کمزور فقط ان کے جذبات کی شدت ہے۔ مردوں کی سوچ ہمیشہ عملی ہوتی ہے وہ بہتر فیصلہ کرتے ہیں۔ اچھے قسم کا نظم ونسق قائم کرتے ہیں، ان کی رہنمائی اچھی ہوتی ہے۔ لہٰذا مردوں کی برتری کا سبب خود فطرت کی اساس ہے۔ اس حقیقت سے عورتیں جتنی بھی ٹکر لیں۔ فائدہ مند نہ ہوگا۔خواتین، مردوں سے زیادہ حساس ہیں لہٰذا انہیں یہ باور کرنا چاہیے کہ انہیں زدگی میں مردوں کی سرپرستی درکار ہے ...... خواتین کا مقصد زندگی حفاظت ہے ۔جب انہیں یہ مقصد حاصل ہوجاتا ہے۔ اسی وقت کام

سے ہاتھ روک لیتی ہیں۔اس مدعا کو حاسل کرنے کیلئے خطرات کا سامنا کرتے ہچکچاتی ہیں ان کا احساس خوف ایک ایسا احساس ہے جسے دور کرنے کیلئے مدد کی ضرورت پڑتی ہے جن کاموں میں لگاتار سوچنا پڑتا ہو،عورتوں کوتھکا دینے والے کام ہیں............

جلد بازی کا انقلاب

عورتوں کے پامال شدہ حقوق کی بحالی کیلئے جو انقلاب برپا ہوا اس میں بہت زیادہ بے حواسی اور جلد بازی سے کام ہوا، وجہ یہ تھی کہ انہیں یہ خیال ہی دیر میں آیا۔ ان کے جذبات نے مہلت نہ دی کہ علم ان سے اپنا فیصلہ کہتا اور اسے رہنما بناتا۔ آخر کار خشک وتر سب کچھ جل گیا۔اس سلسلے سے عورتوں کی کچھ محرومیاں کم ہوئیں مگر حقوق کچھ زیادہ دیے گئے۔ بند روازے کھولے مگر بدبختیاں اور بے چارگیا بدلے میں زیادہ ملیں۔ یہ سب کچھ خواتین ہی کو نہیں بلکہ معاشرے کے مقدر کو بھی ملا۔ طے شدہ بات ہے اگر اتنی جلد بازی نہ ہوتی تو خواتین حقوق بہت اچھے انداز میں ملتے اور حالات کی ابتری سے دانشوروں کی چیخ پکار حال اور مستقل کے واسطے ان کی یہ گھبراہٹ اور فریاد فلک تک نہ پہنچتی البتہ امید باقی ہے۔علم ودانش راہ نکالے گی ۔انقلاب خواتین جذباتیت کے بجائے علم ودانش پر قائم ہوگا۔یورپ کے دانش وروں کے نظریات کا اظہار اس بارے میں امید افزا ہے۔

یہ دکھائی دے رہا ہے۔جن باتوں نے مقلدین مغرب کو نشے میں مدہوش کررکھا ہے جو اہل مغرب اس نشے کے خمار اور آخر لمحات میں پہنچ رہے ہیں۔ان کا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔

ویل ڈیورینٹ کا نظریہ

لذات فلسفہ حصہ چہارم میں ویل ڈیورنٹ نے جنسی وعائلی مسائل پر تفصیلی بحث کی ہے۔اہم اس کتاب سے اپنے پڑھنے والوں کے لئے کچھ اقتباسات لکھیں گےاس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ مغربی افکار کے رویے دیکھیں اور جلد بازی کے فیصلوں سے احتیاط کریں۔

حصہ چہارم فصل ہفتم میں ''عشق'' کا عنوان قرار دے کر کہتا ہے:

''عشق کا پہلا صاف نغمہ،آغاز بلوغ میں شروع ہوتا ہے۔(Puberty) پیوبرٹی جس کے معنی انگریزی میں ''بلوغ'' ہیں،لاتینی اصل کی بنا پر اس کا مطلب ہے ''بالوں کا سن'' وہ عمر جب لڑکے کے بدن پر بال اگنے شروع ہوتے ہیں۔خاص کر ''سینے کے بال'' جن پر لڑکے کا نز دکھاتے ہیں اور چہرے کے بال ترشوانے میں سی سی پوس[1] (Sisyphus) کی طرح جبر اٹھاتے تھے۔ بالوں کو تراش خراش دونوں پہلوؤں کے بالوں کی چھوٹ ۔بظاہر قوت توالد وتناسل سے وابستہ ہے اس کی بہترین شکل اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب نشاط زندگی اپنے عروج پر پہنچتا ہے۔بڑھوتری کا یہ زمانے بالوں کے ساتھ اچانک آواز میں سختی بھی لے آتا ہے ۔یہ جنس کی ثانوی صفت ہے جو لڑکوں کے بلوغ پر انہیں عارض ہوتی ہے۔اسی عمر میں لڑکیوں کو فطرت کی طرف سے اعضا وحرکات میں لوچ اور لچک عطا ہوتی ہے جس سے آنکھوں میں خیر گی آتی ہے،ان کے کولھے چوڑے ہوجاتے ہیں کہ ماورانہ عمل آسان ہو،سینہ بھر جاتا ہے پستان ابھر آتے ہیں کہ بچوں کو دودھ پینے میں سہولت ہو،ان ثانوی خصوصیات کے ظہور کی علت کسی کو معلوم نہیں۔

---

[1] سی سی پوس ایک قدیم انسانوی بہادر جس کا صبر مشہور تھا،مصنف کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانے میں بال کٹوانے اور منڈوانے میں بڑی سختی جھیلنا پڑتی تھی۔کیونکہ خط بنانے کے اوزار دستیاب نہ تھے۔اس کے باوجود لڑکے صبر ایوب کا مظاہر کرتے اور خط بنواتے تھے۔

پروفیسر اسٹرلنگ کے نظریے نے کچھ حامی پیدا کیے ہیں ان کا خیال ہے بلوغ کے دوران نہ صرف تناسل خلیے نطفہ پیدا کرتے ہیں بلکہ ایک نوع کے ''ہرمون'' بھی بتاتے ہیں جوخون نین داخل ہوکر جسمانی ونفسیاتی تبدیلیاں بھی لاتے ہیں۔اس عمر میں جسم میں نئی قوت توجنم لیتی ہی ہے خودروح اورمزاج وعادات میں بھی ہزاروں قسم کے تاثرات کروٹ لینے لگتے ہیں۔رومن رولانڈ کے بقول: زندگی کے برسوں میں ایک زمانہ وہ آتا ہے جب جسمانی تبدیلیاں آہستہ سے ایک مرد کا وجود مرد میں اور ایک عورت میں بدل دیتی ہیں یہی بڑی تبدیلیاں ہیں.......... دلیری وتوانائی نرم دلوں کو گرم کرکے پگھلاتی ہے اور نرمی ولطافت زدرآورں کی ہوس کو بھڑکاتی ہے۔

دی ہوسا کہتا ہے:

سب مرد جھوٹے مکار شیخی خورے دورخ ،جھگڑالو ہوتے ہیں اورتمام عورتیں خود پسند دکھاوے اورخیانت کی عادی ہوتی ہیں، ہاں دنیا میں فقط ایک چیز بلند ومقدس ہے اور وہ ہے ان دونوں ناقصول کا بندھن..........

جوڑے کی تلاش بڑی عمر کے آدمیوں میں ایک طرف تو مردوں پر تسلط طلبی کیلئے ہوتا ہے اور دلبری ودل ربائی سے فرار کی خاطر عورتوں کیلئے۔(مگر یہ مکمل کلیہ نہیں ہے) چونکہ مرد فطری طور پر جنگ جواور شکاری جانور واقع ہوا ہے اس وجہ سے اس کا عمل مثبت اورحملہ آوری ہے۔ اس کیلئے عورت ،انعام ہے جو اسے حاصل کرنا چاہیے۔وہ اسے اڑالینا اراس کے مالک بننا چاہتا ہے۔بیوی کی تلاش جنگ وپیکار ہے اورشادی،شریک زندگی کی تلاش اور اقتدار ہے۔

عورت میں پاک دامنی کی فراوانی توالدوتناسل کی خدمت انجام دیتی ہے کیونکہ پردہ نشینی انتخاب جنس میں مددگار رہوتی ہے۔پاک دامنی عورت کوقوت بخشتی ہے وہ اپنے عاشق کی جستجو میں بہت مشکلیں اٹھاتی ہے۔عاشق سے مراد اس کا وہ ساتھی

جواس کی اولاد کے باپ بننے کا فخر حاصل کرے۔

عوت کی زبان سے گروہ اور نوع خواتین کے فائدے کی بات ہوتی ہے اور حلقوم مرد سے فرد کے فائدے پر گفتگو۔

عشق کے کھیل میں عورت مرد سے زیادہ ماہر ہے۔ کیونکہ اس کے رجحان میں اتنی شدت نہیں ہوتی کہ عقل کی آنکھ اسے دیکھ سکے۔

ڈارون نے مطالعہ کیا ہے کہ ماہ جان داروں میں دنیائے عشق سے تعلق رکھنے والے مخلوق کم ہے۔

لمیرزو کیچ اور کرافٹ ایبینگ کہتے ہیں:

عورتیں مردوں کی مکھم تعریفوں کے پیچھے ہو لیتی ہیں وہ مردوں سے اپنی خواہشات پر زیادہ توجہ کی طلب گار ہوتی ہے اس کا سبب ان کا جنسی لذت سے گہرا تعلق ہے۔

ملبرزو کہتا ہے:

عورت میں عشق کا عنصر ایک ثانوی صفت ہے جو اس نے ماں سے لی ہے۔ اس کے علاوہ تمام جذبات واحساسات جو ایک عورت کو مرد سے ملاتے ہیں۔ وہ جسمانی اسباب کے پیدا کردہ نہیں بلکہ اس کے خمیر سے سر اٹھاتے ہیں جن میں یہ جس پوشیدہ ہوتی ہے کہ وہ کسی کی تابع اور کسی کی سپردگی میں۔ مرد کی حمایت اسے حاصل ہو، وہ اپنے حالات کو اپنے وجود کے معاملات کو اس سے منطبق کرنا چاہتی ہے۔

ول ڈیورینٹ نے ''مردوعوت'' کے عنوان سے ایک فصل میں لکھا ہے:

عورت کا خاص کام بقاءنوع کی خدمت ہے۔

مرد کا خاص کا عورت اور بچے کی خدمت ہے۔ اور دونوں اس اساسی کام کیلئے حکمت وتدبیر کے پابند کیے گئے ہیں۔ یہ بنیادی مقصد ہیں۔ مگر آدھی مخلوق بے خبر ہے۔ حالانکہ انسان وخوش نصیبی کی روح اس میں پوشیدہ ہے............

عورت مرد سے زیادہ صابر ہوتی ہے اگر چہ بڑے بڑے کام اور بہادری کے معاملے اور زندگی کے بحران میں مرد کی شجاعت زیادہ کام دکھاتی ہے۔لیکن لگاتار تحمل وبرداشت، چھوٹے چھوٹے پریشان کن حالات اور تکالیف میں عورت کا صبر زیادہ ہے۔

عورت کی جنگ جوئی ایک دوسرے وجود میں ہوتی ہے۔عورت فوج پسند کرتی ہے سپاہی اسے اچھا لگتا ہے۔دلیری کے مظاہروں میں اس کے اندر ایک عجیب محرک پیدا ہوجاتا ہے۔ جسے میچوسیٹیتک (Masochistic) کہا جاتا ہے۔وہ اس وقت موت کی پروا چھوڑ دیتی ہے۔

......اس کی پرانی خوشی اور قوت ومردانگی سے لذت اندوزی کبھی نئی عورت کے جذبات سرمایہ دوستی پر غالب آجاتی ہے۔کبھی کبھی تو وہ پاگل بہادر سے بھی شادی کرنے پر تیار ہوجاتی ہے۔

عورت ایسے شخص سے بخوشی شادی کرنا چاہتی ہے جوشہر کا حاکم ہو۔اگر چہ آج کل بیوی کی فرمانبرداری کم ہوچکی ہے لیکن اس میں کچھ مردوں کی قوت اور اخلاقی کمزوری کا بھی دخل ہے۔

......عورت کی توجہ گھریلو معاملات پر مرکوز رہتی ہے اس کا ذہنی پس منظر عموماً اس کا گھر ہوتا ہے۔

عورت فطرت کی طرح بہت گہری ہے مگر گھر کی طرح اپنی اندر محدود۔

عورت کا خمیر اسے پرانے رسم ورواج سے باندھے رکھتا ہے۔

عورت نہ تجربہ کاروں کے ذہن میں آتی ہے نہ عادت میں۔

اس میں بڑے شہروں کی عورت مستثنیٰ ہے۔وہ اگر عشق میں آزادی چاہتی ہے تو اس کی وجہ کسی ذمہ دار مرد کی شادی سے اس کی مایوسی ہے۔

اگر جوانی میں کبھی اسے سیاہی اصطلاحات اور سیاہی باتوں سے دلچسپی رہی ہو،تو

اس وقت بھی وہ اپنے ہی جذبات کو تمام انسانوں میں پھیلاتی ہے۔ اور ایک وفادار شوہر کے ملتے ہی وہ اپنی تمام سرگرمیاں چھوڑ بیٹھتی اور شوہر کو وفاداری کا جذبہ یاد دلا کر گھر کا پابند کر دیتی ہے۔

عورت سوچے بغیر یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ اچھے قسم کے اصلاحی کام گھر سے شروع ہوتے ہیں۔ جب عورت اپنے سرگردان مفکر شوہر کو، گھر کا فدائی اور اپنے بچوں کا پابند بنا لیتی ہے تو اصل میں اس کا سبب احساس حفظ و بقاء نوع ہوتا ہے۔

عورت کا عشق گھر اور بچوں سے ہوتا ہے۔ اگر وہ ان کی نگہداشت میں کامیاب ہوگی تو اسے دولت وحکومت کی پرواہ نہیں رہتی۔ جو لوگ اس نظام کو بدلنا چاہتے ہیں، یہ عورت ان کا مذاق اڑاتی ہے آج کی عورت فطرتاً اگر خاندان اور بچوں کی دیکھ بھال میں کمزور نظر آتی ہے تو اس کا سبب اس کا شہری ہونا ہے وہ اپنی فطرت کو بھول گئی ہے لیکن فطرت کی شکست دائمی نہیں ہوتی۔ وہ جب چاہے اپنے اندر کے ذخیروں اور دفینوں کے سہارے پلٹ سکتی ہے۔

دنیا میں پھیلاؤ اور عدد کے اعتبار سے بہت سی قومیں اور نسلیں ہم سے زیادہ موجود ہیں۔ ان قوموں نے اپنی فطرت کے قوانین محفوظ اور باقی لامحدود رکھے ہیں [1]

زن و مرد کا یہ مختصر سا تعارف اختلاف جو ہم ن اس مسئلہ کے ماہرین کے نظریات کی روشنی میں پیش کیا۔

''راز تفاوتہا'' ناہمواری کے راز کچھ تاریخی عوامل کا جائزہ بھی لینا چاہتا تھا کہ کس حد تک اس کے اثرات میں؟ مگر مطالب کا دامن موضوع سے آگے نکل جائے گا اس لئے نظر موڑتا ہوں۔ گفتگو کے ضمن میں کچھ باتیں روشن ہوتی جائیں گی۔

---

[1] ایک علاقے کا سروے اور زمین پھیلی ہوئی کروڑوں قبیلوں اور نسلوں کو چھوڑ کر نتائج پر بحث اور ان پر اپنے فلسفہ وقوانین کی عام بنیاد رکھنا غلط ہے۔

آٹھواں حصہ

مہر اور زنان ونفقہ

مہر ونفقہ عورت کی کنیزی کے دور کا بقہ ہے؟

قرآن مجید نے مہر کو مرد کی طرف سے عورت کو ہدیہ اور اس کے خلوص کی نشانی کہا ہے۔

مہر کا نفقہ اول ،فطرت کا وہ تقاضہ ہے جو عشق کی بنیاد پر مرد اور عورت سے دو الگ الگ چیزیں چاہتا ہے۔

اسلام نے مہر کے بارے میں جاہلیت کی رسمیں منسوخ کر دیں۔

عورت کا عشق اگر خود اس کی طرف سے شروع ہو تو عشق بھی شکست کھا تا ہے اور عورت کی شخصیت بھی ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔

ہمیں ان مردوں کی اصلاح کرنا چاہیے جو اسلام قانون پر عمل نہیں کرتے ۔قانون کو حراب کرنے کی ضرورت کیا ہے؟

مہر کا سسٹم اسلام سے مخصوص ہے اس کو ہر سسٹم سے الگ ہو کر دیکھنا چاہیے

یورپ نے سو سال اور اسلام نے چودہ سو برس پہلے عورت کو اقتصادی آزادی دی ہے۔

فقہ اسلامی کے نقطہ نظر سے نفقہ کی تین قسمیں۔

یورپ کی خواتین مشین کی شکر گزار ہوں قانون سازی کی نہیں۔

اسلام نے اقتصادی آزادی دی خانہ بربادی نہیں۔

عورت ،سرمایہ مرد کے کم حاصل کرتی ہے ا اور سرمایہ استعمال زیادہ

کرتی ہے۔

آج کا مرد چاہتا ہے نفقہ کا حق ختم کر کے ،عورت سے فکری قید کا انتقام لے۔

عورت کا حق نان ونفقہ شوہر سے ختم کرنا شکاری مردوں کی راہ ہموار کرنا ہے۔

کیا منشور حقوق انسانی نے عورت کی توہین کی ہے؟

مہر اور نفقہ (۱)

شادی کے مرحلے میں مرد ''مہر'' مانے ۔اور اپنی ملکیت مال یا املاک میں سے کچھ رقم لڑکی کے باپ یا ماں کو دے۔

جب تک میاں بیوی کے تعلقات باقی رہیں ،شوہر، بیوی بچوں کے تمام اخراجات پورے کرے۔

خانگی رشتوں کے بارے میں انسانوں کی یہ پرانی رسم چلی آ رہی ہے۔

اس رسم کی بنیاد کیا ہے؟ یہ رسم کیوں اور کیسے شروع ہوئی ؟ یہ مہر کی مد کیا ہے؟ عورت کو نفقہ دینا، یعنی چہ؟

اگر زن و مرد اپنے فطری و انسانی حقوق سے بہرہ ورہوں اور ان میں عادلانہ و انسانی رشتے برقرار ہوں ، بیوی سے انسان جیسا رویہ حکمران ہو تو بھی مہر و نان ونفقہ کا سوال پیش آ سکتا ہے؟ ایسا تو نہیں کہ مہر و نان ونفقہ اس زمانے کی یادگار ہو جب بیوی شوہر کو مملوک ہو کرتی تھی؟

عدل اور حقوق انسانی کی برابری --خصوصاً بیسویں صدی کا-- تقاضہ یہ ہے کہ مہر و نان ونفقہ کا سسٹم ختم کیا جائے۔شادیاں ، بلا مہر ہوں ،نفقہ کا مسئلہ ختم کیا جائے عورت خود اپنی مالی ذمہ داریاں برداشت کرے، اولاد کے معاملات میں بھی دونوں برابر کے کفیل ہوں۔

تو ہم مہر سے بات شروع کرتے ہیں۔ دیکھتے ہیں مہر، کیسے پیدا ہوا، اس کا فلسفہ کیا ہے اور ماہرین معاشرتی علوم نے مہر کی وجہ کیا بیان کی ہے؟

مہر کا تاریخچہ

کہا جاتا ہے قبل از تاریخ انسان وحشیانہ زندگی گزارتا قبیلوں کی صورت میں رہتا، اور نامعلوم اسباب کی بنا پر اپنے خون شریک سے شادی کرنا جائز نہیں جانتا تھا۔ شادی کے خواہش مند جوان مجبوراً دوسرے قبیلے سے معشوقہ و شریک زندگی مانگتے جاتے تھے۔ ان دنون مرد اولاد کی پیدائش میں اپنا کردار نہیں جانتا تھا۔ اسے واقفیت نہ تھی کہ جنسی عمل، پیدائش اولاد میں موثر ہے۔ اولاد کو بیوی کی اولاد سمجھتے تھے اپنی اولاد نہیں جانتے تھے۔ نسب باپ کے بجائے ماں کے نام سے منسوب کرتے تھے۔ بچوں میں باپ سے مشابہت محسوس تو کرتے تھے مگر اس کی وجہ معلوم نہ تھی۔ ان کے نزدیک مرد قوت تولید سے محروم مخلوق تھی، شادی کے بعد شوہر ایک ضمنی شخصیت کے طور پر بیوی کے ساتھ اسی کے قبیلے میں رہتا اور بیوی اس کی جسمانی قوت اور رفاقت سے فائدہ اٹھاتی تھی۔ اس عہد کو ماں کی حکومت کا دور کہتے ہیں۔

جلد ہی مرد کو عمل تولید میں اس کا حصہ معلوم ہو گیا اب وہ فرزند کا اصل مالک بن گیا۔ اس وقت سے اس نے عورت کو اپنا تابع بنالیا اور خود گھر کا سربراہ بن گیا۔ یہاں سے ''باپ کی حکومت'' کا عہد شروع ہوا۔

اس پیریڈ میں بھی خونی رشتوں سے شادی جائز نہ تھی۔ مرد کو دوسرے قبیلے میں بیوی ڈھونڈھنا، پھر اسے اپنے قبیلے میں لانا پڑتا تھا۔ قبائل میں عموماً جنگ رہتی تھی لہٰذا، لڑکی کو لے بھاگنا پڑتا، یعنی جو نوجوان لڑکی ،لڑکے کو پسند آتی ہے اسے اس کے قبیلے سے نکال لاتے تھے۔

آہستہ آہستہ جنگ کے بجائے صلح کا راج ہوا، اور مختلف قبائل مل جل کر جینے کے ڈھنگ سیکھ گئے۔ اب لڑکی کو بھگا لے جانے کی ضرورت نہ رہی۔ لڑکا اپنی

پسندیدہ لڑکی حاصل کرنے، دوسرے قبیلے جا کر لڑکی کے باپ کی خدمت مزدوری کرتا، باپ اس کی محنت مزدوری کے بجائے اپنا داماد بنا لیتا اور لڑکا اسے اپنے قبیلے لے جاتا۔

دولت میں اضافہ ہوا تو مردوں نے سوچا مدتوں منگیتر کے باپ کی خدمت کرنے سے بہتر یہ ہے کہ مناسب ہدیہ اسے پیش کر کے منگیتر لے لی جائے۔ یہاں سے ''مہر'' ایجاد ہوا۔

اس ترتیب کی بنیاد پر پہلے دور میں شوہر بیوی کا پچھ لگو اور خدمت گار تھا عورت مرد پر حکومت کرتی تھی۔ اس کے بعد حکومت مرد کے ہاتھ آئی مرد، دوسرے قبیلے سے عورت اٹھا لاتے تھے۔ تیسرا دور وہ آیا جب لڑکا منگیتر کے گھر جاتا، باپ سے مل کر بات کرتا ہے اور منظوری کی صورت میں یہ لڑکا خدمت گاری بجالاتا اور محنت مزدوری کر کے ہونے والے سسرے کو راضی کرتا تھا۔ چوتھا مرحلہ وہ تھا جہاں مرد ،ایک معین رقم ''پیش کش'' کے طور پر لڑکی کے باپ کو دیتا تھا یہاں سے ''مہر'' کا سلسلہ شروع ہوا۔

کہتے ہیں، مرد نے جب ''ماں کی حکومت'' کا دور ختم کر کے ''پادرشاہی'' کا عہد شرع کیا تو عورت کم از کم مزدور بنالی گئی اسے ایک اقتصادی ذریعہ سمجھ لیا گیا، اس سے کبھی کبھی جنسی تسکین بھی حاصل کی جاتی تھی۔ اس نے عورت کو معاشرتی واقتصادی آزادی نہیں دی اس کی محنت مزدوری کا ثمر باپ یا شوہر کو ملتا تھا۔

عورت اپنی پسند سے شوہر نہیں چن سکتی تھی۔

عورت خود مختار اقتصادی و مالی حیثیت کی مالک نہ تھی۔

دراصل مہر جیسی چیز اور نان ونفقہ کے نام سے جو اخراجات ہوتے تھے اس کے صلے میں بیوی سے یک جائی کے زمانے تک جو محنت مزدوری لیتا تھا اس کا عوضانہ تھا۔

مہر۔ نظام قانون اسلامی میں

انسانی معاشرے کی ترقی کا پانچواں دور جسے علوم معاشرہ کے ماہرین نے فراموش کر دیا اور اہل نظر خاموش گزر گئے۔ یعنی وہ دور جب شادی کے وقت اپنی طرف سے براہ راست عورت کو کچھ پیش کش کرنے لگا۔ لڑکی کے ماں، باپ اس کی ''پیش کش'' پر کوئی حق نہیں رکھتے۔ عورت پیش کش قبول کرتے ہی اپنی معاشرتی واقتصادی آزادی محفوظ کر لیتی ہے۔

اولاً: وہ اپنا شوہر خود اپنے ارادے سے منتخب کرتی ہے ماں اور باپ کے ارادے سے نہیں۔

ثانیاً: جب تک باپ کے گھر میں رہے اور جب سے شوہر کے گھر جائے کسی کو حق نہیں کہ اس سے خدمت گاری لے اور استثمار کرے۔ محنت مشقت سے جو کمائے وہ اسی کی ملکیت ہے۔ دوسرے کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ اپنے حقوق کے معاملات میں کسی سربراہ مرد کی محتاج نہیں ہے۔

مرد عورت سے فائدہ اٹھانے کے معاملے میں فقط یہ حق رکھتا ہے کہ رشتے کی مدت میں اس کے وصال سے بہرہ مند ہو۔ اس پر ذمہ داری ہے کہ جب تک رشتہ ازدواج باقی ہے اس سے وصال کرتا رہے اور اس کی زندگی کی نگہداشت رکھے۔

اس نظام کو قرآن نے قبول کیا ہے۔ اس نے شادی کی اساس یہی مانی ہے۔ قرآن کریم میں متعدد وآیتیں بتاتی ہیں کہ۔ مہر۔ عورت کا مال ہے کسی کا اس پر حق نہیں۔

مرد کو شادی کو پوری مدت تک بیوی کے اخراجات کی ذمے داری پوری کرنا ہوگی اس زمانے میں محنت مزدوری کام کاج کر کے جو کچھ کمائے وہ اس کی ذاتی ملکیت

ہے۔ باپ یا شوہر کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

یہاں پہنچ کر ''مہر ونفقہ'' معمابن جاتا ہے۔ جب مہر باپ کی ملکیت ہوتا تھا، اس وقت لڑکی اپنے شوہر کے گھر میں لونڈی کے طور پر آتی اور شوہر اس سے ہر قسم کا فائدہ اٹھاتا تھا۔ اس وقت مہر کا فلسفہ تھا، باپ سے لڑکی خریداور ضروری اخراجات نان ونفقہ کا فلسفہ تھا وہ اخراجات جو ہر مالک اپنی مملوک چیز پر کیا کرتا ہے۔ یہ صورت کہ باپ کو کچھ نہ دیا جائے۔ شوہر کو استثمار کا حق نہ ہو، بیوی سے اقتصادی فوائد نہیں لے سکتا بیوی، اقتصادی پہلو سے مکمل طور پر آزاد ہے۔ اسے حقوق کے لحاظ سے بھی کسی ''قیمومت'' سر براہی وسر پرستی واجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر مہر دینا اور زن ونفقہ ادا کرنا کیا ہے؟

تاریخ پر ایک نظر

پانچویں مرحلے میں ''مہر ونان ونفقہ'' کے فلسفے کی چھان بین کے وقت ہمیں گزشتہ چار دوروں پر تھوڑی توجہ خاص دینا ہوگی۔ دراصل اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ غیر یقینی مفروضے اور تخمینے ہیں اور بس۔ نہ وہ تاریخی حقائق میں نہ علم وتجربہ کے نتائج۔ قبل از تاریخ انسانی زندگی کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے ان کی بنیاد کچھ علامات وقرائن ہیں اور کچھ فلسفیانہ مفروضے جن سے انسان اور کائنات پر گفتگو کی جاتی ہے۔

''مادرشاہی'' -- ماں کی حکومت کا عہد۔ ایک اصطلاح ہے اس ضمن میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ آنکھیں بند کر کے تو ماننے والی باتیں نہیں ہیں۔ اسی طرح باپ کا لڑکیاں بیچنا یا شوہروں کا عورت سے ناجائز فوائد حاصل کرنا ان کا استثمار جلدی مانی جانے والی چیز تو نہیں ہے۔

ان اندازوں اور مفروضوں کے اندر دو چیزوں پر نظر جمتی ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ کوشش ثابت کیا گیا ہے کہ ابتدائی دور کا انسانی حد سے زیادہ سخت دل اور درست مزاج تھا، احساسات انسانی تو تھے ہی نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ فطرت اپنے مقاصد حاصل کرنے کیلئے جو حیرت انگیز تدابیر اختیار کرتی ہے اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔

اس قسم کی تشریح اور اس طرح کے نظریے انسان وفطرت کے بارے میں اہل مغرب کیلئے تو ممکن نہیں۔ یورپین خاص اسباب کی وجہ سے انسانی جذبات سے بیگانہ ہے۔ وہ مجبور ہے اس سے ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ بنیاد تاریخ میں جذبات اور انسانیت کی جھلکیاں دیکھے اور مانے ۔وہ تو اگر اقتصادیات کے مسائل چھوڑ کر اٹھتا ہے تو روٹی دیکھتا ہے۔

اس کی نظر میں تاریخ مشین کا نام ہے جب اسے کچھ کھانے کو نہ دیا جائے (فیڈ نہ کیا جائے) چلے ہی گی نہیں۔ اگر جنسی مسائل کے گیر میں گیا تو انسانیت و تاریخ بشریت اپنے تمام ثقافتی وہنری، اخلاقی و مذہبی تجلیوں اور روحانی جاہ وجلال سمیت صرف جنس کی بدلتی صورتوں میں کھیل کھلونے ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ اور اگر...... سرداری اور برتری کے گیر میں چلا گیا تو سرگزشت بشریت ان کے نزدیک یکسر خون ریزی و بے رحمی ہے۔

اہل مغرب گزشتہ وسطی عہد میں مذہب اور مذہب کے نام لیواؤں کے ہاتھوں بڑے شکنجے میں رہے۔ بہت دکھ اٹھائے زندہ آگ میں ڈالے گئے۔ اسی وجہ سے یہ لوگ خدا اور مذہب بلکہ اس کی بو رکھنے والی چیز سے بھی ڈرتے ہیں۔ چنانچہ تمام علمی علامات اور آثار دیکھنے کے باجود، طبیعت کے با مقصد ہونے اور کائنات کیلئے ایک مدبر ہونے کا اعتراف یا ''علت غائی'' کے وجود کا اقرار کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔

ہم ان شارحین سے یہ نہیں چاہتے کہ پوری تاریخ میں پھیلے ہوئے پیغمبران خدا کو مان لیں ان پیغمبروں نے عدالت وانسانیت کا نعرہ بلند کیا، انحرافات کا مقابلہ کیا، ان مقابلوں کے اچھے نتائج حاصل کیے۔ ہم یہ منوانا نہیں چاہتے ۔مگر اتنا تو ضرور چاہتے ہیں کہ یہ لوگ کم ازکم طبیعت کے باخبرانہ وآگاہانہ اثر کو نظرانداز نہ کریں۔

تعلقات مردوزن کی تاریخ میں یقیناً بہت ظلم اور بڑی بے رحمیاں ہوئی ہوں گی۔قرآن مجید نے اس بے رحمی کی بدترین مثالیں بھی بیاں کی ہیں ۔لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ سراسر تاریخ میں قساوت اور سختی کا انداز یہی رہا۔

مہر کا حقیقی فلسفہ

ہمارے عقیدے میں ''مہر،ایک ماہرانہ تدبیر'' کا نتیجہ ہے۔آغاز فطرت وتخلیق سے زن ومرد کے روابط اوران کے رشتے کو زیادہ مستحکم کرنے کے واسطے ''مہر'' ایجاد کیا گیا۔

اصل خلقت میں زن ومرد کا مسئلہ عشق الگ الگ ہے عورت کا عشق کچھ اورطورطریقے کا ہےاورمرد کا کچھاور۔مہر۔کی ضرورت وایجاداسی مرحلے میں ہوئی۔

صوفی ،اس قانون کی پوری ہستی میں کارفرما مانتے ہیں۔ان کا تو عقیدہ ہے کہ عشق وجذب وانجذاب تمام موجودات ومخلوقات پرحکمران ہے۔خصوصیت یہ ہے کہ موجودات میں سے ہرایک کا کام الگ ہے ذمہ داری الگ ہے۔اسی وجہ سے ان کے مقام میں فرق ہے۔ایک جگہ سوز ہےایک کیلئے ساز فخرالدین عراقی نے کہا:

سازطرب عشق کہ داندکہ چہ است؟

گرزخمہ آں نہ فلک اندرتگ وتازاست

عشق کے طرب انگیز ساز کو کوئی کیا جانے بس مختصر یہ ہے کہ اس کے زخمے کی چھیڑ نے تو آسمان رواں کرر کھے ہیں۔

رازیست دریں پردہ کہ گران رابہ شناسی
دانی کہ حقیقت زچہ دربندمجاز است

اس پردے کے پیچھے ایک راز ہے اگر وہ راز معلوم ہو جائے تو سمجھ میں آئے گا کہ حقیقت کو مجاز کا پابند کیوں رکھا گیا ہے

عشق است کہ ہردم بدگررنگ درآید
نازاست بجائی وبیک جاسی نیازاست

عشق ہرآں نئے رنگ میں جلوہ نما ہوتا ہے۔ وہی ایک جگہ نازاور دوسری جگہ نیاز نظر آتا ہے۔

درصورت عاشق چہ در آید ہمہ سوزست
درکسوت معشوق چہ آید؟ ہمہ سازاست

عاشق کے سراپا میں جو کچھ سمایا ہوا ہے وہ ''سوز'' ہے اور معشوق کے لباس میں ''ساز'' ہی ساز ہے۔

زن ومرد کے اختلاف پر گفتگو کے دوران (گزشتہ صفحات میں ملاحظہ ہو) ہم نے کہا ہے زن ومرد کے جذبات کی نوعیت اور ایک دوسرے کے بارے میں احساسات ایک طرح کے نہیں ہیں۔ قانون تخلیق نے حسن وغرور و بے نیازی ،عورت کے حصے میں۔اور۔ نیازمندی وطلب ،عشق وتغزل مرد کے حصے میں رکھا۔اسی تقسیم کی وجہ سے عورت کے کمزور پہلو کی تلافی مرد کی بدنی قوت سے ہوگئی۔ترازو کے پلے برابر ہوگئے جب ہی تو مرد طلب کیلئے عورت کے دروازے پر جاتا ہے۔ معاشرہ شناس

ماہرین کے ''مادر شاہی'' عہد میں بلکہ ''پدرشاہی'' دور میں بھی یہی دیکھااور بتایا گیا ہے کہ مرد نے عوت کے گھر جا کر رشتہ مانگا ہے۔

دانشور حضرات کہتے ہیں:

مرد ،عورت سے زیادہ شہوانی ہے۔ اسلامی روایت میں اس کے برعکس ہے۔ لیکن عورت بہ نسبت مرد کے جنسی خواہش پر زیادہ قابو رکھتی ہے۔ وہ زیادہ خوددار پیدا ہوئی ہے۔ دونوں باتوں کا نتیجہ ایک ہے ۔یعنی بہر حال مرد اپنے خمیر کے مقابلے میں عورت کی بہ نسبت زیادہ کمزور ہے ۔اس خصوصیت نے عورت کو موقع دیا ہے کہ مرد کے پیچھے بھاگنے سے بچے اور آسانی سے اس کے قابو میں نہ آئے اس کے برخلاف ،مرد کو فطرت مجبور کرتی ہے کہ عورت سے نیاز مندی کا اظہار کرے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے ذرائع استعمال کرے۔ان ذرائع میں سے ایک ذریعہ جو اس کی رضا اور رفاقت حیات پر آمادگی کی راہ ہموار کرتا ہے وہ ہے ''ہدیہ'' جو اس پر نثار کیا جائے۔

جنس نر کے افراد، رفاقت کیلئے افراد جنس مادہ کا تعاقب کیوں کرتے اور باہم رقابت کیوں رکھتے ہیں؟ کیوں آپس میں لڑتے اور خون ریزی کرتے ہیں؟ اس کے مقابلے میں جنس مادہ نے لالچ ،حرص اور نر کے ساتھ رفاقت کیلئے ازخود رفتگی ظاہر نہیں کی۔ اس کا سبب دونوں جنسوں کے فطری تقاضے مختلف ہیں ایک نہیں ہے۔ نر میں ہمیشہ تقاضا و طلب کا جذبہ رہتا ہے جنس مادہ میں یہ جذبہ نہیں ہے۔جنس مادہ نر کے لالچ اور ازخود رفتگی کو دیکھ کر اس کے پیچھے نہیں دوڑی بلکہ ایک قسم کی بے نیازی اور بے خیالی کا اظہار کرتی رہتی ہے۔

مہر کا حیا اور عورت کی پاک دامنی سے گہرا رشتہ ہے ۔عورت اپنے فطری الہام سے یہ جان چکی ہے کہ اس کی عزت و حرمت اس پر موقوف ہے کہ وہ اپنے تئیں

گر پڑے کے مرد کے اختیار میں نہ دے دے............

یہی اسباب ہیں کہ عورت باوجود جسمانی نزاکت کے مرد کو درخواست گزار کے طور پر اپنے آستانے پر کھینچ بلاتی ہے۔ مردوں کو رقابت میں برسر پیکار کھڑا کرتی ہے۔ اور خود رومان اور عشق کے بہانے مرد کے پنجے سے نکل جاتی ہے۔ کتنے مجنون ہیں جو لیلاؤں کے پیچھے سرگرداں ہیں اور وہ اس وقت تک کسی سے رفاقت کا بندھن نہیں باندھتی اور کسی کا ہاتھ اپنے دامن تک نہیں آنے دیتی جب تک اس سے عطیہ و بخشش، صداقت و خلوص کی سند میں حاصل نہ کر لے۔

کہتے ہیں، کچھ وحشی قبیلوں میں یہ دستور تھا کہ جو لڑکی کئی امیدواروں اور عاشقان بے قرار سے دوچار ہوتی وہ ''ڈوئل'' کا پیام بھیجتی تھی۔ وہ رقیب آمنے سامنے زور آزمائی کرتے جو شخص موت یا شکست سے بچ جاتا تھا وہی اس لڑکی کے شوہر بننے کی اہلیت کا مالک بن جاتا تھا۔

کچھ روز ہوئے کہ تہران کے روزناموں میں خبر چھپی تھی کہ ایک لڑکی نے اپنے دو خواستگاروں سے ''ڈوئل'' کو کہا۔ وہ دونوں اس کے سامنے چھری خنجر لے کر ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔

جن کی نظر میں قوت فقط زور بازو کا نام ہے اور زن و مرد کے رشتے شروع سے آخر تک عورت پر ظلم اور استثمار مرد پر منحصر ہے۔ یہ لوگ باور نہیں کر سکتے کہ عورت کمزور و نازک جنس بھی درشت و سخت گیر مرد کو یوں ایک مرد کے خون کا پیاسا بنا سکتی ہے۔ ہاں جو شخص عورت کی تخلیق میں ماہرانہ تدبیریں اور عجیب عجیب نسوانی قوتین اور اشارتیں دیکھ سکتا ہے اسے معلوم ہے اسے باور آئے گا کہ بے شک وجود زن میں ایسی چیزیں چھپا رکھی ہیں اور ایسے امور عجیب نہیں ہیں۔

عورت، مرد پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ عورت کی مرد پر اثر آفرینی

مرد کے اثرات سے زیادہ ہے۔ ہنر مرد کی نمود اس کی دلاوری و بہادری اس کی شخصیت کا ابھار اور بڑا پن بہت کچھ عورت کی خوبصورت خودداری و ہمت افزائی اس کی پاک دامنی وحیا کی بدولت ہے۔ مرد کی بڑائی عورت کی ''گراں بہا'' ہونے کی حیثیت ہے۔ ہمیشہ عورت نے مرد کا کردار بنایا ہے وہ مرد جس کا معاشرے سے تعلق ہے اور جب پاک دامنی وحیا اور خودداری عورت سے الگ ہوجاتی ہے اور عورت جب بھی مرد کے کردار ظاہر کرنے کے درپے ہوتی ہے تو سب سے پہلے تو وہ اپنا مہر کا استعمال غلط کرتی ہے۔ پھر مرد اپنی مردانگی بھول جاتا ہے اور معاشرہ کا ایوان ڈھے جاتا ہے۔

عورت کی وہ قوت جو پوری تاریخ میں اپنی شخصیت کو محفوظ رکھ سکی ،اور مرد کے پیچھے دوڑنے سے روکتی رہی اور مرد کو اپنے آستانے پر طلب گار کی حیثیت سے طلب کرتی رہی جس نے اپنی خاطر مردوں کو رقابت و جنگ میں الجھایا وہ مقابلے میں جان کا بازی لگا چکے ،حیا اور عفت کو اپنا کردار بنائے ، اپنا بدن لوگوں کی نگاہوں سے چھپائے اور اپنے تیئں پر اسرار ظاہر کرے ۔مرد کو الہام اور اس میں عشق کو جنہم دے ۔اسے شجاعت و ہنرمندی میں شخصیت کے درجے پر پہنچائے مرد میں غزل کا جذبہ ،خاکساری و ناچیزی کا احساس پیدا کر کے اپنے سامنے جھکائے ،اس عالم میں مرد کو خوشی بھی ہو۔عورت کی یہی قوت مرد کو شادی کے وقت مہر کے نام سے عطیہ وہدیہ پیش کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

مہر، وہ عمومی آئین کی قانونی شق ہے جس کی تحریر تین تخلیق میں قلم قدرت نے فطرت کے قلم سے لکھوائی ہے۔

قرآن میں مہر

ہم نے کہاہے کہ سماج کے پانچویں دور میں ''مہر'' کی ایک شکل

ابھر کر سامنے آئی، یہ صورت ،فطرت کی ایجاد ہے۔قرآن مجید نے سماجی آلودگیوں سے اسے پاک صاف کر کے فطرت کا صحیح روپ نکھار دیا۔قرآن کریم اپنے بے مثال لطافت وخوش اسلوبی کے انداز میں کہتا ہے:

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ط

یعنی عورتوں کا مہر، جوانہیں کا ہے(باپ یا بھائی کا اس سے کوئی تعلق نہیں)
عطیہ وپیش کش کے طور پر خود ان کو دے دو۔(سورہ نساء۔4)

قرآن مجید نے اس چھوٹے سے جملے میں تین نکتوں کی طرف اشارے کیے ہیں:

ا۔مہر کو مہر کے بجائے ''صَدُقه''دال پر پیش) کے نام سے دیا دکیا صَدُقه کا مادہ --صدق۔ ہے۔مہر کا صدقہ اس لئے کہا کہ وہ مرد کے رشتے کو سچا قرار دیتا ہے کشاف کے تفسیر نگار(زمخشری) جیسے حضرات نے اس نکتے کی تشریح کی ہے۔اورزلفب اصفہانی کے بقول (مفروات الفاظ القرآن)''صدَقه (دال پر زبر) کو صدق اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ایمان کی دلیل ہے۔

۲۔صدقات ''ھن'' میں ضمیر کے الحاق نے یہ اشارہ کیا ہے کہ''مہر'' براہ راست عورت کا حق ہے، ماں باپ کا کوئی حصہ نہیں کہ انہوں نے دودھ پلایا، پالا پوسا بڑا کیا لہٰذا یہ ان کا عوضانہ ہو۔نہیں۔

۳۔آیت میں''نحله'' سے مزید توضیح ہوگی کہ مہر ہدیہ اور پیش کش کے علاوہ کوئی نام نہیں قبول کر سکتا۔

حیوانات میں احساسات کا فرق

انسان ہی نہیں، تمام جانداروں میں جہاں بھی دو جنسی کا عمل موجود ہے وہاں

دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں ۔جنس نر میں نیاز مندی زیادہ ہے۔اس کے جذبات واحساسات میں نیازمندانہ رجحان زیادہ ہے اسی وجہ سے وہ اپنی ضرورت کیلئے جنس مادہ کی خوشی اوررضامندی حاصل کرنے کی خاطر آگے بڑھے ۔اسی بنیاد پر دونوں جنسوں کے تعلقات میں برابری ہو۔جنس نر اپنی طاقت وقت کی وجہ سے غلط فائدہ نہ اٹھانے پائے اسے عاجزی وفروتنی میں رہنا چاہیے۔

غیر شرعی شادیوں میں ہدیے اور تحفے

شرعی طور پر ہونے والی شادیوں سے خاص ربط نہیں غیر شرعی شادیوں میں بھی جہاں ایک دوسرے کے وجود سے آزاد لطف اندوزی اور آزاد عشق بازی کی جاتی ہے ۔وہاں بھی مرد کوایک ہدیہ نذر کرنا پڑتا ہے۔ اتفاق سے اگر کہیں چائے ،کافی یا کھانے کو دل چاہے تو ہوٹل کا بل مرد کوادا کرنا فرض ہے۔ مرد کیلئے عورت پیسے خرچ کرے تو مرد اپنے لئے ایک قسم کی توہین سمجھتا ہے۔لڑکے کی عیش پرستی کیلئے امکانات اور دولت مند ہونا ضروری ہے ۔عورت کی عیش پرستی ہدیوں اور تحفوں کے جمع کرنے کا یک بہانہ ہے غیر قانونی اور ناجائز روابط زن ومرد میں یہ رسم موجود ہے ۔اس کی بنیاد زن ومرد کے غیر مشابہ جذبات ہیں۔

فرنگی کا عشق اس کی شادی سے بہتر ہے

مغربی دنیامیں جہاں''حقوق انسانی'' کی برابری کانام لے کر ''گھریلوزندگی'' کے حقوق کوفطری طورطریقوں سے دور کردیا گیا ہے ۔ جہاں قانون فطرت کے خلاف کوشش جاری ہے کہ زن ومرد کوایک دوسرے کا مشابہ بنادیا جائے ۔ اور گھریلوزندگی میں بیوی اور شوہر کو برابر کا مشابہ کردار اپنانا ہوگا۔ جہاں،عشق کا آزاد

قدم گھر میں داخل ہو چکا ہے۔اس کے باوجود زن ومرد کے مقررہ قوانین فطرت اپنی رفتار سے باہر نہیں جا سکے وہاں اب بھی مرد اپنا فطری فریضہ ادا کرتا ہے۔یعنی اظہار نیاز طلب ودرخواست دولت نچھاور کرنا۔دولت نذر کرنا۔عورت کو ہدیہ پیش کرنا، بلکہ اس کے اخراجات برداشت کرنا۔آج بھی یورپ میں رائج ہے۔

فرنگی شادی میں مہر کا وجود نہیں ہے۔ نفقہ واخراجات کا بوجھ بیوی کو اٹھانا پڑتا ہے۔یعنی فرنگی معاشقہ ،فرنگی شادی سے فطرت سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

مہر ایک مثال ہے جو ہمیں اس گہرائی تک پہنچاتی ہے کہ زن ومرد غیر مشابہ انداز میں پیدا ہوئے ہیں۔اور قانون تخلیق نے فطری وطبیعی صلاحیتوں کیلئے غیر مشابہ دستاویز الگ الگ ہاتھوں میں دے دی ہے۔

مہر اور نفقہ (۲)

گزشتہ فصل میں مہر کی ایجاد کا فلسفہ اور اس کی علت کا بیان ہم نے کیا ہے اور بتایا کہ مہر کی ایجاد کا سبب دونوں جنسوں کی رشتے قانون تخلیق کے ہاتھوں دو الگ الگ ذمہ داریوں کا باعث ہیں۔ یہ بھی آپ جان چکے کہ ''مہر'' مرد کے نرم اور محبت آمیز جذبات کی پیداوار سے سخت اور مالکانہ احساسات کا اس میں دخل نہیں۔ عورتوں کی طرف سے جو حس زیادہ اثر ڈالتی ہے وہ اس کی خاص خودداری ہے یہاں اس کی کمزوری یا ارادے کی ناپختگی کا کوئی مسئلہ نہیں۔ مہر قانون تخلیق کی طرف سے عورت کی قدر بڑھانے کیلئے اور اسے ایک بلند درجہ دینے کیلئے ہے۔ ''مہر'' عورت کو شخصیت عطا کرتا ہے۔ ''مہر'' کی حقیقی قیمت عورت کی نظر میں اس کی مادی قیمت سے زیادہ ہوتی ہے۔

جاہلیت کے رسم ورواج اسلام نے منسوخ کر دیے

قرآن مجید نے مہر کے بارے میں جاہلیت کی رسمیں منسوخ کر دیں اور اسے اپنی پہلی اور فطری حالت میں بحال کر دیا۔

جاہلیت میں، ماں باپ مہر کو حق زحمت اور اپنا حق ''شیر بہا[1]'' جانتے تھے

[1] ''شیر بہا'' وہ رقم یا ہدیہ ہے جو دولھا لڑکی کے والدین کو پیش کرتا ہے۔ یعنی دودھ کی قیمت'' یہ رسم اب بھی عراق اور دوسرے علاقوں میں بطور رسم جاری ہے۔

۔تفسیر کشاف [1] وغیرہ میں لکھا ہے کہ عرب میں لڑکی کی ولادت پر مبارک باد دینے والے کہتے تھے۔هنيئالك النافجه۔یعنی۔افزائش دولت کی اساس مبارک ہو۔ مطلب یہ ہوتا تھا کہ خدا کرے آپ لڑکی کو بیاہیں اور اس کا مہر پائیں۔

جاہلیت میں باپ وہ نہ ہوں تو بھائی چونکہ ولی ہونے کے دعویدار تھے ۔قیمومت (سربراہی) کاحق انہیں حاصل ہوتا تھا۔ لہٰذا وہ اپنی پسند کا شوہر لاتے تھے۔لڑکی کی رائے ضروری نہ تھی۔اسی طرح مہر خود لیتے تھے،لڑکی سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔لڑکیوں کا تبادلہ کرتے تھے یعنی ایک مرد دوسرے مرد سے کہتا تھا وہ اپنی لڑکی یا بہن دیتا ہے بشرطیکہ فریق مقابل بھی اپنی لڑکی یا بہن اس کے ازدواج میں دے۔اس طرح ایک لڑکی دوسرے لڑکی کا مہر قرار پاتی تھی اور یہ مہر باپ یا بھائی لیتے تھے۔اس طریقہ ازدواج کو''نکاح شغار'' کا نام دیا گیا ہے۔

اسلام نے اس رسم کو منسوخ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لاشغار فی الاسلام

اسلام میں لڑکی یا بہن کا عوض معاوضہ ممنوع ہے۔

اسلامی روایات کے مطابق صرف یہی نہیں کہ باپ کو مہر پر کوئی دست رسی نہیں بلکہ اگر شادی کے شرائط میں مہر کے علاوہ کوئی چیز مان لی جائے (زمین دی جائے گی یا کچھ اور) تو اس میں باپ حق دار و حصہ دار نہیں ہوگا۔

اسلام نے وہ رسم منسوخ کردی جس میں داماد اپنے خسر کی خدمت

---

[1] ابوالقاسم محمود ن عمر، جاراللہ زمخشری متوفی، 538ھ جن کی تفسیر کا نام ''الکشاف من حقائق التنزیل وعیوان الاقاویل فی وجود التاویل'' یہ عربی تفسیر، بڑی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے اور الکشاف کے نام سے مشہور ہے۔

کرتا تھا۔ معاشرہ شناس علما کے نزدیک یہ اس دور میں ہوتا تھا جب انسان کونقد بتادے کا علم نہ تھا۔

داماد اپنے خسر کی خدمت فقط اسی لیے نہیں کرتے تھے کہ باپ اپنی لڑکی کے رشتے سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، بلکہ اس کے اور اسباب بھی تھے اوران میں بسا اوقات تمدن کے ارتقا کا بھی دخل ہوتا ہے۔اور بجائے خود ظالمانہ انداز نہ تھا۔ بہرحال قطعی طور پر دنیا میں یہ رسم موجود تھی۔

واقعہ موسیٰؑ اور شعیب،علی نبینا وعلیہما السلام قرآن مجید میں موجود [1] ہے اس سے مذکورہ بالا رسم کے وجود کا سراغ ملتا ہے۔موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلتے وقت ''مدین'' کے کنویں پر پہنچے اس وقت شعیب علیہ السلام کی لڑکیاں اپنی بھیڑیں لئے ذرادور کھڑی تھیں۔ کسی کوان کی باری کا خیال نہ تھا۔موسیٰؑ کورحم آیا،انہوں نے ان لڑکیوں کو بھیڑ بکریوں کے پینے کیلئے پانی کھینچا اور انہیں سیراب کیا۔لڑکیاں باپ کے پاس آئیں اور قصہ بیان کیا،شعیب نے آدمی بھیج کر،موسیٰؑ کو اپنے گھر بلایا،ایک دوسرے سے تعارف ہوا۔ایک دن شعیب نبی نے موسیٰؑ سے کہا، میں اپنی دولڑکیاں میں سے ایک کی تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں ۔مگر تمہیں آٹھ سال میرے یہاں کام کرنا ہوگا، پھر اگر تمہارا دل چاہے تو مزید دوسال اور کام کرنا۔یعنی دس سال تک حضرت موسیٰؑ نے بات مان لی اور وہ حضرت شعیب کے داماد بن گیے۔ یہ رسم اس زمانے میں بہرحال تھی۔اس کی بنیاد دو باتوں پر نظر آتی ہے۔

۱۔سرمایہ نہ ہونا۔داماد اپنے خسر یا بیوی کی جو خدمت کرسکتا تھا وہ کرتا تھا۔

۲۔جہیز دینا۔علم معاشرہ کے ماہر سمجھتے ہیں کہ جہیز کی رسم یعنی لڑکی کی طرف

---

[1] پورا واقعہ دیکھیے سورہ القصص آیت 23 سے 28 تک

سے باپ کا کچھ ساز وسامان دینا پرانے زمانے سے چلا آتا تھا۔ اس ضمن میں داماد کو بطور اجیر کے لے لیتا یا اس سے کچھ مال وصول کرتا۔ عملی طور پر باپ جو کچھ داماد سے لیتا وہ لڑکی کے مفاد اور لڑکے کے کام کیلئے ہوتا تھا۔

اسلام نے یہ آئین ختم کر دیا۔ خسر، مہر کو اپنا مال نہیں سمجھ سکتا، خواہ اس کا یہ ارادہ ہی کیوں نہ ہو کہ وہ اس مال کو لڑکی کیلئے استعمال کرے گا۔ یہ حق فقط لڑکی ہی کو ہے جسے اپنے مال کا اختیار ہے جس طرح چاہے خرچ کرے۔ اسلامی روایات میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ اس طرح مہر مقرر کرنا درست نہیں۔

جاہلیت میں ایک اور رسم تھی جو عملاً لڑکی کو مہر سے محروم کر دیتی تھی۔ دستور تھا کہ مرنے والے کے ترکے میں اس کی بیوی بھی شمار ہوتی تھی۔ جب کوئی شخص مر جاتا تھا تو اس کے وارث مثلاً اولاد یا بھائی جیسے مرنے والے کے سرمایے سے ترکہ لیتے اور مالک بنتے۔ اسی طرح اس بیوی کی زوجیت بھی ترکے میں پاتے مرنے والے کا لڑکا یا بھائی اس کا مختار ہوتا اور جسے چاہتا وہ عورت نکاح میں دیتا اور مہر کا خود مالک بنتا۔ یا نیا مہر مقرر کیے بغیر اپنی بیوی قرار دے لیتا تھا۔

قرآن کریم نے زوجیت کی میراث کا دستور منسوخ کر دیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا ط [1]

پیغمبر اور قرآن پر ایمان لانے والو، یاد رکھو، تمہارے لئے جائز نہیں کہ اپنے مورثوں کی بیویوں کو میراث بناؤ، دراں حالے کہ وہ عورتیں تمہاری بیوی نہ بننا چاہیں۔

قرآن کریم کی دوسری آیت کلی طور پر باپ کی بیوی سے شادی پر پابندی

---

[1] القران الکریم۔ سورۃ النساء آیت۔ 19

لگادی گئی ہے خواہ وہ میراث کے طور پر نہ بھی ہو۔ آزادانہ اوررضامندی سے کرنا چاہیں، جب بھی حکم ہے کہ:

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ [1]

جن سے تمہارے باپ شادی کر چکے ان سے تم نکاح نہ کرنا۔

جو رسم بھی عورتوں کے حق مہر کو نقصان پہنچاتی تھی اسے قرآن مجید نے ختم کیا۔ان میں سے ایک وہ موقع جب آدمی کا دل ایک عورت سے بھر جاتا تھا،تو نہ رہتی تھی،تو وہ شخص بیوی پر تنگی اور سختی کرتا طلاق پر تیار کر کے دیے ہوئے مہر کا کچھ حصہ یا پورا مہر واپس مانگتا تھا۔قرآن کریم نے فرمایا:

وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ

یعنی عورتوں کو کچھ دیا مال مہر واپس لینے کی خاطر تنگ نہ کرو۔ [2]

ایک رسم یہ بھی تھی کہ آدمی کبھی بھاری مہر دے کر شادی کرتا پھر عورت سے دل سیر ہوجاتا تو پیچھا چھڑانے اورنئی شادی رچانے کی خاطر دیا ہوا بھاری مہر واپس لینے کی فکر میں عورت پر بہتان باندھتا،اس کی آبرو پر داغ لگاتا اور یہ جتاتا تھا کہ عورت پہلی ہی سے شادی کے لائق نہ تھی اس کا نکاح فسخ ہونا اور میرا مہر واپس ملنا چاہیے۔قرآن مجید نے اس رسم کو منسوخ کر دیا۔

مہر کا نظام خاص اسلام کا نظام ہے

دین اسلام کے مسلمات میں ایک بات ہے کہ مرد عوت کے مال اور

---

[1] القران الکریم۔سورۃ النساء آیت۔23

[2] القران الکریم۔سورۃ النساء آیت۔19

کاروبار سے سروکار نہ رکھے۔ وہ بیوی کو کام کرنے کا حکم نہیں دے سکتا کہ یہ کام میرے لئے کرو وہ نہ کرو۔ اگر عورت کوئی ایسا کام کرے جس سے اسے پیسہ حاصل ہوتو مرد کو عورت کی مرضی حاصل کیے بغیر اس دولت میں تصرف کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس جہت سے مرد وزن میں برابری ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل تک مسیحی رسم اس کے برخلاف تھی۔

اسلام کی نظر میں شوہر دار بیوی اپنے حقوق معاملات میں شوہر کی سرپرستی سے آزاد ہے وہ اپنے کاروبار خود کرسکتی ہے۔ عین اس اقتصادی آزادی کی صورت حاصل میں بھی جبکہ اسلام نے شوہر کو مال اور کاروبار زوجہ پر حق نہیں دیا، مہر کی معافی نہیں کی، یہ حکم بجائے خود بتاتا ہے کہ مہر اسلام کی نظر میں اس لیے نہیں ہے کہ مرد کچھ عرصے بعد عورت کی ذات سے مالی فائدہ اٹھائے اوراس کی جسمانی قوت کا استثمار کرے۔ اسی وجہ سے اسلام کا نظام مہر اس کے خصوصیات سے ہے۔ مہر کے اس سسٹم کو دوسرے نظام اور فلسفے سے مخلوط نہ کرنا چاہیے جو اعتراضات وہاں ہوتے ہیں اسلام کے نظام مہر پر نہیں ہوسکتے۔

آئین فطرت

ہم نے کہا ہے کہ قرآن مجید نے مہر کو ''نحلہ'' عطیہ کہا ہے قرآن نے اس عطیہ و پیش کش کو لازمی کردیا۔ قرآن نے بڑی باریک بینی سے فطرت کی گہرائیوں کو پیش نظر رکھا۔ زن و مرد کے خاص رویوں کے بارے میں جو فطرت نے دونوں میں چھپا رکھے ہیں۔ اسلام نے دوستی کا رشتہ برقرار رکھنے کیلئے ملحوظ رکھتے ہوئے مہر کو نظرانداز نہ کرنے کی تاکید کی۔ عورت کا رویہ، مرد کی محبت کا شکریہ ہونا چاہیے۔ عورت کی محبت ہی اچھی ہے اس کے ردعمل میں مرد کی محبت ہوگی ابتدا میں نہیں۔ (کلیہ

ہے)عشق میں عورت کی پہل ۔یعنی جو عشق عورت کی طرف سے شروع ہوا اور مرد کی درخواست ابتدائی شریک نہ ہو وہ ہمیشہ شکست پاتا ہے اور عورت کی شخصیت چرمرا جاتی ہے اس کے برخلاف عورت کی جو عشق مرد کی محبت کے جواب میں ہوا ایسا عشق نہ خود ناکام ہوتا ہے نہ عورت کا شخصیت کو نقصان وشکست سے دوچار کرتا ہے۔

کیا یہ سچ ہے کہ عورت بے وفا ہوتی ہے؟ عورت کی محبت کمزور ہوتی ہے؟ عورت کے عشق پر اعتبار نہ کرنا چاہیے؟

یہ بات سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی سچ ہے، اگر عشق کی ابتدا عورت کی طرف سے ہو۔ اگر کوئی عورت کسی مرد پر عاشق ہو جائے کسی کو دل دے دے تو عشق کی آگ جلدی بجھ جاتی ہے۔ ایسے عشق پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے ۔جھوٹ ہونے کی صورت وہ ہے جہاں عورت کے دل میں آگ بڑھکے اور عشق بطور عشق مرد کے ردعمل میں شعلہ فشاں ہو۔ مرد کے عشق صدق کے جواب میں جذبہ محبت عورت کے دل میں بیدار ہوا ہو۔ یہ عشق عملاً فسخ ہو جائے ۔بعید از حقیقت ہے ہاں مرد کا عشق ٹھنڈا ہونے لگے تو عورت کا جذبہ عشق بھی تمام ہو جائے گا عورت کا فطرت عشق اس نوع کا ہوتا ہے۔

عورت کی بے وفائی کی شہر نوع اول (پہلی قسم) کی محبت وعشق سے متعلق ہے ۔اور جہاں عورت کی وفاداری مشہور ہے وہ عشق کی دوسری قسم سے وابستہ ہے ۔معاشرے کو اگر زن وشوہر کے رشتے میں مضبوطی کی ضرورت ہے تو وہ ایسے راستہ پر چلنے کیلئے مجبور ہے جو قرآن مجید نے اختیار کیا ہے۔یعنی قوانین فطرت کی نگہداشت ۔جس میں ایک مسئلہ محبت میں زن ومرد کا فطری رویہ ہے۔اس رویہ پر نظر رکھنا ضروری ہے قانون مہر بھی فطرت سے ہم آہنگ ہے۔ مہر زمین ہموار کرتا ہے وہ نشانی ہے کہ عشق ومحبت مرد کی طرف سے شروع ہوئی ہے۔عورت اس محبت کی جوابدہ ہے اور مرد نے اس کے احترام میں ایک ہدیہ نثار کیا ہے۔لہٰذا قانون مہر کو۔ جو کلی ومجموعی آئین اساسی

کی دفعہ ہے ۔اور خالق فطرت کی طرف سے تدوین یافتہ ہے ۔حقوق مرد وزن کی برابری کا بہانہ بنا کر کالعدم قرار دینا غلط ہے ۔

آپ نے دیکھا ہے کہ قرآن نے مہر کے سلسلے میں جاہلیت کے رسم ورواج کو اس عہد کے مردوں کی خواہش کے باوجود بدل دیا۔قرآن مجید میں مہر کے بارے میں جو کچھ ہے وہ جاہلیت کی رسم نہیں تھی جو ہم یہ کہہ سکیں کہ قرآن ،مہر کے ہونے نہ ہونے کو براہ راست کوئی اہمیت نہیں دیتا۔قرآن مہر کو یکسر منسوخ کرسکتا تھا وہ مردوں کو اس پابندی سے بچا سکتا ہے تھا مگر اس نے یہ نہ کیا۔

نقد ونظر

مہر کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر آپ نے سمجھ لیا، یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام کی نظر میں مہر کا فلسفہ کیا ہے ۔اب مناسب ہے کہ اسلامی قوانین اس مسئلہ پر نقد کرنے والوں کی بات میں سنیں ۔

خانم منوچہریان نے اپنی کتاب ''انتقاد برقوانین اساسی ومدنی ایران'' میں مہر کے اوپر ایک فصل میں لکھا ہے:

''جیسے باغ ،مکان ،گھوڑے یا خچر کیلئے مرد کو روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے ۔اسی طرح بیوی خریدنے کے واسطے جیب سے پیسے نکالنا پڑتے ہیں اور جس طرح ، باغ اور خچر کی قیمت بڑے چھوٹے ،خوبصورت اور بدشکل ہونے سے گھٹتی بڑھتی ہے یونہی عورت بھی بدصورتی ،زیبائی ،دولت مندی اور غربت کی بنیاد پر کم وزیادہ قیمت رکھتی ہے۔ ہماری مہربان وجوانمرد قانون ساز حضرات نے عورت کی قیمت پر بارہ دفعات قلمبند کیے ہیں۔فلسفہ ان کا یہ ہے کہ اگر میاں بیوی کے رشتے میں روپے کا ذکر نہ ہوتو یہ رشتہ کمزور اور جلد ٹوٹ جاتا ہے۔''

اگر مہر کا قانون کسی اجنبی نے بنایا ہو، کیا اس وقت بھی اتنی ہی بے توجہی وتہمت وافترا کا سبب ہوگا؟ کیا جب بھی اور جو بھی روپیہ پیسہ کوئی کسی کو دیتا ہے تو وہ اسے خریدنا چاہتا ہے اگر یہی بات ہے تو بخشش وہدیہ وتحفہ کی رسم کو ختم کر دینا چاہیے۔ قانون مدنی میں مہر کی بات قرآن مجید کی اساس پر ہے قرآن نے صاف صاف کہا ہے کہ مہر عطیہ وپیش کش کے علاوہ اور کوئی عنوان نہیں رکھتا۔اس کے علاوہ اسلام نے اقتصادی قوانین کچھ اس طرح بنائے ہیں جن میں شوہر کو بیوی کے مال سے اقتصادی فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے۔ اس صورت میں مہر کو قیمت زن کے نام سے کیوں یاد کیا جا سکتا ہے۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایرانی مرد اپنی بیوی سے اقتصادی فائدہ اٹھاتے ہیں ۔میں بھی مانتا ہوں، واقعاً بہت سے ایرانی مرد بیوی کے مال سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن اس کا مہر سے کیا تعلق ہے۔ مرد یہ تو نہیں کہتے کہ چونکہ ہم نے مہر ادا کیا ہے لہٰذا ہم اپنی بیویوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ایرانی مردوں کی اپنی بیویوں پر حکمرانی کا مرکزی نکتہ کچھ اور ہے۔مردوں کی اصلاح کے بجائے قانون فطرت کو بگاڑنے، اور مزید خرابیوں کو جنم دینے کی وجہ کیا ہے؟ اس پوری گفتگو میں صرف ایک بات پردے کی ہے اور وہ ہے کہ ایرانی مشرق کے باشندے اپنے انسانی معیار اور زندگی کا فلسفہ بھول جائیں اور اجنبی رنگ وشکل بنالیں تا کہ ان کا نگلنا آسان ہو جائے گا۔

خانم منوچہریاں کہتی ہیں:

”اگر عورت اقتصادی حیثیت سے مرد کے برابر ہو تو اس کیلئے نان ونفقہ ولباس ومہر کے قائل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔اسی طرح عورت کیلئے اور بہت سی پیش بندیاں اور مرد سے معاملات کو پکا کرنے کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہو۔

اگراس گفتگوکی چھان پھٹک کریں تواس کا مطلب یہ ہوگا،جن تاریخی ادوار میں عورت کوحق مالکیت اوراقتصادی آزادی حاصل نہ تھی اس دور میں مہر ونفقہ کی کسی حدتک معقول وجہ موجودتھی،مگرجب عورت کی اقتصادی آزادی دے دی گئی ۔جیسے اسلام میں تواب مہر ونفقہ جواز باقی نہیں۔

ان لوگوں کے خیال میں مہر کا صرف فلسفہ یہ ہے کہ عورت کے اقتصادی حقوق چھین کر فقط دے دیا جائے۔ بہتر ہوتا کہ یہ حضرات مختصر سا مطالعہ قرآن بھی کرلیتے اورمہر کی جوتغیر یات میں کی گئی ہے ان پر غور کر کے مہر کا اصل فلسفہ دریافت کرتے اور جب انہیں اس کتاب کے اعلیٰ منطقی دلائل معلوم ہوتے تو بہت خوش ہوتے کہ ان کے ملک کی آسمانی کتاب ایسی عالی مرتبہ ہے۔

چالیس نکاتی تجویز کے مصنف نے رسالہ ’’زن روز‘‘ کے شمار 89 صفحہ 71 پر جاہلیت میں عورت کے افسوس ناک حالات اوراس بارے میں اسلامی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: عقلی دلیل ومنطق کی بات نہیں ہے ۔کیونکہ جیسے مردکوعورت کی ضرورت ہے اسی طرح عورت کوبھی مرد کی ضرورت ہے۔تخلیق میں ان کوایک دوسرے کا محتاج پیدا کیا گیا ہے۔دونوں برابر کی ضرورت کے محتاج ہیں۔لہٰذا ایک کوئی کسی چیز کا پابند کرنا اوردوسرے کوچھوڑ دینا بے دلیل بات ہے۔اس نقطہ نظر سے کہ طلاق مرد کے اختیار میں ہے اورعورت کی مشترک زندگی محفوظ نہیں تھی لہٰذا مہر کا حق عورت کودے کر،شوہر کی شخصیت پر بھروسہ کے ساتھ ایک مالی مطالبے کا بھی وثیقہ مانگا گیا............

صفحہ 72 پر فرماتے ہیں:

’’اگر دعہ 1133،قانون مدنی جس میں تصریح ہے:’’مرد جب چاہے اپنی بیوی کوطلاق دے سکتا ہے‘‘

اس کی اصلاح کر دی جائے اور مرد کی خواہش ورائے پر طلاق نہ ہوتو ''مہر'' و ''صداق'' کا فلسفہ وجود خود بخود ختم ہو جائے گا۔

اس قسم کی باتوں کی وقعتی ہماری سابقہ گفتگو کے بعد واضح ہو چکی مہر قیمت یا اجرت نہیں منطق و عقلی بات بھی کہی جا چکی ۔زن و مرد باہم برابر کی محتاج نہیں رکھتے ۔فطرت نے دونوں کو مختلف جہتوں میں رکھا ہے۔

سب سے زیادہ بے اساس یہ بات ہے کہ مرد کے حق طلاق کے مقابلے میں مہر کا فلسفہ مالی دستاویز بیان کیا گیا ہے اور دعویٰ ہے کہ اسلام نے اسی بنیاد پر مہر مقرر کیا ہے۔

اس قسم کے حضرات سے پوچھنا چاہیے:

اسلام نے مرد کو حق طلاق کیوں دیا جو عورت کو مال دستاویز کی ضرورت پڑی ؟اس کے علاوہ آپ کی بات کا تو مطلب یہ ہوا کہ۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ازدواج محترمہ کا مہر اس لیے مقرر کیا کہ حضرت اپنے مقابلے میں مالی وستاویز دینا چاہتے تھے۔ اور حضرت علیؑ وحضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے درمیان مہر اس وجہ سے تھا کہ حضرت فاطمہؑ کو مالی وستاویز دے کر علیؑ کے بارے میں ذہنی اطمینان حاصل کر لیں۔

اگر حقیقت یہ ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عورتوں کو یہ نصیحت کیوں فرماتے کہ اپنا مہر شوہروں کو بخش دیا کریں اور اس بخشش کے ذیل میں ثواب کیوں بیان فرماتے؟ نیز یہ کہ یہ نصیحت کیوں فرماتے کہ حتیٰ الامکان مہر زیادہ نہ رکھا جائے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک شادی کا ہدیہ مرد کی طرف سے عورت کے نام مہر کے طور پر دیا جائے اور عورت کی طرف سے مہر یا اس کے مساوی بخشش الفت اور رشتہ ازدواج میں استحکام کا باعث نہ تھا؟

اگر اسلام کی نظر میں مہر، مالی وثیقہ ودستاویز ہوتا،تو آسمانی کتاب

میں ''وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِہِنَّ نِحْلَۃً'' کیوں ہے۔یہ کیوں نہیں کہ وَاٰتُوا النِّسَاءَ صَدُقٰتِہِنَّ وثیقہ۔

ان باتوں سے بڑھ کر۔مصف مذکور نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ صدر اسلام میں رسم مہر ایسی ہی تھی جیسے آج ہے۔آج کل کی رسم کے مطابق مہر میں نمایاں پہلو مرد کی ایک ذمے داری وفریضہ ہے۔یعنی مرد ایک رقم معین عقد و دستاویز کے مطابق قبول کرتا ہے عموماً اس رقم کا مطالبہ بھی نہیں کیا جاتا۔البتہ لڑائی جھگڑے کے وقت مطالبہ ہوتا ہے تو اس قسم کا مہر دستاویزی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔صدر اسلام میں دستور تھا کہ مرد، مہر کے نام سے جس کا وعدہ کرتا تھا وہ نقد ادا کر دیتا تھا۔لہٰذا مہر کو اسلام کے نزدیک دستاویز قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی مہر کے بغیر کسی زوجہ کو شوہر کے حوالے کرنے پر خوش نہ ہوتے تھے۔اس سلسلے میں ایک واقعہ تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ شیعہ وسنی کتابوں میں مذکور ہے:

ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور حاضرین بزم کے ساتھ کہنے لگی:

یارسول اللہؐ! مجھے اپنی زوجیت میں قبول فرمالیں

آنحضرتؐ نے سکوت اختیار فرمایا، کوئی جواب نہ دیا، وہ عورت بیٹھ گئی ،ایک صحابی نے کھڑے ہوکر عرض کی۔

یارسول اللہؐ! اگر آپ مائل نہیں تو میں حاضر ہوں!

آنحضرتؐ نے پوچھا:

مہر کیا دوگے؟

میرے پاس کچھ نہیں۔

یوں تو نہیں ہوسکتا، گھر جاؤ شاید کچھ مل جائے جو ملے وہ لے آؤ اور اس بی بی کا مہر دے دو۔

وہ آدمی گھر گیا، واپس آیا اسے گھر میں کچھ نہ ملا۔

اچھا دوبار جاؤ ایک لوہے کی آنگوٹھی مل جائے تو وہی لے آؤ کافی ہے دوسری مرتبہ گیا، گھر میں کچھ تھا ہی نہیں۔عرض کرنے لگا، پس یہی کپڑے ہیں جو پہنے ہوئے ہوں۔

ایک صحابی نے۔۔اسے پہچان لیا اور کہا، یارسول اللہ بخدا اس شخص کے اس لباس کے علاوہ کچھ نہیں۔اسی کے نصف کو مہر قرار دے دیجئے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا:

اگر اسے دو حصے کر دیا جائے تو کسی کا بھی جسم تو نہ ڈھکے گا۔نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔

وہ شخص بیٹھ گیا۔عورت اسی انتظار میں دوسری طرف بیٹھی تھی۔محفل میں باتیں ہونے لگیں اور دیر ہوگئی۔وہ شخص اٹھا کہ جائے آنحضرت نے آواز دی:

ادھر آو!۔۔۔وہ حاضر ہوا۔

اچھا یہ بتاؤ۔قرآن آتا ہے؟

جی ہاں! یارسول اللہؐ فلاں فلاں سورہ آتا ہے۔

زبانی سنا سکتے ہو!

اچھا،ٹھیک ہے، یہ عورت تمہارے عقد میں دیتا ہوں اور مہر یہ ہے کہ اسے قرآن کی تعلیم دے دو۔

اس شخص نے بیوی کا ہاتھ ہاتھ میں لیا اور دونوں چلے گئے۔

مہر کے بارے میں اور بہت سی باتیں کہنے کی ہیں مگر اب یہیں پر ٹھہرتا ہوں۔

مہر و نفقہ (۳)

نفقہ

ہم مہر کے بارے میں اسلام کا نظریہ وفلسفہ بیان کر چکے، اب ''نفقہ'' کے متعلق بحث باقی ہے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلامی قوانین میں نفقہ بھی مہر کی طرح اس خاص نہج و انداز کی چیز ہے اس کو ان معنوں میں نہ سمجھنا چاہیے جو غیر اسلامی دنیا میں تھے یا آج بھی اس کا کوئی مفہوم کہیں مراد لیا جاتا ہو۔

اگر اسلام نے مرد کو یہ حق دیا ہوتا کہ عورت کو اپنی خدمت گزاری کیلئے رکھو۔ بیوی کی محنت کاروبار اور اس کی دولت کو اپنا مال سمجھو۔ تو نفقہ دینے کے معنی عیاں تھے۔ واضح سی بات ہے جب انسان کسی جانور یا آدمی سے اقتصادی فائدہ اٹھائے گا تو اس کے اخراجات زندگی بھی پورے کرے گا۔ گھوڑے والے اپنے گھوڑے کو دانہ پانی نہ دے گا تو جانور بھی گاڑی نہ کھینچے گا۔

اسلام مرد کے اس حق کو نہیں مانتا اس نے عورت کو حق ملکیت دیا ہے۔ وہ دولت کما سکتی ہے۔ مرد کو حق نہیں کہ بیوی کی خاص دولت میں تصرف کرے اور لازم قرار دیا کہ گھر کا بجٹ پورا کرے بیوی بچوں کا خرچ نوکر چاکر کام کاج گھر وغیرہ کے اخراجات ادا کرے۔۔ کیوں علت وسبب کیا ہے؟

افسوس ہے مغرب نواز ایک لمحہ کیلئے ان معاملات پر ذرا بھی توجہ دینے کو تیار نہیں ہیں۔ آنکھیں بند کر کے بعینہ وہی اعتراضات کرتے ہیں یورپ والے اپنے قانونی سسٹم پر کرتے ہیں۔۔۔ اور وہ صحیح بھی ہیں۔ یہ لوگ انہیں اعتراضات کو اسلامی قوانین پر دھرا دیتے ہیں۔

اگر کوئی کہتا ہے کہ مغرب میں بیوی کا نان ونفقہ انیسویں صدی میں وظیفہ خواری وتنخواہ داری ونشان کنیزی تھا تو غلط نہیں کہتا۔ سچ کہتا ہے۔ آخر ایک عورت بے معاوضہ پابند ہوکر مرد کی گھریلو زندگی کی دیکھ بھال کرے اور ملکیت سے محروم بھی ہو تو جو دو نالے اسے دیے جائیں گے وہ تنخواہ و وظیفے سے زیادہ کیا ہوں گے جیسے قیدی یا، بارکش جانور کا راتب۔

اگر دنیا میں کوئی قانون ایسا موجود ہو جو خاص طور پر جو مرد کی گھریلو زندگی کی ذمہ داریوں کا بطور فرض والا بوجھ بیوی کی گردن سے اٹھا لے، اسے دولت کمانے کا حق اور اقتصادی آزادی دے، گھریلو بجٹ میں شرکت سے معاف رکھے، جب تو یقیناً کوئی فلسفہ جدا گانہ ہوگا۔ اور اس کے اوپر غور کرنا پڑے گا۔

انیسویں صدی کے آخری حصے تک فرنگی عورت کی محرومی

ڈاکٹر شایگان نے ''شرح قانون مدنی ایران کے صفحہ 363 پر لکھا ہے:

''عورت اپنی ملکیت میں جو خودمختاری رکھتی ہے وہ فقہ شیعہ میں ابتدا سے تسلیم شدہ ہے۔ یونان، روم، جاپان اور کچھ عرصہ پہلے اکثر ممالک کے قوانین میں یہ بات مذکورہ نہ تھی۔ یعنی بیوی، نابالغ اور دیوانے کی طرح اپنی مالکیت سے ''مجور'' یعنی وہ اپنی جائداد اور املاک میں تصرف سے محروم تھی۔ انگلستان میں ایک زمانہ وہ تھا کہ بیوی کی حیثیت، شوہر کے وجود میں محو تھی۔ 1870ء اور 1882ء میں باری باری دو قانون وضع ہوئے جن کا نام شوہر رکھنے والی خواتین کا قانون ملکیت اس کی وجہ سے کورٹ آف وارڈس سسٹم کا خاتمہ ہوا۔

اٹلی میں یہ قانون 1919ء میں اور 1900ء جرمن کے قانون مدنی (رسول لا) یونہی 1907ء میں سویزرلینڈ کے قانون نے بیوی کی اہلیت وحق ملکیت وتصرف کو تسلیم

کیا جیسے شوہر کو یہ حق حاصل تھے۔

لیکن پرتگال وفرانسہ میں، باشوہر بیوی مجور شمار ہوتی ہے۔اگر 1938ء کی 18 فروری کو فرانس میں حجر (کورٹ آف وارڈس) کے ضابطے کو ہموار کر دیا گیا ہے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے صدی کی بات ہے یعنی بیوی کو شوہر کے مقابلے میں حق 1882ء میں ملا ۔ وہ بھی ۔انگلستان میں یا بیوی کی ملکیت سے بہ اصطلاح قانون ''کورٹ آف وارڈس'' شب ختم ہوئی۔

یورپ نے عورت کو اچانک اقتصادی خودمختاری کیوں دے دی

ایک صدی پہلے یہ حادثہ رونما ہوا کیسے؟ کیا مردوں کے انسانی جذبات میں جوش آیا اور انہیں اپنے ظالمانہ رویے کا احساس ہوا؟

ویل ڈیورینٹ نے اس کا جواب دیا ہے اس نے کتاب ''لذات فلسفہ'' میں وجوہ واسباب کے عنوان سے ایک بحث کی ہے یورپ میں آزادی خواتین کے اسباب وعلل پر اس میں تفصیل مہیا کی ہے۔افسوس ناک بات جو وہاں ملی وہ یہ ہے کہ یورپ کی آزادی وحق ملکیت عورت کو مشین کا شکر گزار ہونا چاہیے آدمیوں کا نہیں۔اسے بڑی بڑی مشینوں کے پہیوں کے سامنے جھکنا چاہیے۔مغربی مردوں کے سامنے نہیں۔یہ تو کارخانہ داروں کی حرص تھی۔ انہوں نے عورت سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی خاطر مزدوری کم اورکام زیادہ کے نقطہ نظر سے انگلستان کی قانون ساز اسمبلی میں مسودہ قانون آزادی اقتصادی خواتین کا بل پیش کر دیا۔

ویل ڈیورانٹ کہتا ہے:

''رسم ورواج قدیم کی دگرگونی کا کیا سبب بتاؤں وہ رسم ورواج جو تاریخ مسیحیت سے بھی پرانے تھے؟ ایک عام سبب اس تبدیلی کا مشینوں اور کارخانوں کی فراوانی ہے۔آزادی خواتین، صنعتی انقلاب کی پیداوار ہے............''

''ایک صدی پہلے انگلستان میں مردوں کو کاروبار ملنا مشکل ہوگیا تھا۔ مگر روزانہ اشتہاروں میں ان سے کہا جاتا تھا کہ اپنی بیوی بچوں کو کارخانوں میں بھیجیں ۔کارخانہ داروں کو اپنے منافع اور حصوں کی فکر تھی وہ حکومت کے اخلاق ورسم ورواج سے اپنا ذہن پریشان نہیں کرسکتے تھے ۔جن لوگوں نے بے خبری کے عالم میں ''گھر پھونکنے'' کا منصوبہ بنایا وہ وطن دوست انیسویں صدی کے وطن پرست کارخانہ دار تھے۔

''ہماری پرانی ماؤں کی آزادی کیلئے پہلا قدم 1982ء کا قانون تھا،اس قانون کی رو سے عظیم برطانیہ کی خواتین نے بے مثال امتیازات حاصل کیے۔ وہ جو پیسے حاصل کریں اپنے لئے محفوظ کرسکتی تھیں۔اس اعلیٰ درجے کا اخلاقی ومسیحی قانون کارخانہ داروں نے مجلس عوام میں پیش کیا تا کہ انگلستان کی خواتین کو فیکٹریوں میں کھینچ سکیں۔اس وقت سے آج تک نا قابل مقابلہ نفع اندوزی نے غلامی جان کنی ،گھروں سے نکالنے کی مہم جاری ہے عورتیں بندگی میں گرفتار،نزع کے عالم میں بڑی بڑی دوکانوں اور کارخانوں میں زندگی گزار رہی ہیں۔''

آپ نے دیکھا کہ سرمایہ داروں اور مالکان کارخانہ نے انگلستان میں اپنے مادی منافع کی خاطر عورتوں کے حق میں یہ قدم اٹھایا تھا۔

قرآن اور خواتین کی اقتصادی آزادی

اسلام نے چودہ سو برس پہلے ایک قانون دیا:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ

مرد جو کچھ کماتے ہیں وہ ان کا حصہ ہے اور عورتیں جو کماتی ہیں وہ ان کا حصہ ہے [۱]

اس آیہ کریمہ میں قرآن مجید نے مردوں کو ان کے نتائج کاروکوشش کا مالک اور عورتوں کو ان کے نتائج کاروکوشش کا حقدار قرار دیا ہے۔

دوسری آیت مبارکہ ارشاد ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ [۲]

جو مال باپ یا ماں یا قرابت دار مرنے کے بعد چھوڑیں اس میں مردوں کا حصہ ہے اور جو مال ماں باپ یا قرابت دار مرنے کے بعد چھوڑیں اس میں عورتوں کا حصہ ہے۔

اس آیت سے خواتین کی وارث ہونے کی حیثیت ثابت ہوتی ہے عورت کے وارث ہونے نہ ہونے کی تاریخ بھی تفصیل طلب ہے، جسے انشاء اللہ ہم بیان کریں گے۔ جاہلیت کا عرب عورتوں کو میراث دینے پر تیار نہ تھا۔ قرآن نے عورتوں کا یہ حق ثابت کردیا۔

---

[۱] القرآن الکریم۔ النساء۔ 32

[۲] القرآن الکریم۔ النساء۔ 7

ایک تناظر

قرآن کریم نے تیرہ سو برس پہلے یورپ میں عورتوں کو اقتصادی آزادی عطا کی فرق یہ تھا:

ا۔اسلام کا خواتین کو اقتصادی آزادی عطا کرنے کا سبب، اسلام کی انسانی جہت، عدل و دوستی والٰہیت کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ نہ انگلستانی کارخانہ داروں کی ہوس نفع اندازوزی تھی جس نے اپنے پیٹ بھرنے کیلئے نہ مسودہ قانون پیش کیا ہو۔ اس کے بعد وہ ڈھول پیٹتے کہ ہم نے عورت کے حقوق کو قانونی طور پر منوایا ہم نے زن و مرد کے حقوق کو برابر تسلیم کیا۔

۲۔اسلام نے عورت کو اقتصادی آزای بخشی ،لیکن بقول ویل ڈیو رینٹ ،خانہ براندازی نہیں کی۔ گھر میں آگ نہیں لگائی ۔خاندانوں کی نیونہیں اکھیڑی ،بیویوں کوشوہروں ، بیٹیوں کو باپوں کے خلاف سرکشی پر نہیں ابھارا۔ اسلام نے ان دوآیتوں سے ایک عظیم سماجی انقلاب بر پا کیا مگر پرسکون بے ضرر اور بے خطر۔

۳۔یورپ نے جو کچھ کیا ہو بقول ''ویل ڈیورانٹ'' یہ تھا کہ عورت کو گھر کی بندگی و جان کندنی سے آزاد کر کے دوکانوں اور کارخانوں کی بندگی کندنی میں ڈال دیا، یعنی مغرب نے ایک ہتھکڑی بیڑی ،عورت کے ہاتھ پاؤں سے کھولی اور دوسری ہتھکڑی بیڑی ڈال دی۔ اسلام نے عورت کو مرد کی بندگی و کنیزی سے گھر اور کھیت دنوں کی جگہ آزادی بخشی اور مرد کو گھریلو اجتماعی زندگی کے اخراجات کا ذمہ دار بنایا عورت کے کاندھوں سے اپنے اور گھر کے اخراجات اور ہر قسم کا جبر و پابندی کا بوجھ آتار دیا۔ اسلام کی نظر میں عورت انسانی خمیر کے مطابق دولت کے حصول اس کی حفاظت واضافہ کی سعی کرسکتی ہے۔اسے زندگی کا جبر نہیں دبا سکتا اور اس کی خودداری

وجمال وزیبائی ہمیشہ اطمینان خاطر کے ساتھ اس کے ہمراہ رہ سکتی ہے زندگی کا جبر اسے نہیں چھین سکتا۔لیکن کیا کیا جائے ہمارے کچھ لکھنے والوں کی آنکھیں اور کان بند ہو چکے ہیں کہ ان مسلم تاریخی وفلسفی حقائق کو سوچیں۔

انتقاد اور جواب

خانم منوچہریان نے ''انتقاد برقوانین اساسی ومدنی ایران کے صفحہ 37 پر لکھا ہے:

''ہمارا سول لا ،ایک طرح تو مرد کواپنی بیوی کا نفقہ دینے پر تیار کرتا ہے۔ اس کیلئے کپڑے لتے ،خوراک اورمکان دے، جیسے مالک اپنے گھوڑے گدھے کیلئے خوراک اورتھان مہیا کرتا ہے اسی طرح بیوی کو کم ازکم زندگی کے یہ اسباب فراہم کرے دوسری طرف نہ معلوم کیوں سول لا کی دفعہ 1110 میں لازم قرار دیتا ہے کہ عدۃ وفات میں بیوی کونفقہ کا حق نہیں ہے۔حالانکہ وفات شوہر کے وقت عورت مہربانی تسلی کی محتاج ہوتی ہے،وہ اپنے مالک کو ہاتھ سے کھو، بیٹھنے پر پریشاں حال وآشفتہ خاطر نہ ہو، ہمدردی وغم خواری چاہتی ہے۔ممکن ہے آپ فرمائیں کہ تم تو آزادی کا دم بھرتی ہو، ہرمنزل میں مرد کے برابر ہونا چاہتی ہو یہاں وظیفہ خوارراتب دار بننے کی آرزو کیوں ہے۔ یہ امید کیوں کرتی ہو کہ شوہر کے بعد بھی یہ بندگی وتنخواہ جاری رہے۔ جواب یہ ہے کہ فلسفہ کنیزی زن کے مطابق جو''سول لا'' کا سانچہ ہے۔بقول سعدی اچھا ہوتا کہ ''مالکان آزادی'' اپنے بعد کیلئے بھی بیوی کیلئے نفقہ مقرر کرجاتے اورقانون اس پہلو کی نگہداشت کرلیتا۔

ہم محترمہ سے پوچھتے ہیں، قانون مدنی اورقانون اسلام یابقول آپ کے فلسفہ کنیزی زن میں کہاں سے آپ نے یہ دریافت کیا ہے کہ مرد بیوی کا مالک ہے

؟اور مرد کا نفقہ دینا اس سبب سے ہے کہ عورت اس کی مملوک ہے۔ یہ کون سی ملکیت ہے کہ مالک اس سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ ''پانی کا گلاس اٹھا دو'' یہ مالکیت کیسی مالکیت ہے کہ مملوک چھوٹا سا کام بھی مالک کیلیئے انجام دے۔ اگر اس کی خواہش ہو۔ تو مزدوری طلب کرنے کا حق رکھتا ہے۔ یہ کیسا مالک ہے جو اپنے زیر دست سے اپنے بچے کو مفت دودھ نہیں پلوا سکتا، حالانکہ مالک کے گھر میں بچہ اسی نے جنا ہے۔

دوسرے یہ کہ۔۔۔ جو بھی کسی کا کھاتا پیتا ہو وہ مملوک ہوا کرتا ہے؟ اسلام ہو یا کوئی بھی قانون ہو، اولاد باپ یا ماں باپ دونوں کے واجب النفقہ ہیں۔ تو اس دلیل کے مطابق تمام دنیا کے قوانین اولاد کو باپ کی ملکیت مانتے ہیں۔ اسلام کا حکم ہے کہ اگر ماں باپ غریب ہوں تو اولاد پر ان کا نان ونفقہ واجب ہے یعنی اسلام نے باپ اور ماں کو اولاد کا مملوک قرار دیا ہے؟

تیسرے یہ کہ۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات ہے کہ فرماتی ہیں۔ بیوی کا نفقہ عدہ وفات میں کیوں واجب نہیں؟ اس وقت بیوی اپنے میاں کو ہاتھ سے کھو بیٹھتی ہے وہ شوہر کے روپے کی زیادہ محتاج ہے۔

جیسے محترمہ، سو سال پہلے کے یورپ میں رہتی ہیں، عورت کی احتیاج، شوہر کے نفقہ دینے کی اساس نہیں ہے۔ اگر اسلام کی نظر میں عورت اپنے شوہر کی شریک حیات ہوتے ہوئے حق مالکیت سے محروم ہوتی تو یہ صحیح تھا کہ وفات شوہر کے بعد اس کا انتظام کیا جائے کیونکہ اس کی زندگی کی وضع بدل گئی۔ لیکن جو قانون بیوی کو حق ملکیت دے چکا ہے اور بیویاں اپنے اس حق کی بنا پر اپنا پیسہ شوہر کی زندگی میں محفوظ کر سکتی ہیں تو آشیانہ اجڑنے کے بعد کی ضرورت ہے ایک مدت کیلیئے ہی سہی وہ نفقہ لیں۔ نفقہ کا حق مرد کے آشیانے کی زیبائش کیلیئے تھا آشیانے کی ویرانی کے بعد کوئی ضروری نہیں یہ حق جاری رکھا جائے۔

نفقہ کی تین قسمیں

اسلام میں نفقہ تین نوع کا ہے:

ا۔مملوک کو مالک کی طرف سے دیا جانے والا نفقہ وہ اخراجات جو حیوانات کے مالک ان جانوروں پر کرتے ہیں اس نفقہ کی بنیاد مالکیت ومملوکیت ہے۔

۲۔ وہ نفقہ جو کم سن اور محتاج اولاد کو دیا جاتا ہے یا وہ اخراجات جو غریب ماں باپ پر ہوتے ہیں۔اس نفقہ کی بنیاد مالکیت ومملوکیت نہیں ہے۔اس کی بنیاد وہ فطری حقوق ہیں جو اولاد اپنے وجود میں لانے والوں پر رکھتے ہیں اور والدین کے وہ حقوق ہیں جو تولید میں شرکت اور بچے کی پرورش وتربیت میں تکالیف برداشت کرنے کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں۔ اس نفقہ کے وجوب کی شرط یہ ہے کہ واجب النفقہ عاجز وغریب ہو۔

۳۔وہ نفقہ جو شوہر اپنی بیوی کو دیتا ہے اس نفقہ کی بنیاد نہ مالکیت ہے، نہ مملوکیت، نہ وہ فطری حق جو نوع دوم میں بتایا گیا ہے، نہ اس کی بنیاد بیوی کا غریب وعاجز ہونا ہے۔

بیوی ،ملینوں کی مالک اور بے حد وحساب آمدنی کی مالک ہو، اور شوہر کی آمدنی کم ہو جب بھی گھر کے اخراجات جن میں بیوی کا نجی خرچ بھی شامل ہے۔مرد کے ذمہ ہے۔

پہلی اور دوسری نوعی وقسم کے نفقے سے اس نفقے کا فرق یہ بھی ہے کہ ان دونوں مقامات میں اگر آدمی اپنی ذمہ داری پوری نہ کرے اور نفقہ نہ دے تو گنہ گار ہوگا مگر وہ قرض نہیں جس کی ادائیگی یا مطالبہ کیا جاسکے،یعنی اس کی قانونی حیثیت نہیں ہے تیسری قسم کے نفقے میں اگر آدمی غفلت کرے تو بیوی کو قانون چارہ جوئی کا حق ہے وہ

دعویٰ کرسکتی ہے اور ثبوت کے بعد وہ عدالت کے ذریعے اپنے واجبات وصول کرسکتی ہے۔اس نفقہ کی بنیاد کیا ہے؟اس پر آئندہ فصل میں ہم بحث کریں گے۔

کیا آج کی بیوی مہر ونفقہ نہیں چاہتی؟

میں نے کہا ہے: اسلام کی نظر میں گھریلو بجٹ کی فراہمی جس میں بیوی کے ذاتی اخراجات بھی ہیں مرد کے ذمے ہے اس کی ذمہ داری عورت پر نہیں ہے۔خواہ بیوی بہت بڑی سرمایہ دار اور شوہر کئی گنا زیادہ مال رکھتی ہو اسے اخراجات میں شرکت پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔نہ روپے کیلئے نہ کسی کام کیلئے فقط اور فقط وہ خود اپنے ارادے اور خواہش سے جو کرنا چاہے وہ کرے۔

اسلام کی نظر میں باوجودیکہ زندگی کے اخراجات جن میں عورت کے مصارف بھی داخل ہیں مرد کے ذمے ہیں پھر بھی مرد کو کسی قسم کا اقتصادی تسلط اور بیوی کی فردی قوت اور کام سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے وہ استثمار نہیں کرسکتا۔بیوی کا نفقہ اس حیثیت سے نفقہ والدین سے مشابہت رکھتا ہے کہ وہ بھی خاص حالات میں اولاد کو دینا پڑتا ہے اور اس کے عوض میں وہ ماں یا باپ سے خدمت نہیں لے سکتا۔

مالی معاملات میں عورت کی نگہداشت

اسلام نے بے مثال انداز میں عورت کی مالی حیثیت سے نگہداشت کی ہے۔ایک طرف اسے اقتصادی آزادی دے کر مرد کی دست رو بالا دستی کو کم کیا ہے عورت کے معاملات میں مرد کی قیمومیت کو۔جو پرانی دنیا میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور یورپ میں بیسویں صدی تک باقی رہی۔شوہر سے لے لی۔دوسری طرف گھریلو اخراجات کی

فراہمی کو بوجھ اس کے کاندھے سے اتار کر اسے پیسے کے پیچھے دوڑنے اور ہر قسم کے جبر و پابندی اور دوادوش سے معاف کر دیا۔

مغرب پرست جب خواتین کی حمایت کا نام لے کر اس قانون پر تنقید کرنا چاہتے ہیں تو وہ مجبور ہو کر شاخ در شاخ دروغ بے فروغ کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔نفقہ کا فلسفہ ہے مرد کا اپنے تئیں عورت کا مالک سمجھنا اس سے اپنی خدمت لینا۔جیسے جانوروں کا مالک اپنے مملوکہ جانوروں کا خرچ برداشت کرنے پر مجبور ہے کہ وہ چوپائے اسے اپنی سواری دے سکیں اس کیلئے بار برداری کر سکیں قانون نفقہ زن بھی اسی لئے ضروری ہے کھاؤ مرو نہیں۔

جو شخص ان معاملات میں قانون اسلام پر حملہ کرنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ اسلام نے حد سے زیادہ عورت پر نوازش کی ہے اور مرد پر دباؤ ڈالا ہے اسے بیکار میں پکڑ کر عورت کی مزدوری کروائی ہے۔تو یہ کہنے والا اپنی بات کو بڑا آب و رنگ دے کر پیش کر سکتا ہے نہ یہ کہ عورت کا نام اور اس کی حمایت کا ڈھونگ رچا کر اس قانون پر حملہ کرے۔

درحقیقت اسلام عورت کے مفاد اور مرد کے خلاف یا مرد کے مفاد اور عورت کے خلاف قانون نہیں بنانا چاہتا۔ اسلام نہ مرد کا حامی ہے نہ عورت کا اسلام اپنے قوانین میں انسانی معاشرے کی بہبود کو ملحوظ رکھتا ہے میاں بیوی اور ان کی آغوش میں پرورش پانے والے بچے خوش وخوشحال رہیں۔اسلام کی نظر میں میاں بیوی اور اولاد کی فلاح و بہبود کا راستہ یہ ہے کہ فطرت نے جو قوانین اور قاعدے جوڑ دیے اور طریقے قادر و توانا خالق سے حاصل کیے ہیں ان سے چشم پوشی نہ کی جائے۔

ہم نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ اسلام نے ہمیشہ اس کلیہ کی نگہداشت کی ہے کہ مرد کو خریدار اور عورت کو مالک مال واسباب جانتا ہے۔اسلام کی نظر میں مشترک زندگی

ووصال میں مرد اپنے آپ کو فائدہ اٹھانے والا سمجھ کر اس عمل کا خرچ برداشت کرے۔ زن ومرد یہ نہ بھولیں کہ ان دونوں کی فطرت نے عشق کے دوجداگانہ رویے انہیں بخشے ہیں۔شادی اس وقت پائیدار ولذت بخش ومستحکم رہ سکتی ہے جب عورت ومرد اپنے اپنے فطری رویے کے مطابق سامنے آئیں۔

۲۔مرد وعورت کے نفقہ کا فرض اس علت ووجہ سے بھی ہے کہ فطرت کی طرف سے تولید نسل کی روح فرسااور رنج وزحمت کشی کی ذمہ داری عورت کے ذمہ رکھی گئی ہے۔اوراس سلسلے مرد کا ایک آن کیلئے لذت بخش عمل ہےاوربس عورت ہے کہ (کم سن اور بڑھاپے کے علاوہ) ماہواری کی بیماری جھیلے حمل کے دنوں کا بوجھ اٹھائے، پھران دنوں کی مخصوص بیماری سے گزرے، بچہ جننے اوراس کے عوارض ومشکلات سے دوچارہو۔ بچے کو دودھ دے،اس کی دیکھ بھال کرے۔

ان مرحلوں میں بدنی اوراعصابی قوت صرف ہوتی ہے کام کاج کیلئے اس کی توانائی میں کمی آتی ہے۔ان اسباب ووجود کے بعد بھی اگر قانون زن ومرد کو اخراجات زندگی میں مشابہ صورت حال میں قرار دے اورعورت کی حمایت نہ کرے تو خواتین کی حالت بڑی مظلومانہ ہوجائے۔ یہی معاملات ہیں جن کی بناپر جانوروں میں جنس نر جنس مادہ کی حفاظت کرتی ہے اورنر اپنی مادہ کو زمانہ حمل وتولید میں خوراک وآذوقہ مہیا کرنے میں مدد دیتا ہے۔

زن ومرد محنت وقوت اقتصادی اورتولیدی جیسے سخت کام میں ایک دوسرے کے مشابہ پیدانہیں ہوئے ہیں۔اگر بیگانگی کی بات آپڑے اورشوہر، بیوی سے کہدے کہ میں اپنی آمدنی سے ایک پیسہ بھی تم پر خرچ نہیں کروں گا تو بیوی ہرگز اس قابل نہیں کہ وہ مرد کے ہم پلہ کھڑی ہوسکے۔

ان باتوں سے قطع نظر عورت کو مرد سے کہیں زیادہ پیسے کی ضرورت ہوتی

ہے۔زیب وزینت کی زندگی کا حصہ ہے وہی اس کی اصلی ضرورت ہے۔ایک عورت اپنی عام زندگی میں اپنی زیب وزیبت شان وشوکت پر خرچ کرتی ہے وہ کئی مردوں کے خرچ کے برابر ہوتا ہے۔زیبائش وآرائش کے رجحان سے عورت خودبخود رنگینی و تنوع پیدا ہوتا ہے۔ایک مرد کیلئے ایک جوڑا جب تک پہنا جاسکے، پھٹ نہ جائے قابل استعمال ہے مگر ایک عورت کیلئے؟ عورت کیلئے ایک جوڑا اس وقت تک قابل استعمال ہے جب تک کہ وہ اسے نئے لباس میں ملبوس دکھائے۔بہت سے زیور آلات عورت کیلئے ایک دفعہ سے زیادہ پہننے کے قابل نہیں رہتے۔

حصول دولت کیلئے عورت کی محنت وکوشش مرد سے کم مگر دولت کا استعمال مرد سے کہیں زیادہ ہے۔

پھر یہ کہ عورت کا عورت رہنا، یعنی حسن وجمال، نشاط وغرورزن کی بقا زیادہ آشائش، زیادہ راحت چاہتی ہے اس کیلئے محنت کم اور اطمینان خاطر زیادہ درکار ہے۔ اگر عورت مرد کی طرح دائمی طور پر تلاش معاش اور فکر روزی میں سرگرداں اور پیسے کے پیچھے دوڑنے پر مجبور ہو، تو اس کا غرور ٹوٹ جائے، مرد کی طرح مالی پریشانیوں سے اس کے ماتھے پر بل اور پیشانی پر شکن پڑ جائے اس کی بھویں تنی ہوئی اور چہرہ شکستہ نظر آنے لگے۔اکثر لوگوں سے سنا ہے یورپ کی عورت تلاش معاش کیلئے کارخانوں اور دفتروں میں مجبوراً جاتی ہے اسے مشرقی زندگی کی تمنا رہتی ہے۔صاف سی بات ہے جس عورت کو ذہنی سکون نہ ہوگا اسے موقع ہی نہ مل سکے گا کہ وہ مرد کیلئے سرمایہ مسرت وخوشی مہیا کر سکے۔

لہٰذا فقط عورت کا مفاد نہیں، مرد اور گھر کی مرکزیت کا مفاد بھی اسی میں ہے کہ عورت تلاش معاش کی تھکا دینے والی جبری محنت سے معاف رکھی جائے۔مرد بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کے گھر کا مرکز، آسائش اور تھکاوٹ دور کرے بلکہ بیرونی پریشانیوں

کو بھلا دینے کا مرکز ہو۔عورت کے امکان میں وہ گھریلو ماحول کو آرام محل اور فراموش خانہ افکار بتادے۔کس قدر بدنصیب ہے وہ شوہر جو تھکا ماندا گھر میں قدم رکھے اور اپنے سے زیادہ تھکی ہاری بیوی کا سامنا کرے۔

یوں مرد کیلئے بہت ضروری ہے کہ بیوی، صحت ونشاط اور اطمینان خاطر سے رہا کرے۔

اسی نکتے کی خاطر، مرد، تیار رہتے ہیں کہ جان پر کھیل کر روپیہ کمائیں اور دونوں ہاتھ پر دولت رکھ کر بیوی کی نذر کریں کہ وہ کھلے ہاتھ اسے اپنے جسم وجاں پر خرچ کرے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد کو اپنی روحانی طلب کا احساس ہے، وہ یہ سمجھ چکا ہے کہ اللہ نے عورت کو سرمایہ آرام وآسائش روح بنایا ہے:

وَّجَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا لِيَسۡكُنَ اِلَيۡهَا [1]

اور اس سے اس کا جوڑا بھی بنایا تا کہ اس کے پاس رہے اور سکون حاصل کرے۔

شوہر سمجھتا ہے کہ اپنی بیوی کو جس قدر اطمینان خاطر عطا کرے گا اسی قدر بواسطہ اپنی بھلائی حاصل کرے گا گھر کے ماحول کو بارونق بنائے گا۔ وہ جانتا ہے کہ جوڑے میں کم از کم ایک تو افکار وآلام سے آزاد رہے کہ دوسرے روح کو سکون اور دل کو خوشی دے سکے۔تقسیم کار کے وقت بہتر یہی ہے کہ معرکہ حیات میں مقابلے کیلئے مرد کا باہر نکلنا ہی بہتر ہے اور سکون وراحت روح کا سامان کرنے کیلئے دوسرا شریک حیات --بیوی--کو ہونا چاہیے۔

مالی اور مادی معاملات میں عورت کو مرد کا نیازمند پیدا کیا گیا ہے

---

[1] القرآن الکریم، الاعراف-189

اور مرد کو روحانی ونفسیاتی پہلو سے عورت کا نیاز مند بنایا گیا ہے، عورت مرد کا سہارا لئے بغیر، مرد سے کئی گنا ضروریات کو پورا کرنے اور مالی احتیاجات سے فائدہ اٹھانے سے عاجز ہے۔ اسی بنا پر اسلام نے عورت کے قانونی شریک حیات کو-- فقط اس کے قانونی شریک زندگی۔ اس کیلئے مرکز اعتماد بنایا ہے۔

عورت اگر اپنی پسند کی شان وزیبائش چاہنے لگے اور اپنے قانونی شوہر پر ہی بھروسہ نہ کرے دوسرے مردوں پر بھی توجہ دینے لگے تو-- بصد افسوس-- یہ وہی حالت ہوگی جو آج کل مثالیں بن کر روز افزوں ہوتی جائے گی۔

نان ونفقہ کے خلاف پروپیگنڈا

شکاری مردوں کو راز معلوم ہو گیا ہے۔ نان ونفقہ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک سبب یہ ہے کہ جب بیوی کی شوہر کے پیسے سے غرض ختم کردی جائے گی تو وہ آسانی سے شکاری کی گود میں بیٹھ سکے گی کمپنیوں میں خواتین کو زیادہ رقم کی ادائیگی پر غور کیجئے تو میری بات کو بہت سمجھ سکیں گے۔

کسی بیوی کیلئے کیسے ممکن ہے کہ اپنی زندگی کا رابطہ شوہر سے توڑ لے پھر یہ چاہے کہ وہ اپنے معاملات کو جس طرح چاہے چلائے۔

اگر سچی بات سمجھنا چاہتے ہیں تو-- نان ونفقہ کی پابندی اڑانے --کی مہم میں ان مردوں کی کمک بھی ہے جو خواتین کی زینت وآرائش اور فضول خرچیوں سے عاجز آچکے ہیں۔ یہ لوگ آزادی ومساوات کے نام سے فائدہ اٹھا کر فیشن پرست فضول خرچ بیویوں سے اپنا انتقام لے رہے ہیں۔

ویل ڈیورنٹ نے اپنی کتاب ''پلیژر آف فلاسفی'' میں نئی شادی کے بیاں میں لکھا ہے:

’’قانونی شادی، قانونی طور پر حمل سے دوری اور طرفین کی رضامندی سے طلاق، اور اولاد و نفقہ نہ ہونے کی زمہ داری کا نام ہے۔‘‘

’’...... فیشن پرست، متوسط طبقے کی خواتین محنت کش مردوں کیلئے بہت جلد انتقام کا باعث بنیں گی جس کا نشانہ جنس خواتین ہوگی۔ شادی کے معنوی میں ایسی تبدیلی آئے گی کہ ایسی عورتیں ناپید ہو جائیں گی جو سرمایہ زینت اور بڑے مصارف رکھنے والے گھروں کی وحشت کا سبب ہیں۔ مرد مطالبہ کریں گے کہ بیویاں خود پورے کریں۔ دوستانہ شادی (نئی شادی) کا تقاضہ ہے کہ بیوی حمل کے وقت تک کام کرے۔ یہاں ایک نکتہ ہے جو عورت کی آزادی کو مکمل کردے گا۔ وہ ہے کہ۔ عورت شروع سے آخر تک اپنے اخراجات خود ہی پورے کیا کرے۔ صنعتی انقلاب اپنے ظالمانہ نتائج ۔۔عورت کے بارے میں ۔۔دکھا رہا ہے۔ عورت کو اپنے شوہر کے ساتھ کارخانے میں کام کرنا چاہیے۔ بیوی کا کمرے میں اکیلے بیٹھے رہنا اور مرد کا بیوی کے بے کار رہنے کے عوض میں دوگنا کام کرنا کیوں ضروی ہے۔ بیوی کو بھی کام اور صلے تنخواہ اور محنت کشی میں میاں کے برابر ہونا چاہیے۔‘‘

شوہر کی جگہ دولت

تولید نسل کی فطری ذمہ داری کا تقاضہ ہے کہ مالی و اقتصادی لحاظ سے کسی نقطہ اعتماد سے وابستہ ہو۔ یہ حقیقت قابل انکار نہیں ہے۔

آج یورپ میں ایسے افراد ہیں جنہوں نے آزادی نسواں کو وہاں پہنچا دیا ہے کہ مادر شاہی کا دور آجائے گا اور باپ، خاندان سے بالکل جدا کر دیا جائیگا۔ عورت کی مکمل اقتصادی آزادی، اور تمام حالات و معاملات میں مرد کی برابری کے بعد ، باپ عضو زائد بن کر خاندان سے نظر انداز ہو جائے گا۔

عین اسی ماحول میں یہ لوگ باپ کی جگہ دولت کو بٹھاتے ہیں دولت کو باپ کی جانشینی قبول کرنے کی درخواست دیتے ہیں وہ اس پر تیار نہیں ہوں گے کہ عورت تن تنہا خاندان بنائے اور ساری ذمہ داریاں اسے دیں کہ وہی مالی امداد بھی فراہم کرے اور حمل و تولید نسل سے دور ہو جائے ۔ انہیں معاشرے اور نسل کے ختم ہو جانے کا بھی خیال ہو گا یعنی گھریلو عورت اگر گزشتہ دور میں ''نفقہ خور'' ۔۔ اور بقول ''معرض'' مرد کی مملوکہ تھی ،تو مستقبل میں وہ نفقہ خور اور دولت کی باندی ہوگی اور باپ کا منصب اور اس کے فرائض اسے منتقل ہو چکے ہوں گے ۔

کاش! جو لوگ آنکھیں بند کر کے کنبہ کے مقدس ماحول کو جو قوانین مقدس آسمانی پر استوار ہے، کدال مار مار کر گرا رہے ہیں ۔ وہ اپنے کرتوتوں کے تنائج اور اس کے دوررس اثرات کو بھی سوچ لیں ۔

برٹرینڈرسل نے ''میرج اینڈ مورل'' میں ایک فصل کا عنوان رکھا ہے ۔ کنبہ اور حکومت ۔ اس میں بچوں کی تعلیم اور صحت کے بارے میں حکومت کی مداخلت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''بظاہر باپ بیالوجیکلی وجود کے تمام اسباب ہاتھ سے کھو چکا ہے...... باپ کو نکالتے ہیں ایک موثر عامل اور ہے اور وہ عورتوں کا مادی طور پر آزاد ہونے کا رجحان ہے ۔ جو خواتین آج کل الیکشن میں ووٹ دیتی ہیں ۔ عموماً گھروالیاں نہیں ہیں ۔ گھروالیوں کے اعتراضات بھی مرد خواتین سے زیادہ ہیں ۔ اور باوجود قانونی امتیازات کے کام میں مقابلے کی وجہ سے پیچھے رہ جاتی ہیں...... گھروالیوں کیلئے دو راستے ہیں جن سے وہ اپنی اقتصادی آزادی برقرار رکھ سکتی ہیں ۔

۱ ۔ اپنے کام میں مصروف رہیں (دفتر جائیں) بچوں کی دیکھ بھال کیلئے کھلائیاں نوکر رکھیں اور بچوں کو ان کے حوالے کر دیں اس کے نتیجے میں پرورشگاہ

اطفال اور کنگڈر گارڈن نامی اداروں کی فراوانی ہوگی۔ آخر کار نفسیاتی لحاظ سے بچے کا نہ باپ رہے گا نہ ماں۔

۲۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ جوان بیویوں کو مالی امداد، ماہانہ خرچ دیں کہ وہ خود اپنے بچوں کی دیکھ بھال کریں۔

آخری طریقہ، بجائے خود اس وقت تک مفید نہ ہوگا جب تک ماں کی نئی ذمہ داری یعنی بچے کی معین عمر تک پرورش کے بارے میں قانون وضع نہ ہو۔ مگر یہی ایک راستہ ہے جس میں خصوصیت یہ ہے کہ ماں خود اپنے بچے کو پالے گی بڑا کرے گی۔ اور اس عمل میں کسی طرح بھی مرد کی نظر میں حقیر نہ ہوگی............ اس قانون کی تکمیل کے بعد کنبے کے اخلاق پر اس کے ردعمل کا انتظار کرنا ہوگا ممکن ہے قانون یہ بات کہے کہ غیر قانونی بچہ جننے والی ماں شوہر کی مال امداد کی حقدار نہ ہوگی یا پھر ماں کی زنا پر موجود دلائل کے بعد خود باپ کو مالی امداد کی تجویز سامنے آئے۔ اس صورت میں مقامی پولیس کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ گھر والی خواتین کی نگرانی کرے۔ اس قانون کے نتائج بہت روشن نہ ہوں گے۔ اور یہ خطرہ بھی ہے کہ جو لوگ اس اخلاقی ارتقا کی مزا چکھ رہے ہیں اور اس کے موجد ہیں وہ زیادہ خوش نہ ہوں۔ آخر کار پولیس کی مداخلت ختم کر دی جائے اور وہ وقت آجائے کہ ناجائز مائیں بھی شوہر سے وظیفہ حاصل کرنے لگیں اس وقت مزدور طبقے کے باپ کی مالی حالت مکمل طور پر ختم ہوجائے گی اور اس کی اہمیت بچوں کیلئے کتے بلی سے بڑھ کر نہ ہوگی...... تمدن یا کم از کم جو تمدن اب تک پھیل چکا ہے وہ مادری احساسات میں روبزوال ہے۔

زیادہ امکان اسی کا ہے کہ اس تمدن کی نگہداشت کیلئے جو بہت زیادہ تبدیلیاں اور ترقیاں حاصل کر چکا ہے ایک وقت آئے گا جب حاملہ عورتوں کو اتنی امداد دینا پڑے گی کہ وہ اس عمل میں کچھ قاعدہ نفع حاصل کرسکیں پھر یہ ضروری نہیں کہ تمام یا

اکثر عورتیں مادرانہ نوکری پسند کریں۔آخر یہ کام بھی۔دوسرے کاموں کی طرح سنجیدگی اور مکمل واقفیت کے بعد ہی پسند کیا جاسکے گا لیکن یہ سب باتیں مفروضوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔میرا مدعا تو یہ ہے کہ خواتین کا انقلاب ''پدرشاہی'' کنبے کا زوال ہے جو قبل از تاریخ مرد کی عورت پر فتح مندی کی علامت تھا۔مغربی علاقوں میں باپ کی جگہ دولت کی آمد ایک ترقی شمار کی جاتی ہے جسے ہم دیکھ رہے ہیں۔.....''

عورت کا نفقہ ختم کردینے سے یا بقول اہل یورپ ''خواتین کی مادی آزادی'' سے مذکورہ بالا بحث کے بعد درج ذیل نتائج نکلیں گے: باپ کا کنبے سے خارج کیا جانا اور کم از کم باپ کی اہمیت کا خاتمہ اور ''مادرشاہی'' دور ماضی کی بازگشت۔

باپ کی جگہ دولت کی آمد اور ماں کا باپ کے بجائے حکومت سے مالی امداد حاصل کرنا۔

مادرانہ بات کا زوال۔

ماں کا جذباتی رخ کے بجائے نوکری اور فن کا رخ اختیار کرنا۔

ان باتوں کا واضح نتیجہ انسانیت کا خاتمہ ہے۔ہر بات ٹھیک ہوجائے گی بس ایک بات رہ جائے گی اور وہ ہے سعادت،خوشی اور وہ روحانی لذت جو کنبے مرکزیت سے حاصل ہوتی ہے۔

بہرحال میرا مقصد تو یہ ہے کہ --عورت کی مکمل آزادی وخودمختاری کے حامی بھی باپ کو کنبے کی فضا سے نکال کر،عورت کے فطری فریضے تولید نسل کو ایک حق اور امداد کا سبب مانتے ہیں اور کبھی تو اسے مزدوری اور کرایے کے طور پر حکومت پر ذمہ داری ڈالتے ہیں کہ وہ اس حق کو ادا کرے۔برخلاف شوہر کے جس کا فطری فریضہ اس کے جواب میں کوئی حق طلب نہیں کرتا۔

دنیا بھر کے مزدوروں کیلئے جو قانون ہے اس میں مزدوری کی کم سے کم

مقدار میں بھی بیوی بچوں کے خرچ کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔یعنی دنیا بھر کے قوانین میں بیوی بچوں کا نفقہ قانونی طور پر مانا جاتا ہے۔

کیا حقوق انسانی کا منشور عورت کی توہین کرتا ہے؟

حقوق انسانی کے منشور دفعہ 23 جز 3 میں ہے:

''جو بھی کام کرے اسے منصفانہ مزدوری اور قابل رضامندی حق دیا جائے جس سے اس کی اور اس کے کنبے کی زندگی انسانی طریقوں سے محفوظ رہ سکے۔''

دفعہ 29 جز 1 میں ہے:

''ہر شخص کا حق ہے کہ اس کی زندگی کا معیار خود اس کی اور اس کے خاندان کو خوراک، مکان طبی امداد اور دوسرے معاشرتی ضروریات کی کفالت کی جائے۔''

ان دونوں دفعات میں ضمناً یہ بات مان لی گئی ہے کہ جو مرد کنبہ بنائے اسے زن وفرزند کا نفقہ برداشت کرنا ہوگا۔اور ان کے اخراجات مرد کے ضروری اخراجات میں محسوب ہوں گے۔

منشور حقوق انسانی نے باوجودیکہ توضیح کر دی ہے کہ مردوزن کے حقوق مساوی ہیں پھر بھی شوہر کا بیوی کو نفقہ دینا مخالف مساوات حقوق مردوزن نہیں قرار دیا ہے۔ بنابریں جو لوگ ہمیشہ منشور حقوق انسانی کی تائید کرتے ہیں اور فخریہ سند پیش کرتے ہیں کہ ملک کے دونوں ایوانوں نے اس کی تائید کی ہے وہ --نفقہ-- کے مسئلے کو حل شدہ اور مسلمہ مسئلہ سمجھ لیں ۔اور کیا مغرب پرست حضرات خواسلام کے رنگ سے ہر رنگی ہوئی چیز کو رجعت پرستی اور غیر ترقی یافتہ بات کہتے ہیں وہ اجازت دیں گے کہ منشور حقوق انسانی کے آستانہ محترم کی بھی توہین فرمائیں گے۔اور اسے بھی مرد کی مالکیت اور عورت کی مملوکیت کی دستاویز قرار دیں گے۔

اور آگے بڑھیے۔ منشور حقوق انسانی پچیسویں دفعہ ہے: ''ہر شخص کا حق ہے کہ بیکاری، بیماری اعضا کی کمی، بیوگی بڑھاپے یا اور دوسرے مقامات کہ جہاں ارادہ انسانی سے باہر ہونے کی وجہ سے معاشی انتظام ہاتھ نہ آسکے، وہاں آبرومندانہ زندگی سے فائدہ اٹھائے۔''

اس مرحلے میں ''منشور حقوق انسانی'' نے اس سے قطع نظر کہ شوہر کی موت کو بیوی کیلئے ذریعہ معاش کا خاتمہ مانا ہے۔ بیوگی کو بیکاری، بیماری اور نقص اعضا کی فہرست میں رکھا ہے یعنی خواتین کو بیکاروں اور بیماروں، بوڑھوں اور افراد ناقص الاعضا کے برابر لکھا ہے کیا یہ خواتین کی بہت بڑی توہین نہیں ہے؟ طے ہے اگر مشرق کے کسی علاقے میں کسی کتاب یا قانون کے اندر اس قسم کی تعبیر لوگوں کے ہاتھ آجاتی تو اعتراضات واحتجاجات کا ہنگامہ آسمان تک جاتا ہے جس کی مثال ہم اپنے بعض قوانین کے بارے میں دیکھ چکے ہیں۔ ایک حقیقت پسند اور حقائق پر نظر رہنے والا آدمی جو ہنگامہ آرائی سے نہ ڈرا ہو وہ تو بات کے تمام پہلو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ:

نہ قانون تخلیق نے مرد کو عزت کیلئے وسیلہ معاش بنایا ہے۔ نہ منشور حقوق انسانی نے مرد کو وسیلہ معیشت مانا ہے اگر چہ اس نے بیوی کو وسیلہ کھو بیٹھنے والی کہا ہے۔ نہ قانون اسلام نے جو بیوی کو مرد کیلئے واجب النفقہ سمجھتا ہے کسی نے عورت کی توہین نہیں کی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ قضیہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ عورت مرد کی نیازمند پیدا ہوئی ہے اور مرد عورت کیلئے نقطہ اعتماد ہے۔

زن و مرد کو زیادہ بہتر و بیشتر انداز میں باہم رہنے سہنے اور کہنے کے ماحول کو سعادت وخوشحالی بشر سے استوار کرنے کی خاطر قانون خلقت نے ایک دوسرے کا نیازمند پیدا کیا اس نے اگر مرد کو مالی اعتبار سے عورت کا مرکز اعتماد بنایا تو عورت کو نفسیاتی سکون کے اعتبار سے مرد کا نقطہ اعتماد خلق کیا۔ ان دو مختلف نیازمندیوں کے سبب ایک کو دوسرے سے قریب اور متحد رہنے میں مدد ملتی ہے۔

نواں حصہ

مسئلہ میراث

اسلام نے عورت کی میراث میں عدم توازن کو ختم کیا۔

بیوی کے وارث ہونے کا پہلو، مہر ونفقہ کی بنیاد پر ہے اس کی علت و وجہ نہیں ہے۔

اگر فقط اقتصادی پہلو زیر نظر ہوتا تو زن و مرد کی میراث میں اسلام فرق کا قائل نہ ہوتا۔

مرد کی میراث کا دوگنا ہونا اس وجہ سے ہے کہ مرد کے بجٹ پر دوسرے بوجھ بھی پڑتے ہیں۔

خلاصہ مطالب از مولف

مسئلہ میراث

قدیم دنیا میں یا تو عورت کو ترکہ بالکل نہیں دیا جاتا تھا یا ترکہ دیتے تو تھے مگر اس سے بچوں جیسا سلوک کرتے تھے۔یعنی اسے آزادی اور قانونی حیثیت نہ دیتے تھے۔ پرانی دنیا قوانین میں کہیں لڑکی کو میراث دی جاتی تھی مگر اس کی اولاد محروم رہتی تھی، برخلاف لڑکے کے وہ خود بھی ترکہ لیتا اور اس کی اولاد کو بھی دادا کا ترکہ لینے کا حق تھا۔ دنیا کے کچھ حصوں میں عورت کو مرد کی طرح ترکہ دیتے تھے مگر کوئی قطعی حصہ معین نہ تھا بلکہ قرآنی تعبیر کے مطابق نصیب مفروض --فرض کردہ حصہ-- صورت یہ تھی کہ مورث کو حق تھا وہ اپنی لڑکی کے بارے میں اگر چاہے تو وصیت کردے۔

میراث خواتین کی تاریخ بہت طولانی ہے محققین اور باخبر حضرات نے بڑی بری بحثیں لکھی اور تحریریں چھوڑی ہیں ان کی لکھی اور کہی ہوئی باتوں کا دھرانا ضروری نہیں سمجھتا کہ انہیں نقل کروں یا بحث خلاصہ ذکر کردیا ہے۔

میراث سے عورت کی محرومی کے اسباب

عورتوں کی میراث سے محرومی کا اصل سبب تو یہ تھا کہ دولت ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں نہ جانے پائے،قدیم عقائد کے مطابق تولید فرزند میں ماں کا حصہ کم سمجھا جاتا تھا، ماں ایک ظرف تھی جس میں باپ کا نطفہ رہتا اور پرورش پاتا اور اولاد کی صورت بن جاتا۔ لہذا وہ لڑکے اولاد کہلاتے اور اسی کے خاندان کا جز بنتے لڑکی کی اولاد،لڑکی کے خاندان کے افراد ہونے کے بجائے اس کے شوہر کے خاندان سے متعلق مانے جاتے تھے۔ الہذا جب لڑکی وارث ہوتی تو اس کی وارثت اس کے بچوں کو ملتی اور وہ جائداد دوسرے خاندان میں چلی جاتی۔

''ارث درحقوق مدنی ایران'' تالیف، ڈاکٹر موسیٰ عمید مرحوم کے صفحہ آٹھ پر یہ گفتگو ہے کہ قدیم ادوار میں خاندانوں کی بنیاد مذہب بنا تا تھا، فطری روابط کا اثر نہ تھا۔آگے لکھتے ہیں:

''مذہبی سربراہی کنبوں کے اندر ''پدرشاہی'' تھی جو بڑے باپ سے تعلق رکھتی تھا۔اس کے بعد مذہب کے رسم ورواج وآداب کی ادائیگی اولاد ذکور میں یکے بعد دیگرے منتقل ہوتی ،گزشتہ زمانے کے لوگ بقاء نسل کا سبب مرد کو جانتے تھے۔ اور کنبے کا باپ جس طرح اپنے بیٹے کیلئے زندگی بخشی ہوتا اسی طرح اپنے رسم ورواج ومذہبی آداب ،آگ کی نگہداشت خاص بھجن بھی اسی کے سپرد ہوتے تھے۔ہندوؤں کی ویدا اور یونان روم کے قوانین میں درج ہے کہ۔قوت تولید فقط مردوں کے پاس ہے۔ اس قدیم عقیدے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندانوں کے مذہب مردوں سے مخصوص ہو گئے ۔اورخواتین باپ یاشوہر کے بغیر مذہب کے معاملے میں دخل نہیں دے سکتی تھیں...... چونکہ مذہبی امورانجام دینے سے محروم تھیں لہٰذا خاندانی امتیازات سے بھی فائدہ اٹھاسکتی تھیں ۔اس کے بعد والے مرحلے میں جب''وارثت'' ایجاد ہوئی توعورتیں اس حق سے محروم ہوگئیں۔

خواتین کی وارثت سے محرومی کے اسباب وعلل اس کے علاوہ بھی ہیں ایک ان میں سپاہی فوجی بننے کیلئے طاقت کی کمی ہے جس تمدن میں پہلوانی ودلاوری کی بنیاد پرعزاز واختیار ملتا تھا،ایک فوجی کو ہزاروں غیرفوجیوں پر برتری دی جاتی تھی۔ وہاں عورت دفاعی اورفوجی کام نہ کرنے کی بنا پر وارثت سے محروم کی گئی۔

جاہلیت (دورقبل ازاسلام) کے عرب بھی اسی بنیاد پر میراث زن کے خلاف تھے اور جب تک وہ مرد کی طرح ثابت قدمی نہ دکھاتی تھی اس وقت تک ترکہ نہیں دیتے تھے۔لہٰذا جب آیت ارث نازل ہوئی:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۖ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا ۝

ماں باپ اور رشتے داروں کے ترکے میں مردوں کا حصہ ہے اور والدین واہل قرابت کے ترکے میں عورتوں کا حصہ ہے۔خواہ ترکہ کم ہو زیادہ یہ حصہ معین شدہ ہے۔(القرآن الکریم سورۃ النساء۔7)

عربوں کو بڑا تعجب ہوا۔انہیں دنوں مشہور شاعر حسان بن ثابت کے بھائی کا انتقال ہوا انہوں نے اپنے پسماندگان میں بیوی اور کئی لڑکیاں چھوڑیں اس کے چچا زاد نے ساری جائداد پر قبضہ کرلیا۔بیوہ اور بچیوں کو کچھ نہ دیا، بیوہ اپنی شکایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے کر حاضر ہوئی، آنحضرتؐ نے سب کو طلب فرمایا: ان لوگوں نے کہا کہ ہم ہیں جو شمشیر بکف ہوتے اور اپنا نیز ان عورت کا دفاع کرتے ہیں دولت بھی ہمیں ملنا چاہیے۔اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم الٰہی سنایا اور فرمان خدا نافذ کیا۔

منہ بولا لڑکا وارث ہوتا تھا

جاہلیت میں عرب کسی کو بیٹا بنا لیتے تھے اور آخر میں وہی منہ بولا لڑکا مرنے والے کا حقیقی وارث قرار پاتا تھا۔متبنیٰ کی رسم دوسری قوموں میں بھی، جیسے ایران قدیم روم...... اس رسم کے مطابق متبنیٰ کو وہ امتیازات حاصل ہوجاتے تھے جو حقیقی بیٹوں کو حاصل نہ ہوتے تھے۔مثلاً متبنیٰ کی ایک اہمیت یہ تھی کہ وہ ترکہ حاصل کرتا تھا، یا بیٹا بنانے والا منہ بولا بیٹے کی بیوی سے شادی نہیں کرسکتا تھا یہ بھی ایک امتیازی بات تھی قرآن کریم نے اسے بھی ختم کیا۔

ہم پیمان کا ترکہ رضامن الجریرہ

عربوں میں رسم بھی تھی کہ دو اجنبی آدمی آپس میں معاہدہ کرتے تھے:

''میرا خون تمہارا خون ہے مجھے سے ٹکر تم سے ٹکر ہے میں تمہاری وراثت لوں گا تم میرے وارث بننا ہے۔''

اس معاہدے کی رو سے یہ دونوں غیر آدمی ایک دوسرا کا دفاع کرتے، حفاظت جان و مال کرتے اوران میں جو پہلے مرتا دوسرا اس کا وارث بنتا تھا۔

بیوی، ترکہ کا حصہ تھی

کبھی کبھی عرب مرنے والے کی بیوی کو بھی مال وجائداد میں شمار کرتے اور میراث کا ایک حصہ سمجھ کر اس سے وہی معاملہ کرتے تھے۔ اگر مرنے والے کا دوسری بیوی سے کوئی لڑکا ہوتا تھا تو اس لڑکے کو حق تھا وہ بیوہ کے منہ پر رومال یا چادر ڈال دیتا اور اسے اپنے قبضہ میں لے لیتا یہ اسے اختیار تھا کہ اس سے شادی کر لے یا کسی دوسرے شخص سے اس کی شادی کرا دے اور اس کا مہر خود حاصل کرے۔ یہ رسم بھی عربوں کے علاوہ دوسری قوموں میں موجود تھی اسلام نے اسے بھی منسوخ کیا۔

ہندوستانی، جاپانی، رومی، یونانی اور ایرانی قوموں کے قوانین میں میراث کے مسئلے میں طبقہ بندی بہت تھی، اگر صاحبان علم کے اطلاعات ہم نقل کرنا شروع کریں تو کئی مقالے تیار ہو جائیں گے۔

ساسانی عہد کے ایران میں عورت کا وارث ہونا

سعید نفیسی مرحوم نے ''تاریخ اجتماع ایران از زمان ساسانیاں تا انقراض

امویاں'' میں صفحہ 42 لکھا تھا ہے:

''خاندان کی تشکیل کے سلسلے میں ایک اور دلچسپ نکتہ جو ساسانی تمدن میں دکھائی دیتا ہے وہ یہ ہے کہ جب لڑکا بالغ ودانش مند ہونے لگتا تو باپ اپنی متعدد بیویوں میں سے ایک کی اس سے شادی کر دیتا تھا۔ ایک اور نکتہ، ساسانی تہذیب میں عورت کو قانون حیثیت حاصل نہ تھی۔ باپ اور شوہر کے اختیارات اس کی ملکیت کے بارے میں بہت وسیع تھے۔

لڑکی پندرہ برس کی ہوتی اور جوانی آجاتی تو باپ یا خاندان کا سردار اسے بیاہنے کا پابند تھا۔لیکن لڑکے کی شادی بیس سال میں ضروری سمجھتے تھے۔

شادی میں باپ کی رضامندی شرط تھی۔

جولڑکی بیاہ جاتی وہ باپ یا اپنے سربراہ کی وارث نہیں ہوسکتی تھی۔

شوہر کے انتخاب میں لڑکی کے کسی حق کو نہیں مانتے تھے۔

بالغ ہونے کے بعد اگر باپ شادی کرنے میں کوتاہی کرنا تو لڑکی کو ناجائز شادی کا حق تھا مگر وہ باپ کی میراث سے محروم ہو جاتی تھی۔

ایک مرد لاتعداد بیویاں بنا سکتا تھا۔ یونانی دستاویزات میں تو یہ بھی ملتا ہے کہ ایک ایک آدمی کی کئی کئی سو بیویاں تھیں۔

ساسانی دور میں، زردشتی مذہبی کتابوں کے بموجب شادی کے بڑے پیچیدہ اصول تھے، اور پانچ طرح کی شادیاں عام تھیں۔

ا۔ جو عورت، ماں باپ کی اجازت سے شوہر کے گھر جاتی اور اس کے یہاں بچے ہوتے تھے تو وہ بچے اس دنیا اور دوسری دنیا میں اسی کی اولاد ہوتے، اسے ''بادشاہ زن'' کہتے تھے۔

۲۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی --''اوگ زن''-- کہلاتی یعنی، یگانہ عورت

۔اس کے یہاں جو پہلا بچہ ہوتا وہ نانا ،نانی کو دے دیا جاتا تھا کہ ان کے بیٹے کی جگہ لے گویا وہ بچہ انہیں کے گھر سے گیا تھا اور میاں بنایا تھا۔ اس کے بعد یہ عورت بھی ’’بادشاہ زن‘‘ کہی جاتی تھی۔‘‘

۳۔اگر آدمی بالغ ہونے کے بعد بن بیاہا مرجاتا تو اس کا خاندان اجنبی عورت کو جہیز دیتا اور غیر آدمی کے ساتھ بیاہ دیتا۔اس عورت کو’’سزرزن‘‘ ۔منہ بولی بیوی۔ کہتے تھے۔اس کی اولاد آدھی اس مردہ آدمی کی قرار پاتی اور اس دنیا میں اس کی اولاد کہی جانے کا یقین تھا اور آدھی اولاد زندہ شوہر کی ہوتی۔

۴۔بیوہ اگر دوسرا شوہر کر لیتی تو اسے’’جغرزن‘‘ نام دیتے۔یعنی چاکرزن ،نوکر بیوی لیکن اگر پہلے شوہر سے اولاد رکھتی ہوتو۔۔سزرزن۔جانتے تھے۔

۵۔ماں باپ کی اجازات کے بغیر شوہر کے گھر جانے والی عورتیں بہت پست سمجھی جاتی تھیں اور اس قسم کی بیوی کو’’خودسرای زن‘‘۔۔خودسر۔۔بیوی کہتے تھے۔اسے ماں باپ کی میراث نہیں ملتی تھی اور اسے’’اوگ زن‘‘ کے طور پر نکاح میں لاتے تھے۔

اسلام کی نظر میں عورت کا حصہ میراث

میراث کے سلسلے میں قوانین اسلام کے اندر گزشتہ دور میں کوئی ناہمواری موجود نہیں ہے۔ جو چیز قانون اسلام میں معترضین کے قابل اعتراض ہے وہ مرد کے مقابلے میں عورت کا’’نصف سہم‘‘ ہے۔ یہاں مرد و زن کی مساوات کا دم بھرنے والے بولتے ہیں۔

لڑکا۔۔دولڑکیوں کے برابر حصہ دار ہے۔

بھائی۔۔دو بہنوں کے برابر حصہ پائے گا۔

شوہر۔۔کا حصہ دو بیویوں کے برابر ہوگا۔

فقط ماں باپ کا حصہ الگ ہے یعنی اگر مرنے والا/ والی اولاد چھوڑ کر جائے اور اس کے ماں باپ بھی زندہ ہوں تو والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ میت کے مال سے ملے گا۔

اس کا سبب وعلت کہ اسلام نے ''سہم وراثت عورت'' کو مرد کے سہم میراث سے آدھا رکھا، خاص حالات سامنے رکھنا ہوں گے۔ جیسے عورت مہر، نفقہ، فوجی خدمت اور قانون سزا میں جداگانہ قوانین رکھتی ہے۔ یعنی عورت کی میراث لینے میں خصوصی حیثیت (معلول) مہر ونفقہ وغیرہ کی بنیاد (علت) پر مبنی ہے۔

اسلام۔۔ گزشتہ مقالات میں دلائل دیے جا چکے کہ مہر ونفقہ کو رشتہ ازدواج کے استحکام میں موثر اور کنبے کی آسائش میں ضروری عنصر اور زن وشوہر میں اتحاد کے ذرائع سمجھتا ہے۔۔ اسلام کی نظر میں مہر اور نفقہ علی الخصوص نفقہ کو ختم کر دینا، کنبے کی نیو ہلا دینے اور بیوی کو فحشا ومنکرات کی طرف کھینچنے کا سبب ہے۔ اس طرح عورت کی زندگی کا بجٹ کم ہو جاہے اور مرد پر ایک بوجھ آپڑتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ اس بوجھ کا تدارک میراث سے کر دے۔ لہٰذا، شوہر کو بیوی کا دوگنا حصہ دیا۔ یعنی مہر ونفقہ نے عورت کے ''سہم ارث'' کو کم کر دیا۔

مغرب پرستوں کا اعتراض

کچھ مغرب پرست جب اس موضوع پر دادِ سخن دیتے ہیں اور میراث میں عورت کے حصے کو بنیاد بنا کر اسلام کے خلاف غوغا برپا کرتے ہیں۔ مہر ونفقہ کو سامنے رکھ کر فرماتے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ میراث میں عورت کا حصہ کم رکھ کر، مہر ونفقہ سے اس کا تدراک کریں؟ کیوں سیدھے کام کریں۔ کیوں گردن کے پیچھے سے ہاتھ لا کر لقمہ کھائیں ہمیں پہلے عورت کا حصہ میراث مرد کے برابر کرنا چاہیے تاکہ مہر ونفقہ سے اس

کا تدارک نہ ڈھونڈھنا پڑے۔

اول تو ان ماں سے زیادہ محبت کرنے والی کھلائیوں نے علت کو معلول سمجھ رکھا ہے۔ان کے خیال میں مہر ونفقہ، میراث خواتین کیلئے معلول ہے۔ان کی سمجھ میں نہ نہیں آیا کہ میراث میں عورت کی حالت وحیثیت خاص معلول مہر ونفقہ ہے۔

دوسرے یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہاں جو کچھ ہے وہ مالی واقتصادی پہلو ہے اور بس ظاہر ہے کہ اگر فقط مالی اور اقتصادی پہلو ہی زیر نظر ہوتا تو کوئی دلیل نہیں تھی کہ مہر ونفقہ زیر نظر رہتا یا پھر عورت کا حصہ مرد سے مختلف ہوتا۔جیسا کہ ہم گزشتہ مقالے میں لکھ چکے ہیں اسلام نے بہت سے پہلو سامنے رکھے ہیں۔طبیعی وفطری اور نفسیاتی زاویے ۔ایک طرح ضروریات اور تولید کے پہلو سے اس کی بے اندازہ مشکلات وتکالیف جبکہ مرد اس مشکل سے آزاد ہے۔دوسری طرف تولید اور دولت کمانے میں مرد کی نسبت عورت میں قوت کم ہے ۔تیسری طرف ،وہ مرد سے زیادہ سرمایہ استعمال کرتی ہے۔نیز نفسیاتی اور روحانی کیفیات یعنی مرد وزن کے احساسات جدا جدا ہیں۔ مثلاً مرد ہمیشہ عورت پر روپیہ صرف کرنے کا رجحان رکھتا ہے ۔اور سب سے آخر میں معاشرتی ونفسیاتی دقیق مطالعات جو خاندانی بندھن کو مضبوط بناتے ہیں۔اسلام نے سب باتوں کو ملحوظ رکھ کر مہر ونفقہ کو لازم قرار دیا۔ یہ ضروری ولازمی امور مرد کے اخراجات میں خاص ذمہ داریوں کے بوسائط اسباب ہیں۔اس کے بعد اسلام نے حکم دیا کہ ذمہ داریوں کی تلافی کیلئے مرد کے حصے کو عورت کے حصے سے دگنا رکھا جائے۔تو فقط مالی پہلو ہی نہیں ہے کہ سوال اٹھایا جائے کہ ایک جگہ عورت کا حصہ کم کر کے دوسری جگہ اس کا مداوا کرنے کی ضرورت کیا ہے۔

میراث کے مسئلہ پر زندیقوں کا اعتراض

ہم نے کہا ہے ۔اسلام کی نظر میں مہر ونفقہ علت (سبب) اور عورت کی

میراث میں صورت حال معلول (مُسَبَّبْ اور نتیجہ) ہے۔ یہ بات دور اول میں بھی موضوع بحث رہی ہے کوئی نئی بحث نہیں ہے جو آج سامنے آئی ہو۔

دوسری صدی ہجری میں ایک شخص ابن ابی العوجا گزرا ہے یہ نہ خدا کو مانتا تھا مذہب کا معتقد اس دور کی آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ملحدانہ عقائد کا پروپیگنڈا کرتا تھا۔ ہر جگہ پہنچتا حتیٰ کہ مسجد الحرام اور مسجد النبیؐ میں بھی علما سے بحث کرنے جاتا اور توحید و معاد اور دوسرے اصول اسلام پر جرح قدح کرتا تھا۔ اسلام پر اعتراضات میں اس کا ایک اعتراض یہ تھا:

مابال المراة المسکینة الضعیفة تاخز سهماً ویاخذ الرجل سهمین

غریب و کمزور عورت تو ایک ''سہم'' (حصہ) لیتی ہے اور مرد جو اس سے زیادہ مضبوط ہے وہ دوہرا حصہ کیوں لیتا ہے؟

یہ بات اسلامی عدل کے خلاف ہے!

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: وجہ یہ ہے کہ اسلام نے جنگجو سپاہی کی ڈیوٹی عورت سے اٹھالی ہے اور بعض نادانستہ جرم، جن میں دیت دینا پڑتی ہے عورت کی سزا دوسرے کی شرکت کے ساتھ معاف کر دی ہے لہٰذا ترکے میں عورت کا حصہ مرد سے کم رکھا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے واضح بیان کے بعد معلوم ہو گیا کہ میراث میں عورت کی خاص نوعیت معلول (نتیجہ) ہے مہر و نفقہ کا شوہر پر واجب ہونے اور فوج میں بھرتی ہونے اور دیت دینے سے معافی کا۔

اس قسم کے سوال تمام آئمہ علیہم السلام سے کیے گئے اور ان حضرات نے اسی انداز میں جواب دیے ہیں۔

دسواں حصہ

طلاق

طلاق میں روز افزون اضافہ۔ بیوی صدی کی بیماری۔
آج کی دنیا ایک طرف سماجی طور طلاق کے اسباب پیدا کر رہی ہے ۔دوسری طرف قانون کے زور سے اسے روکنا چاہتی ہے۔
طلاق کے بارے میں پانچ مفروضے۔
شادی کا تقدس کا تقاضہ کیا یہی ہے کہ طلاق کی راہ بند کر دی جائے؟
سماجی مشکلات فقط قانون سے حل نہیں ہو سکتے۔
طلاق، اسلام کی نظر میں سب سے زیادہ نفرت کی چیز ہے۔
کیا یہ صحیح ہے کہ امام حسنؑ طلاق بہت دیا کرتے تھے؟
جہاں اساسی بنیاد جذبہ ہو وہاں قانون کا جبر کچھ نہیں کر سکتا۔
شوہر کی محبت کا شعلہ ٹھنڈا ہو جائے تو کنبے کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور بیوی کی محبت کا شعلہ ٹھنڈا پڑ جائے تو اسے نیم جان کر دیتا ہے۔
اسلام عورت کو زبردستی مرد کے سر تھوپنے کا حامی نہیں ہے۔
یورپ نے فساد و تباہی وانحراف کو بڑھاوا دینے کی خاطر میاں بیوی کو برابر کا حصہ دیا ہے۔
مرد کوہسار ہے، بیوی جوئبار بچے پھول اور کلیاں۔
میاں بیوی میں صلح وصفائی ''مسلح صلح'' جیسی نہیں ہوسکتی۔
اسلام نے طلاق کیلئے کچھ رکاوٹیں رکھیں ہیں۔

قرآن کی نظر میں کنبے کی عدالت

جس قانون نے شادی کو ''باہمی رفاقت'' کا روپ دیا وہی طلاق کی حقیقت ''رہائی'' بھی بنا سکتا ہے۔

طلاق کا حق اور ہے فسخ کا حق اور ہے

طلاق ،فطری حق کے طور پر مرد ہی سے مخصوص ہے لیکن معاہدے کے طور پر عورت بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

عدالتی طلاق۔

طلاق غیر طبیعی عمل تولید کی طرح آپریشن اور عمل جراحی ہے۔

اسلام کے پاس کوئی ایسا قانون نہیں جسے سرطان کہا جائے۔

حق ملکیت کی راہیں بند کرنے کے سلسلے میں اسلام کی تدبیریں اور نمونے۔

اسلامی اصول ''نگہداشت یا بحسن خوبی رہائی''۔

(خلاصہ مطالب از مولفؒ

حق طلاق (۱)

خاندانی شیرازہ بکھرنے کا خطرہ اوراس سے پیدا ہونے والے حالات کبھی اس قدر نظر انداز نہیں کیے گئے جیسے اس دور میں کیے جارہے ہیں اور تاریخ کے کسی عہد میں آج سے زیادہ انسان عملی طور پر اس طرح خطرے سے دوچار نہیں ہوا۔

قانون بنانے والے قانون جاننے والے ماہرین نفسیات ہرایک یہی کوشش کررہا ہے کہ ممکن وسائل سے شادی کی بنیاد استوار و مستحکم تر بنائیں کہ رخنہ نہ پڑنے پائے لیکن (بقول مولانا روم)

از قضا سرکنگبین صفر افزود

اتفاق سے سرکے نے صفرا بڑھا دیا (حالانکہ وہ صفر کا علاج ہے)

اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ طلاق میں سالانہ اضافہ ہورہا ہے اوراکثر خاندانوں پر تباہی کے سایے منڈلا رہے ہیں۔

عام طور سے جب کوئی بیماری خصوصی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے تو ذہنی اور مالی وسائل کے ذریعے اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے اوراس سے مرنے والوں کی تعداد کم ہونے لگتی ہے اور کبھی کبھی وہ بیماری ختم بھی ہوجاتی ہے۔مگر طلاق کی بیماری اس کے برعکس روز افزوں ہے۔

نئی زندگی اور طلاق میں اضافہ

پرانے زمانے میں طلاق اوراس کے برے نتائج اسباب وعلل طلاق اور اس سے بچنے کے بارے میں بہت کم توجہ کی گئی،اس کے باوجود طلاق کی اوسط کم تھی

اورزندگی کے آشیانہ کم اجڑتے تھے۔ طے شدہ بات ہے کہ آجطلاق کے علل واسباب بڑھتے جارہے ہیں سماجی زندگی نے ایسی صورت اختیار کرلی ہے کہ گھریلوزندگی کے رشتے ٹوٹنے کے اسباب زیادہ پیدا ہوگئے ہیں،اورخیرخواہوں اوردانش وروں کی سعی ابھی تک کسی منزل پرنہیں پہنچ سکی اورافسوس ناک بات یہ ہے کہ آئندہ خطرہ زیادہے۔

شمارہ ایک سو پانچ ''زن روز'' میں نیوزویک سے ایک مقالہ کا ترجمہ چھپا تھا۔عنوان ہے''طلاق درامریکا''رسالہ لکھتا ہے:

''ٹیکسی حاصل کرنے میں جو آسانی ہوتی ہے وہی آسانی طلاق حاصل کرنے میں ہے۔اسی مضمون میں ہے۔طلاق کے بارے میں امریکیوں کے یہاں دوکہاوتیں سب سے زیادہ مشہور ہیں:

ا۔مشکل ترین سمجھوتہ بھی جومیاں بیوی میں ہوسکے وہ طلاق سے بہتر ہے۔یہ جملہ۔۔تقریباً چارصدی قبل،سروانٹس نے کہا تھا۔

۲۔دوسرا عشق زیادہ دل پذیر ہوتا ہے۔

بیسویں صدی کے نصف دوم میں''سامی کاہن'' نے یہ جملہ کہا ہے بلکہ محاورے کے خلاف ایک نعرہ لگایا ہے۔

نامبردہ مقالے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری کہاوت نے امریکہ میں اثر کیا ہے۔مقالہ نگار کہتا ہے:

''طلاق کی سراب نے نہ فقط''تازہ بیاہے''

بلکہ ان کی ماؤں اورشوہروں (پرانے بیاہے لوگوں) کوبھی اپنی طرف کھینچ لیا ہے جنگ عظیم دوم کے بعد سے امریکہ میں طلاق کی تعداد اوسطاً......4 طلاق سالانہ سے کم نہیں، چالیس فی صد طلاق دس سالہ شادی یااس سے زیادہ میں اوربیس سالہ شادی میں تیرہ فی صدی کی اوسط طلاق عام ہے دوملین (بیس لاکھ) طلاق یافتہ

عورتوں کا سن پیتالیس سال ہے۔ باسٹھ فی صد طلاق یافتہ عورتوں کے بچوں کی عمر اٹھارہ سال سے کم ہوتی ہے، یہ عورتیں ایک نئی نسل کو جنم دے رہی ہے۔

آگے تحریر ہے:

''باوجودیکہ طلاق کے بعد امریکی عورت اپنے تئیں آزاد سے زیادہ آزاد سمجھتی ہے مگر مطلقہ عورتیں شاد کام نہیں رہتیں چاہے جوان ہوں یا درمیانہ عمر کی عورتیں ہوں اوراس بے چینی کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ نفسیاتی معالجین کے پاس جاتی ہیں یا ہر وقت نشے میں دھت رہنے لگتی ہیں۔ یا ان میں روز افزوں خودکشی کا رجحان نظر آرہا ہے۔

چار مطلقہ عورتوں میں ایک ''ہپی'' اور تین خودکشی کرلیتی ہیں۔ عورتوں میں خودکشی کی تعدا باشوہر عورتوں سے تین گنا زائد ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ امریکی عورت جب طلاق لے کر عدالت سے پلٹتی ہے۔ پھر سمجھتی ہے کہ طلاق کے بعد زندگی جیسی سوچی ہے ویسی جنت تو نہ ہوگی......قوانین فطرت کے بعد دنیا میں شادی مضبوط ترین انسانی رشتہ ہے۔۔ جس دنیا کا یہ عقیدہ ہو وہاں اس عورت کے بارے میں کیا رائے دی جائے گی جس نے یہ رشتہ توڑا ہو؟ ممکن ہے معاشرے میں ایسی عورت قابل احترام ہو، پوجی بھی جائے لوگ رشک بھی کریں لیکن اس آدمی کو تو ایک نظر نہ بھائے گی جب وہ اس عورت کو دوسرے شخص کی زندگی میں خوشی کی لہر دوڑاتے دیکھے............

یہ مقالہ ضمنی طور پر طلاق کے اسباب پر روشنی ڈالتا اور فراوانی طلاق کے بارے میں سوالات اٹھاتا ہے۔ فراوانی طلاق کا سبب میاں بیوی میں اخلاقی اختلاف ہے یا کوئی اور بات؟

جواب دیتا ہے:

اگر اخلاقی ناسازگاری کو جدائی کا سبب مان لیں تو نوجوان جوڑے کیلئے

تو ایک بات ہوسکتی ہے مگر پرانے رشتوں کے بارے میں کیا وجہ بتائی جائے گی؟ امریکی قوانین نے طلاق لینے والی عورتوں کو جو رعایت دی ہے اور اس کے پیش نظر جواب یہ ہے کہ:

دس یا بیس برس کی شادی کے بعد طلاق کا سب ناچاقی یا طبیعتوں کا اختلاف نہیں بلکہ برسوں کی پریشانیوں کو برداشت نہ کرنے کا رجحان اورنئی لذتوں کی ہوس اور دوسری کامرانیوں کی آرزو ہے۔ مانع حمل گولیوں اور جنسی انقلاب نیز عورتوں کی بڑھتی قدرومنزلت نے خواتین میں یہ رجحان عام کردیا ہے کہ خاندانی بندھنوں سے آزادی میں لذت اورخوشی زیادہ ہے ایک بیوی اپنے شوہر کے ساتھ رہی ہے زندگی ایک ساتھ گزارتی ہے بچے پیدا ہوتے ہیں ۔خوشی غمی میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں۔ اچانک بیوی کو طلاق کی فکر پیدا ہوگئی ،شوہر میں ظاہری اور اقتصادی تبدیلی بھی نہیں مگر بیوی الگ ہونا چاہتی ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ کل تک تھکا دینے والی زندگی برداشت کررہی تھی مگر اب وہ ایک طرز کی زندگی نہیں چاہتی ......آج کی امریکی عورت کل کی عورت سے زیادہ موقع پرست ہے اور اپنی دادی کے مقابلے میں برداشت نہ رکھنے والی عورت ہے۔

ایران میں طلاق

طلاق میں فراوانی امریکہ ہی میں نہیں یہ اس صدی کی وبا ہے جہاں بھی یورپ کے رسم ورواج عام ہوں گے وہاں طلاق کے شماریات میں اضافہ ہوگا۔ مثلاً ہم اپنے ایران ہی کو دیکھیں شہروں میں طلاقوں کی تعداد دیہاتوں سے زیادہ ہے اورتہران جہاں مغرب کے آداب وانداز زیادہ اثر کرچکے ہیں۔ دوسرے شہروں سے آگے ہے۔

روزنامہ اطلاعات شمارہ 11512 میں ایران کے نکاح وطلاق کے شماریات چھپے تھے جس میں تھا:

''رجسٹرڈ طلاقوں میں چوتھے سے زیادہ حصہ صرف تہران کا ہے۔یعنی ستائیس فی صد طلاق تہران میں واقع ہوئے ہیں۔حالانکہ ملک کی آبادی کے لحاظ سے تہران کی آبادی دس فیصد کا تناسب رکھتی ہے مجموعی طور پر تہران میں سونکاح اورسوطلاق ہوتے ہیں۔تہران میں شادیوں کی تعداد پورے ملک کی نسبت سے پندرہ فی صد ہے۔

امریکہ میں طلاق کی افزائش کی ہوا

اچھا اسے چھوڑیے امریکہ میں طلاق کی بات آ گئی تو سنیئے: ''نیوز ویک'' سے نقل کیا گیا ہے کہ امریکی عورت موقع پرستی اور لذت کو کنبے کی مرکزیت ونگہداشت واستحکام پر ترجیح دیتی ہے ایک قدم آگے بڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ امریکی عورت ایسی کیوں بن گئی؟ طے ہے کہ یہ امریکی عورت کی سرشت نہیں ہے۔اس رویے کی علت ووجہ معاشرہ ہے امریکی معاشرے نے امریکی عورت کو یہ احساس ورویہ دیا ہے۔ہمارے مغرب پرست چاہتے ہیں کہ ایرانی خواتین کو بھی اسی راہ پر ڈال دیں جس پر امریکی عورتیں چل رہی ہیں۔اگر ان لوگوں کی یہ آرزو پوری ہوگئی تو مسلم ہے کہ ایرانی عورت اور خاندانی مرکزیت کا مقدر وہی بن جائے گا جو امریکی عورت اور امریکی خاندان کی قسمت ہے۔

ہفت روزہ ''بامشاد'' شمارہ 6 (4 / 5 / 44) 1965ء میں شائع ہوا تھا:

''دیکھیے بات کہاں تک پہنچی، کہ فرانسیسی قوم کی آو (ذ بھی اٹھی کہ امریکیوں نے نئی شورش برپا کی ہے۔'' روزنامہ فرانس سوار کا مقالہ ہے کہ دوسو سے زیادہ

ریسٹورنٹ اور کیبر ے کالیفورنیا میں ایسے کھلے ہیں جہاں پیش خدمت لڑکیاں کھلے سینوں کے ساتھ کام کرتی ہیں۔

اسی مضمون میں تحریر ہے کہ ''مونوکینی'' مایوئی جو عورتوں کے سینہ بند کھلواتے ہیں یہ صاحب سان فرانسسکواور لاس انجلیس میں لباس کے ماہر مانے گئے ہیں۔

نیو یارک میں متعدد ایسے سینماؤں کی نشان دہی کی گئی ہے جہاں کی فلمیں فقط جنسی عمل اور جنسی مسائل اور عریاں تصویریں دکھاتی ہیں۔ان فلموں کے چند نام یہ ہیں۔

''وہ شوہر جو اپنی بیویوں کا باہمی تبادلہ کرتے ہیں۔''

''وہ لڑکیاں جو اخلاق کے خلاف ہیں۔''

''جو کچھ نہیں پہنتیں۔''

ویٹرین کی لائبریری میں شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جس کی پشت پر برہنہ عورت کی تصویر نہ ہو، کلاسیکی اور ادب عالی کے تصانیف بھی اس سے خالی نہیں۔اس قسم کی کتابیں بکثرت موجود ہیں:

''امریکی شوہروں کی جنسی حالت''

مغربی مردوں کی جنسی حالت۔''

بیس سال سے کم عمر جوانوں کی جنسی حالت''

''نئی اطلاع کی روشنی میں نئے جنسی رویے۔''

فرانس سوار کا مضمون نگار تعجب و پریشانی کے عالم میں خود اپنے آپ سے سوال کرتا ہے۔امریکہ کہاں جانا چاہتا ہے؟

بامشاد لکھتا ہے:

''ٹھیک ہے جہاں تک جانا چاہتا ہے جائے ......ہمارا دل تو اپنے ان مٹھی

پھر ہم وطنوں کے بارے میں جلتا ہے جن کے خیال میں انہوں نے ایک مناسب ماڈل اختیار کرلیا ہے اور اس سلسلے میں انہیں اپنے سراپا کا ہوش نہیں رہا ہے۔‘‘

معلوم یہ ہوا کہ اگر امریکی عورت دیوانی ہوگئی اور کام نکالنے اور ہرجائی بننے کو ایک کی ہو رہنے اور وفاداری پر ترجیح دیتی ہے تو قصور اس کا نہیں، اس کے معاشرے نے خاندان کے مقدس مرکز پر کدال مارکر اسے نقصان پہنچایا ہے۔

تعجب تو اس صدی کے بدنصیبوں پر ہے، روز بروز طلاق اور خاندانی شیرازہ منتشر کرنے کے معاشرتی وسائل میں اضافہ کررہے ہیں۔ ایک دوسرے سے دوڑ میں آگے جارہے ہیں اس کے بعد غل ہے کہ طلاق کی تعداد کیوں بڑھ رہی ہے؟ یہ لوگ اسباب وعوامل طلاق کو روز افزوں کرتے جارہے ہیں اور یہ شور بھی مچارہے ہیں کہ قانون کی جکڑ بند کرکے اسے روکا جائے اسی کو کہتے ہیں ’’کج دار ومریز‘‘

مفروضے

ہم اصل مقصد پر بحث شروع کرتے ہیں۔ پہلے عقلی طور پر دیکھیں کہ طلاق اچھی چیز ہے یا نہیں؟ کیا طلاق کی راہ مکمل طور پر کھلی رہنا چاہیے؟ کہ خاندانوں کے شیرازاوں کا لگاتار بکھرتے رہنا اچھا ہے؟ اگر طلاق اچھی چیز ہے تو پھر جو اسباب وعلل طلاق میں اضافہ کا باعث ہیں انہیں باقی رہنا چاہئے ان میں کیا برائی ہے۔ یا طلاق کا سلسلہ بالکل بند کرنا چاہئے اور شادی کا رشتہ ابدی بنادیا جائے اور جو چیز بھی اس مقدس بندھن کو ڈھیلا کرے اسے روکنا ضروری ہے۔ یا پھر کوئی تیسرا حل تلاش کیا جائے۔ قانون کو کلیتاً میاں بیوی کیلئے یہ راستہ بند نہ کرنا چاہئے کیونکہ کبھی کبھی طلاق لازم وضروری ہوجاتی ہے۔ مگر قانون کی رکاوٹ نہ ہونے کے باوجود معاشرہ کو ایسی تدبیریں کرنا ہوں گی جن کی وجہ سے میاں بیویوں میں جدائی نہ ہونے پائے

۔معاشرے کو ان اسباب وعلل کا سخت مقابلہ کرنا چاہئے جن کے نتیجے میں میاں بیوی میں علیحدگی اور بچوں کی بے گھری عمل میں آتی ہے۔ یہ تو صاف سی بات ہے کہ اگر سماجی ایسے اسباب پیدا کرتا رہے جن سے طلاق وجود میں آئے تو قانون کوئی کام اور کوئی اثر نہیں کرسکتا۔

اگر یہ فیصلہ ہوجائے کہ قانون طلاق پر پابندی نہ لگائی جائے تو کیا صورت ہو کہ آزادی برقرار رہے۔یعنی کیا یہ آزادی فقط مرد کو حاصل رہے۔ یا تنہا عورت کو دونوں کو حق طلاق حاصل ہو؟ پھر اگر دونوں کو حق حاصل ہو تو کیا جو تدبیر اور جو انداز طلاق دونوں اختیار کرسکیں وہ ایک جیسا ہو؟ نکاح کے بندھن سے رہائی کا طریقہ ایک ہی قسم کا ہو؟ یا اچھی بات تو یہ ہے کہ میاں بیوی ،دونوں کی جدائی کیلئے الگ الگ دو دروازے رکھے جائیں؟

طلاق کیلئے پانچ مفروضے بنائے جاسکتے ہیں:

طلاق معمولی چیز ہے ، طلاق کی تمام قانونی اور اخلاقی رکاوٹوں کا خاتمہ کیا جائے۔

جو لوگ کام چلانے اور مزے چکھنے کیلئے شادی کے قائل ہیں معاشرے میں کنبہ کا احترام و تقدس نہیں مانتے ،اس کے مقابلے میں ان کی سوچ یہ رہتی ہے کہ شادی کا رشتہ جتنی جلدی ہوسکے ٹوٹے اور نیا رشتہ جڑے ۔نئے میاں بیوی بنیں اور نئے مزے لوٹیں وہ تو اسی مفروضہ کو پسند کریں گے ۔جو کہتے ہیں --''دوسرا ہمیشہ زیادہ مزیدار ہوتا ہے۔'' وہ اسی مفروضے کو حمایت کریں گے۔اس مفروضے میں خاندان کی بنیادی اہمیت بھی نظر انداز کی گئی ہے اور کسی ایک رشتے کے دوام سے پیدا ہونے والی مسرت وخلوص ،محبت خوش نصیبی کو بھی فراموش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مفروضہ کمزور اور جلد ختم ہوجانے والا مفروضہ ہے۔

۲۔دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ نکاح ایک مقدس عہد ہے۔نکاح نام ہے دل وجان کی وحدت کا وہ دائمی عہدو پیمان کی حیثیت کا حامل ہے۔اسے محفوظ و باقی رہنا چاہئے لفظ طلاق انسانی معاشرے کی کتاب لغت سے نکال دینا چاہیے۔میاں بیوی شادی کرتے وقت سمجھ لیں اب موت کے علاوہ کوئی چیز دونوں کو جدائی نہیں ڈال سکتی۔

کیتھولک چرچ صدیوں سے اسی کا حامی ہےاور کسی قیمت پراس مفروضے یاعقیدے سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔اس نظریے کے پرستار پوری دنیامیں روبہ زوال ہیں اور آج کل صرف اطالیااور کیتھولک اسپانیامیں یہ قانون نافذ ہے مگراطالیہ والے اس قانون کے خلاف آواز اٹھاتے اورتحریکیں چلاتے رہتے ہیں کہ یہ قانون ختم ہواور طلاق کو قانونی حیثیت مل جائے۔اب وہ اس تکلیف دہ صورت حال کو مزید برداشت کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

تیسرے پہر کی اشاعت ڈیلی اکسپرس میں ایک مضمون چھپا تھا:

’’ازدواج درایتالیایعنی بندگی زن‘‘

یہ (فارسی ترجمہ) میں نے پڑھا تھا مضمون میں درج تھا۔موجودہ صورت حال میں طلاق نہ ہونے کی وجہ سے اطالیہ میں عملی طور پر بہت سے لوگ خلاف قانون جنسی عمل کرتے ہیں۔اس مقالے کی تحریر کی بنیاد پر۔۔موجودصورت یہ ہے کہ پانچ ملین اطالوی سمجھتے ہیں کہ ان کی زندگی سوائے گناہ اور ناجائز تعلقات کے اور کچھ نہیں۔

اسی روزنامے (ڈیلی اکسپرس) تیسرے پہر کے ایڈیشن میں اخبار بیگاروسے نقل کیا ہے کہ اطالیہ کے عوام میں ممنوعیت طلاق سے بڑی مشکلیں پیدا ہوگئی ہیں۔بہت سے لوگ اس قانون سے تنگ آکر وطن چھوڑ چکے ہیں آخری دنوں میں ملک کی خواتین سے پوچھا گیا تھا۔کیا طلاق کے قانون کا اجرا خلاف اصول مذہب

ہے؟ ستانوے فیصد عورت نے جواب نفی میں دیا تھا۔

چرچ اپنے عقیدے پر سختی سے قائم ہے۔اور نکاح کے تقدس اوراس کی مضبوطی پر زور دیتا اور دلیلیں پیش کرتا ہے۔شادی کا تقدس اور رشتے کا استحکام بجائے خود اچھی بات اور قابل قبول چیز ہے۔بشرطیکہ میاں بیوی یہ بندھن عملی طور پر باقی رہ سکے حقیقتاً، کچھ ایسے مواقع بھی پیش آتے ہیں جہاں میاں بیوی میں ہم آہنگی ممکن نہیں ہوتی اس وقت قانون کے زور سے انہیں نہیں چپکا یا جا سکتا۔اسے میاں بیوی کا رشتہ نہیں کہا جا سکتا۔کلیسا کے نظریے کی شکست یقینی ہے وہ دن دور نہیں کہ چرچ مجبوراً اپنے عقیدے پر نظر ثانی کرے اس لئے ہمیں چرچ اوراس کے موجودہ عقیدے پر اس سے زیادہ گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۳۔تیسرا مفروضہ ہے۔۔نکاح۔۔مرد کی طرف سے فسخ ہوسکتا ہے، بندھن کھل سکتا ہے۔عورت اسے نہیں توڑ سکتی۔ پرانی دنیا میں یہی نظریہ تھا مگر آج مجھے گمان نہیں کہ لوگ اس کی حمایت کرتے ہوں۔میرے نزدیک اس پر زیادہ بحث ونظر کی ضرورت نہیں ہے۔

۴۔ چوتھا مفروضہ یہ کہ۔ نکاح مقدس چیز ہے اور خاندانی مرکزت قابل احترام ہے لیکن طلاق کے دروازے شرائط اور پابندیوں کے ساتھ میاں بیوی دونوں کیلئے کھلے رہنا چاہیے اور دونوں کواس بندگلی کے دو دروازوں سے ایک ہی انداز میں نکلنے کی اجازت ہونا چاہیے۔

میاں بیوی اور عورت ومرد کے حقوق میں مشابہت کے حامی۔جس کی تعبیر غلطی سے مساوات حقوق سے کرتے ہیں۔اسی نقطہ نظر کے طرف در ہیں۔ان لوگوں کے نزدیک جو پابندیاں جوشرائط عورت پر لاگو ہوں وہی مرد پر بھی عائد ہوں ،اور جو تدبیر مردوں کے رشتے توڑنے کے کام آئے وہی حل عورتوں کیلئے کارآمد ہو۔

اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ظلم اور درجہ بندی ہے اور ناروا ہے۔

۵۔ پانچواں مفروضہ ہے۔شادی مقدس عمل ہے۔خاندانی مرکزیت محترم ہے اور طلاق قابل نفرت اور ناپسندیدہ ہے (مبغوض ہے) معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ ایسے اسباب وعلل کا قلع قمع کرے جن کی وجہ سے طلاق واقع ہوتے ہیں قانون کا ناکام شادیوں کیلئے الجھن نہ بننا چاہیے۔ایسے بندھنوں سے آزادی کیلئے مرد کا رستہ بھی کھلا ہونا چاہیے اور بیوی کے لئے بھی کوئی حق ہونا ضروری ہے۔

ناکام بندھن سے آزاد ہونے کیلئے مرد کو جو راستہ بتایا گیا ہے۔وہ اور ہے عورت کو جو راہ دی گئی ہے وہ اس سے ہٹ کر ہے۔اور یہ مسئلہ بھی وہ ہے جہاں زن ومرد کے حقوق تو ہیں مگر ایک جیسے نہیں ہیں۔

یہ نظریہ اسلام ہی نے ایجاد کیا ہے اور اسلامی ملکوں میں ناقص (غیر کامل) طور پر رائج ہے اور اسی کی پیروی کی جاتی ہے۔

طلاق ایک بین الاقوامی مسئلہ (۲)

ہمارے زمانے میں طلاق ایک بین الاقوامی مسئلہ بن چکا ہے، ہر شخص فریادی ہے سب کو شکایت ہے جن لوگوں کے قانون میں طلاق بالکل ممنوع ہے وہ پریشاں ہیں کہ شادی نبھنے والی نہیں مزاج ملتے نہیں، طلاق نہیں دے سکتے۔جن کے یہاں قانون برعکس ہے طلاق کی راہ میاں بیوی دونوں کیلئے برابر کشادہ ہے وہ کثرت طلاق اورخاندانوں کے درہم برہم ہونے اور ناپسندید نتائج کے ہاتھوں چیخ رہے ہیں جن لوگوں نے فقط مردوں کوحق طلاق دے رکھا ہے وہ دوزاویوں سے شکوہ کرتے ہیں:

ا۔غیر شریفانہ طلاق، کچھ لوگ کئی برس کے بندھن اوراچھے تعلقات کے بعد اچانک نئی دلھن لانے کی ہوس دل میں محسوس کرتے اوراس بیوی کو چھوڑنے پر کمر کستے ہیں جس نے اپنی عمر، جوانی قوت اورصحت اس کے گھر میں لٹادی اسے تصور بھی نہ تھا کہ اس کا نرم وگرم آشیانہ اس سے چھین لیا جائے گا، وہ ایک طلاق نامہ حاصل کرتے ہی خالی ہاتھ اپنے آشیانے سے نکال دی جائے گی۔

۲۔بعض شوہروں کا شریفانہ انداز سے طلاق نہ دینا اوران عورتوں کو پیچھا نہ چھوڑنا جن سے ان کا نباہ ہرگز ممکن نہیں۔

اکثر ایسے اتفاقات ہوتے ہیں کہ میاں بیوی میں خاص وجوہ سے اختلافات بڑھتے بڑھتے، ناقابل اصلاح ہوجاتے ہیں۔صلح وصفائی کی سعی بے نتیجہ ہوجاتی ہے، زن وشوہر میں نفرت کی خلیج حائل ہوجاتی ہے۔ دونوں عملی طور پر ایک دوسرے کو چھوڑ بیٹھتے ہیں، دونوں الگ الگ زندگی گزارنے پرراضی ہوجاتے ہیں۔

ایسی صورت حال میں ہر عقل مند کے نزدیک اس مشکل کا حل یہ ہوتا ہے کہ رشتے کوتوڑ دیا جائے اور دونوں اپنا اپنا نیا شریک زندگی تلاش کرلیں۔مگر بعض شوہر حریف کوسزا دینے کی خاطر ہمیشہ کیلئے ازدواجی زندگی سے محروم کردیتے اور طلاق نہیں دیتے اور بدنصیب بیوی کو بے سہارا زندگی گزارنے پر مجبور کرتے ہیں ۔قرآن مجید کی تعبیر ہے''كَالْمُعَلَّقَة''معلق زندگی۔

یہ لوگ مسلمان اور اسلام کا صرف نام ہی جانتے ہیں اور اسلام ہی کا نام لے کرمن مانے کام کرتے ہیں لہٰذا جو حضرات اسلامی تعلیمات کی وسعتوں سے ناواقف ہیں ان کے دل کی گہرائیوں میں یہ شبہ بیٹھ گیا کہ کیا اسلامی طلاق کو اسی طریقے پر باقی رکھنا چاہتا ہے؟

یہ لوگ اعتراض آمیز لہجے میں کہتے ہیں : کیا واقعاً اسلام نے مردوں کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ کبھی طلاق دے کر اور کبھی طلاق نہ دے کر اپنی بیویوں کوسزادیں اور ذہنی طور پر مطمئن بھی رہیں کہ انہوں نے اپنے شرعی حق سے فائدہ اٹھایا ہے۔

لوگ کہتے ہیں: یہ ظالمانہ کام نہیں ہے؟ اگر یہ بات ظلم نہیں تو پھر ظلم کسے کہتے ہیں؟ آپ تو اسلام کو ہر قسم کے ظلم کا سخت مخالف بتاتے ہیں آپ کہتے ہیں اسلامی قوانین عدل وحق کی بنیاد پر قائم ہیں؟ اور اگر یہ کام ظلم ہے اور اسلامی قوانین بھی عدالت وحق کی بنیاد پر قائم ہیں تو ذرا ہمیں بھی بتائے کہ ان مظالم کیلئے اسلام نے کیا انتظام کیا ہے؟

ان افعال کے ظلم ہونے میں کوئی بحث کی کوئی گنجائش نہیں ، ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ اسلام نے ان مسائل کوتشنہ نہیں چھوڑا ہے اسلام نے اس بارے میں کچھ تدابیر بتائی ہیں ۔مگر ایک بات جسے بھولنا مناسب نہیں ہے وہ اس قسم کے ظلم وستم کی

راہ بند کرنے کی بات ہے۔کیا ظلم کی اس صورت حال کا سبب فقط قانون طلاق ہے اوراس قانون کو بدل دینے سے یہ ظلم ختم ہوجائے گا؟ یا ظلم کی جڑیں کہیں اور ہیں ان مقامات کی جستجو کرنا ہوگی کیونکہ یہ ایسے مقامات ہیں جہاں قانون کوئی اثر نہیں کرسکتا۔

معاشرتی مسائل کا حل تلاش کرنے میں اسلام اوردوسرے نظریات میں فرق ہے بعض نظریات مشکلات کا حل قانون کو بتاتے ہیں۔اسلام کی نظر اس نکتے پر ہے کہ قانون فقط خشک اور باہمی تعلقات میں ہمواری تک توانسان پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔مگر جب جذبات کا مسئلہ آجائے تو پھر قانون سے کام نہیں چلتا ۔وہاں دوسری اسباب وعلل اوردوسرے تدابیر سے بھی فائدہ اٹھانا چاہئے۔

ہم ثابت کریں گے کہ ان مسائل میں اسلام نے قانون سے جہاں تک فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا فائدہ اٹھایا ہے اوراس بارے میں کوئی کسر نہیں اٹھارکھی۔

غیرشریفانہ طلاق

سب سے پہلے ہم آج کی اپنی پہلی مشکل۔یعنی غیرشریفانہ طلاق پر گفتگو کرتے ہیں:

اسلام طلاق کا سخت مخالف ہے اسلام تا بحد امکان طلاق سے روکتا ہے اسلام نے جدائی کی بالکل آخری تجویز طلاق قراردی ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ ہی باقی نہ تھا۔اسلام نے لگاتار بیویاں بنانے اور طلاق دینے والے۔۔مطلاق۔۔ کودشمن خدا کا نام دیا ہے۔

الکافی [1] میں ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک شخص کے پاس پہنچے اوراس سے دریافت کیا:

---

[1] الکافی ج6 ص54،طبع تہران،جدید

اپنی بیوی کا کیا کیا؟

بولا: طلاق دے دی!

فرمایا: کوئی برا کام اس نے کیا تھا؟

جواب: جی نہیں کوئی نہیں برائی تونہیں دیکھی تھی!

قصہ ختم ہوگیا اس نے دوسری مرتبہ شادی کرلی، رسول اللہؐ نے دریافت فرمایا: دوسری بیوی لے آئے؟

اس نے کہا: جی ہاں!

کچھ دن بعد پھر ملاقات ہوئی تو آنحضرتؐ نے پوچھا:

اس نئی بیوی کے ساتھ کیا کیا؟

اس نے جواب دیا: طلاق دے دی۔

آنحضرتؐ نے پوچھا: اس نے کوئی برائی کی تھی!

۔۔جی نہیں، کوئی برائی تونہیں دیکھی!

یہ بات بھی گئی گزری ہوگئی اور اس نے تیسری شادی کی، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ۔۔شادی کرلی؟

اس نے کہا۔۔جی ہاں، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ دنوں بعد حضرتؐ نے اسے دیکھ کر پھر وہی پوچھا:

اس بیوی کے ساتھ سلوک کیا؟

اسے بھی طلاق دے دی!

کوئی برائی نظر آئی تھی، اس میں؟

جی نہیں، برائی تو کوئی نہیں تھی!

رسول اکرم نے فرمایا: اللہ اس مرد کو دشمن رکھتا اور اس شخص پر لعنت کرتا ہے

جس کی آرزو بیویاں بدلنا ہو اور اس عورت پر جس کا دل چاہتا ہو کہ شوہر بدلتی رہے۔

رسول اللہ ﷺ سے کسی نے کہا ابوایوب انصاری ؓ اپنی بیوی ام ایوب کو طلاق دینے والے ہیں۔۔ آنحضرت ؐ ام ایوب کو جانتے تھے اور جانتے تھے کہ ابوایوب کا اقدام طلاق کسی صحیح دلیل کی وجہ سے نہیں ہے۔لہٰذا فرمایا:

ان طلاق ام ایوب لحوب

طلاق ام ایوب، بڑا گناہ ہے۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جبرئیل نے خواتین کے بارے میں اتنی مرتبہ تاکید کی جس سے مجھے گمان ہوا کہ جب تک بیوی فحش کام کا ارتکاب نہ کرے اس وقت تک طلاق مناسب نہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں فرمایا: آنحضرت ؐ کا ارشاد ہے:

اللہ کے حضور اس گھر سے زیادہ کوئی محبوب گھر نہیں جہاں شادی کا رشتہ قائم ہوا۔اور اس گھر سے زیادہ مبغوض کوئی گھر نہیں جس میں طلاق کے ذریعے رشتہ توڑا جائے ،امام جعفر صادق علیہ السلام نے مزید فرمایا: قرآن مجید میں طلاق کا ذکر بار بار آیا اور طلاق کے جزئیات پر قرآن نے خاص توجہ کی ہے۔اسی کی بنا پر اللہ ،جدائی سے دشمنی رکھتا ہے۔

طبرسی نے مکارالاخلاق میں، رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت ؐ نے فرمایا:

''نکاح کرو، مگر طلاق نہ دینا، طلاق سے عرش خدا کانپ جاتا ہے۔''

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: حضور الٰہی میں طلاق سے زیادہ مبغوض

وقابل نفرت کوئی چیز نہیں ہے۔ اللہ زیادہ طلاق دینے والے سے دشمنی (نفرت)۔

شیعہ روایات کی خصوصیت نہیں حضرات اہل سنت نے بھی اس طرح کی روایتیں لکھی ہیں۔ سنن [1] ابوداؤد میں ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ما احل اللہ شیئًا ابعض الیہ من الطلاق

اللہ نے کوئی ایسی چیز حلال نہیں کی جو اسے طلاق سے زیادہ ناپسند ہو۔

مولانا روم نے مشہور داستان ''موسیٰ اور چرواہے'' میں اسی حدیث نبوی کی طرف اشارہ کیا ہے:

تا توانی پا منہ اندر طلاق
بعض الاشیاء عندی الطلاق

رہنمایان مذہب کی سیرت میں یہی دیکھا ہے کہ امکان بھر طلاق سے بچتے رہتے ہیں اور ان کے یہاں طلاق بہت کم واقع ہوئی ہے اور جب ایسا ہوا ہے تو کسی منطقی اور عقلی بنیاد پر ہوا ہے مثلاً

امام محمد باقر علیہ السلام نے ایک عورت سے شادی کی اور کچھ دنوں بعد طلاق دی ۔لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا: وہ علیؑ کی دشمن تھی، میں آتش جہنم کا ٹکڑا اپنے پہلو میں نہ رکھ سکا۔ یعنی عورت حضرت علی علیہ السلام کی دشمن ہو اور امام اس سے تعلقات باقی رکھیں غیر منطقی بات ہے لہٰذا طلاق ضروری تھی۔

---

[1] دیکھئے سنن ابی داؤد۔ تفریع ابواب الطلاق۔ حدیث 2177 اور حدیث 2178 ابغض الحلال الی اللہ تعالی الطلاق۔ ج2 ص 254

امام حسنؑ کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈا (کردار کشی کی مہم)

اس موقع پر اس بے بنیاد پروپیگنڈے کی بات بھی ضروری ہے جسے بنی عباس کے مجرمانہ ہاتھوں نے جنم دیا اور اسے پھیلایا۔

عوام میں مشہور اور کتابوں میں لکھا گیا کہ فرزند بزرگوار حیدر کرار حضرت حسن مجتبیٰ بہت شادیاں کرتے اور بہت طلاق دیتے تھے۔ اس پروپیگنڈے کی تاریخ امام حسن علیہ السلام کے سو برس بعد شروع ہوتی ہے۔ یہ خبر ہر جگہ پھیلائی گئی اس لئے غیروں کے ساتھ اپنوں نے بھی بے تحقیق سنی سنائی لکھتے وقت یہ حقیقت بھول گئے کہ طلاق ایک مبغوض اور برا کام ہے یہ عیش پرست و غافل افراد کا عمل ہے۔ اس شخص سے یہ بعید ہے جس کے کردار و اعمال میں سے ایک عمل پیدل حج کرنا تھا جس نے بیس مرتبہ سے زیادہ اپنا مال و متاع فقرا میں تقسیم کیا آدھا مال خود اٹھالیا آدھا غریب کو دیدیا۔ بھلا اس مقام بلند اور اتنی عظیم امت و عصمت کی حامل شخصیت سے اسی باتوں کا کیا ربط۔

سب کو معلوم ہے کہ بنی امیہ سے بنی عباس تک انتقال اقتدار کے وقت سے اولاد امام حسنؑ بنی عباس سے ہم آہنگ تھی۔ لیکن اولاد امام حسینؑ جن کے سردار حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام تھے۔ خاموش رہے اور انہوں نے بنی عباس کا ساتھ نہ دیا۔ بنی عباس نے سیاسی مجبوری سے شروع شروع میں تو بنی حسنؑ سے عاجزانہ سلوک رکھا اور انہیں اپنے سے زیادہ موزوں و بہتر ظاہر کیا۔ لیکن آخر میں بے وفائی دکھائی اور بہت سے سادات حسنی کو قید و قتل کے ذریعے سامنے سے ہٹا دیا۔

بنی عباس نے اپنے سیاسی منصوبے کو آگے بڑھانے کی خاطر اولاد امام حسنؑ کے خلاف پروپیگنڈا اور کردار کشی کہ مہم چلائی۔ من جملہ اور باتوں کے ایک یہ کہانی گڑھی کہ بنی حسنؑ کے جداعلیٰ اور رسول اللہؐ کے چچا ابوطالب مسلمان نہ تھے بلکہ کافر۔۔نعوذ باللہ۔۔لیکن آنحضرتؐ کے دوسرے چچا اور ہمارے جداعلیٰ ''عباس'' مسلمان ہوئے اور مسلمان مرے لہٰذا ہم کہ آنحضرت کے مسلمان چچا کی اولاد سے ہیں۔ان بنی حسنؑ سے بہتر ہیں کہ وہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غیر مسلم......کی اولاد سے ہیں۔ہم خلافت کے واسطے زیادہ موزوں ہیں۔بنی عباس نے اس کام کیلئے دولت استعمال کی ، قصے گڑھے جس کی بنیاد پر آج بھی حضرات اہل سنت میں کچھ لوگ کفر ابوطالب کا فتویٰ دیتے ہیں۔اگرچہ آخری دنوں کچھ اہل سنت کے محققین نے چھان بین کرکے تاریخ کے افق روشن کیے ہیں۔

حسنی خاندان کے خلاف بنی عباس نے دوسرا موضوع چھیڑا اور کہنے لگے اس خاندان کے جداعلیٰ اپنے والد حضرت علیؑ کے بعد تخت وتاج کے مالک ہوئے تو اپنے شوق (معاذاللہ) کی وجہ سے شادی وطلاق میں الجھ گئے اور معاویہ سے جنگ کے بجائے صلح کرلی............

خوشی کی بات ہے عصر اخیر کے چند محققین نے اس مسئلے کی چھان بین کی اور دروغ بے فروغ کی بنیاد معلوم کرلی۔گمان غالب یہ ہے کہ منصور دوانیقی کے معین کردہ قاضی نے یہ افواہ اڑانے میں پہل کی۔بقول ایک مورخ کے۔اگر امام حسنؑ نے اتنی شادیاں کی تھیں تو اس کی اولاد کی تعداد اتنی کم کیوں ہے؟ امام میں کوئی کمی نہ تھی اور مانع حمل گولیوں یا اسقاط کا وہ عمل بھی اس زمانے میں رائج نہ تھا جو آج کل ہے۔

مجھے اس سادہ دل شیعہ مذہب کے راویوں پر تعجب ہے۔یہ لوگ خود ہی روایتیں نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار نے زیادہ طلاق دینے

والے کو خدا کے نزدیک مبغوض یا ملعون بتایا ہے اور اس کے بعد ہی یہ لکھ دیا کہ امام حسنؑ طلاق بہت دیا کرتے تھے۔

ان لوگوں نے یہ نہ سوچا کہ تین ہی صورتیں ہیں انہیں میں سے ایک صورت اختیار کرنا ہوگی۔ یا یہ کہیں کہ طلاق میں کوئی عیب نہیں ہے اور خدا بہت طلاق دینے والے کو دشمن نہیں رکھتا۔ یا یہ مانیں کہ امام حسن علیہ السلام زیادہ طلاق نہ دیتے تھے۔ یا پھر یہ مان لیں کہ امام حسنؑ اسلامی قوانین کے معاذ اللہ پابند نہ تھے۔ یہ حضرات ایک طرف احادیث مبغوضیت طلاق کو صحیح و معتبر جانتے ہیں۔ دوسری طرف مقام مقدس امام حسنؑ کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ اور پھر ایک جہت میں ان کی کثرت طلاق کی بات نقل کرتے اور اس پر نقد و نظر کیے بغیر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

کچھ تو یہاں تک پہنچے کہ بقول ان کے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام اپنے فرزند کے اس عمل سے ناراض تھے اور (معاذ اللہ) منبر پر لوگوں سے کہتے تھے کہ میرے بیٹے حسنؑ سے بیٹی نہ بیاہنا وہ تمہاری لڑکیوں کو طلاق دیتے ہیں مگر لوگوں نے جواب میں کہا، یا علیؑ! ہمیں تو فخر ہوگا کہ ہماری بیٹیاں فرزند پیغمبرؐ کی بیویاں بنیں۔ ان کا دل چاہے وہ رکھیں نہ چاہیں تو طلاق دے دیں۔

ممکن ہے بعض طلاق کے ناپسندیدہ اور قابل نفرت ہونے کا علاج یہ سمجھتے ہوں کہ عورت اور اس کے خاندان کو طلاق پر راضی کر لیا جائے تو نفرت والا پہلو ختم ہو جائے میں خوشی و اعزاز محسوس کرتی ہو وہ کچھ دن کسی ایسے مرد کے ساتھ گزارنا چاہتی ہو جو اس کے اعزاز کا باعث ہو۔ اس صورت میں طلاق میں کیا رکاوٹ رہ جاتی ہے۔

یہ بات نہیں۔ لڑکیوں کے طلاق پر باپ کی رضامندیاں یا خود بیویوں کا اپنی طلاق پر خوشی ہونا۔ طلاق کے مبغوض و قابل نفرت ہونے میں کمی کا باعث نہیں۔ کیونکہ اسلام نکاح میں پائیداری اور خاندان کی مرکزیت میں استواری چاہتا ہے۔

اس کی نظر میں میاں بیوی کا علیحدگی پر رضا مند ہونا موثر نہیں ہے۔

اسلام نے طلاق کو قابل نفرت ومبغوض قرار دیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورت کی خاطر داری ہو اور اسے راضی کیا جائے۔ یوں عورت کی پسند اور خاندان کی آمادگی حاصل کر کے طلاق سے نفرت ختم کی جائے۔

امام حسن علیہ السلام کے بارے میں غلط پروپیگنڈے کی بات ایک تو اس لئے چھیڑی کہ ایک تاریخی شخصیت سے جتنی جلدی ہو سکے ایک تاریخی بہتان کو رد کیا جائے دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر خدا سے غافل کچھ لوگ یہ کام شروع کر دیں اور امام حسنؑ کے بارے میں سنی سنائی بات کو سند و دلیل بنا کر پیش نہ کر دیں۔

خلاصہ۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ طلاق اور میاں بیوی میں جدائی اپنی جگہ پر اسلام کی نظر میں قابل نفرت و بغض ہے۔

اسلام نے طلاق کو حرام کیوں نہ کیا

ایک اہم سوال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اگر طلاق اس حد تک قابل بغض ونفرت ہے کہ طلاق دینے والے شخص کو اللہ دوست نہیں رکھتا، نفرت کے قابل سمجھتا ہے تو پھر اسلام نے طلاق کو سرے سے حرام ہی کیوں نہ کر دیا؟ طلاق کو حرام قرار دینے میں اسلام کیلئے کیا رکاوٹ تھی خاص خاص اور معین صورتوں میں جائز، باقی میں ناجائز کر دیتا؟ بالفاظ دیگر کیا اسلام کیلئے یہ بہتر نہ ہوتا کہ اسلام، طلاق کیلئے کچھ شرطیں لگا دیتا کہ بس ان شرطوں کے بعد ہی طلاق کی اجازت ہے؟ اس کے بعد مجبوراً شوہر کو جانا پڑتا، جب کوئی شوہر اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا تو عدالت کو اپنے عمل کے جواز کی دلیل بناتا، اگر عدالت کی نظر میں دلائل کافی اور اطمینان بخش ہوتے تو طلاق کی اجازت مل جاتی ورنہ نہ ملتی۔

بنیادی طور پر جملہ یہ ہے:

''حلال چیزوں میں مبغوض ترین چیز اللہ کے حضور طلاق ہے۔''

کیا مطلب؟ اگر طلاق حلال ہے تو قابل نفرت نہیں اور اگر قابل نفرت ہے تو حال نہیں۔ قابل نفرت ہونے اور حلال ہونے میں کوئی جوڑ نہیں بیٹھتا۔

ان باتوں کے علاوہ ۔۔۔ کیا معاشرہ ۔ یعنی وہ ادارہ جسے عدالت کہتے اور معاشرے کا نمائندہ جانتے ہیں۔ حقدار ہے کہ طلاق جیسے معاملے میں جو اسلام کے نزدیک قابل نفرت ہے۔ دخل دے اور عدالت ۔ معاشرہ۔ فیصلہ دے دے کہ طلاق دینے سے پرہیز کرو۔ اور معاملے کو اتنا طول دیا جائے کہ شوہر اپنے ارادے پر پچھتائے یا پھر معاشرے ۔ اسی ادارہ اجتماع ۔۔ پر واضح ہو جائے یہ زیر بحث رشتہ یکجائی نہیں کر سکتا اب اس رشتے کو ٹوٹنا ہی چاہیے............

طلاق (نظام فطرت) (۳)

بات یہ ہورہی تھی کہ اسلام کی نظر میں طلاق بہت زیادہ قابل نفرت وعداوت ومبغوض ہے۔اسلام کا رجحان ہے شادی کا بندھن مضبوط وبرقرار رہے۔ اس کے بعد میں نے سوال اٹھایا تھا کہ اگر طلاق اسی قدر مذموم ومبغوض ہے تو اسلام نے اسے ناجائز ہی کیوں نہ کردیا؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اسلام جس کام کو ناپسند کرتا ہے اسے شراب خواری وقمار بازی وستم گری کی طرح حرام کردیتا ہے؟ پھر طلاق کو بالکل ممنوع کیوں نہ قرار دیا اور اسے روکنے کیلئے قانون وضع کیوں نہ کیا؟ اصل نکتے کی بات یہ ہے کہ آخر اس کی منطق کیا ہے کہ طلاق ''حلال مبغوض'' ہے؟ اگر حلال ہے تو اس کے مبغوض ہونے کا مطلب کیا ہے اور اگر مبغوض ہے تو حلال کیوں؟ اسلام ایک طرف تو طلاق دینے والے مرد کو اپنی غضب آلود نگاہوں کا نشانہ بناتا ہے اس سے نفرت وبیزاری کا اظہار کرتا ہے اور دوسری طرف جب بھی کوئی شوہر اپنی زوجہ کو طلاق دینا چاہے تو اسے کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی آخر کیوں؟

یہ سوالات بجا ہیں سب راز کی باتیں ہیں تو چھپی ہوئی ہیں اصلی راز اور مطلب کی بات یہ ہے کہ زوجیت میاں بیوی کی زندگی فطری بندھن ہے یہ کوئی رسمی معاہدہ نہیں ہے۔فطرت میں اس کے واسطے خاص قوانین وضع ہوئے ہیں۔ بیع اجارہ صلح رہن اور وکالت جیسے معاشرتی معاہدات سے یہ رشتہ مختلف ہے ان میں صرف

معاشرتی یک طرفہ قرر داد باہمی معاملہ ہوتا ہے فطرت وخمیر کا دخل نہیں ہوتا۔ فطرت وغریزہ کوسامنے رکھ کر قانون نہیں بنایا گیا ہے۔ پیمان ازدواج میں یہ بات نہیں یہاں فریقین کی ایک فطری خواہش۔ اصطلاحی طور پر۔ ایک خاص میکانزم کے طور پر پرسٹ ہوتی ہے اور باہمی خوڑ بٹھائے جاتے ہیں۔

اس بناپراگر پیمان ازدواج کے خصوصی ضابطے ہیں اوروہ دوسرے عہدوپیمان کے ضابطوں سے جدا ہیں تو حیرت نہ کرنا چاہیے۔

نکاح وطلاق میں قوانین فطرت کی نگہداشت

شہری معاشرت کا قانون آزادی ومساوات کا قانون ہے۔ تمام معاشرتی معاہدے دواصولوں پر قائم ہوں گے آزادی اور مساوات کوئی دوسرا اصول استعمال نہیں ہوسکتا۔ البتہ پیمان ازدواج اس کے برعکس یہاں آزادی ومساوات کے علاوہ فطرت نے کچھ اور ضابطے بھی وضع کررکھے ہیں، اورقوانین واضوابط کی پیروی ونگہداشت ضروری ہے۔ طلاق، دوسرے معاہدات سے پہلے ہی متن فطرت میں ایک قانون کی مالک ہے۔ آغاز کار۔ خواستگاری، درمیانی عمل۔ نکاح۔ میں ایک خاص قسم کی نگہداری فطرت ضروری ہے۔ آخرکار ردعمل۔ طلاق۔ میں بھی اس پر نظر رکھنا لازم ہے۔ (ہم منگنی اورخواستگاری، مہرونفقہ اورخصوصی طور پر زن ومرد کے مابین فرق پرگزشتہ ابواب میں گفتگو کرچکے ہیں)۔ فطرت کو چھوڑنا کوئی فائدہ مند بات نہیں ''الکسیس کارل'' کے بقول۔ حیات وزندگی کے قوانین، ستاروں کے قانون جیسے سخت اور بے رحم ہیں، ان سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

نکاح وحدت واتصال ہے اورطلاق، جدائی وانفصال۔ جب فطرت نے جوڑا بننے اورزن ومرد کے بندھن کا قانون یوں وضع کیا ہے کہ شرکت زندگی کیلئے ایک

طرف سے اقدام ہو اور دوسری طرف دلبری و دل ربائی کے طور پر شرم کے ساتھ ایک قدم پیچھے ہٹنے کا عمل ہو، ایک سمت وہ جذبات رکھے جن سے دوسرے کو اپنی گرفت میں لینے کی فکر ہو، دوسری طرف ایسے جذبات کہ مقابل آنے والے کا دل چھین لے۔ جب کہ نکاح کا سنگ بنیاد محبت و اتحاد و یکدلی کو قرار دیا گیا۔ باہمی معاہدہ وہم کاری نہیں جب کہ گھر کی تعمیر کا نقطہ نظر یہ رکھا کہ جنس لطیف مرکز ہو اور جنس ورشت اس مرکز کے گرد چکر لگائے ،لہٰذا جدائی اور علیحدگی اور انتشار یا اس مرکز کا خلل بھی خاص ضابطوں سے محدود کیا گیا۔

مضمون کی پندرھویں قسط میں ایک دانشور کی بات نقل کر چکا ہوں کہ ''شادی کا بندھن دراصل مردوں کیلئے قبضہ کرنے کی خاطر ایک حملہ ہے اور عورتوں کیلئے دل فریبی و دل ربائی کی خاطر ایک پسپائی ہے مرد چونکہ فطرتاً شکاری حیوان ہے لہٰذا اس کا عمل حملہ اور جھپٹا ہے۔ ایک مثبت عمل ہے۔ دراصل عورت مرد کیلئے انعام ہے جو اسے لے چکنا چاہیے۔ شادی ایک جنگ وپیکار ہے اور ازدواج شرکت زندگی اور اقتدار ہے۔

وہ پیمان جس کی بنیاد محبت و یگانگت ہے تعاون ورفاقت نہیں ، یہاں جبر و پابندی کا عمل نہیں ہے۔ قانون کے زور و جبر سے افراد کو انصاف کی بنیاد پر تعاون و احترام پر مجبور کیا جاسکتا ہے اور یہ معاہدہ چند سال باقی بھی رکھا جاسکتا ہے۔ مگر قانون کے جبر وزور سے دو افراد کو ایک دوسری کی محبت ،ایک دوسرے سے خلوص ایک دوسرے پر جاں نثاری کیلئے تیار نہیں کیا جاسکتا۔ اور وہ بھی اس طرح کہ ہر ایک اپنی خوش نصیبی کو دوسرے کی خوش نصیبی سمجھے۔

اس قسم کے تعلق کو برقرار رکھنے کی خواہش کیلئے قانونی جبر کے بجائے کوئی دوسری معاشرتی و عملی تدبیر اختیار کرنا ہوگی۔

ازدواج ونکاح کی فطری ٹیکنیک جس کی بنیاد پر اسلام نے اپنے قانون وضع کیے ہیں دراصل ان کی وجہ اور نتیجہ یہ ہے کہ عورت کنبہ کی جمعیت میں مجبور ومحترم ہو بنابریں اگر کسی وجہ سے وہ اپنے مرتبے سے نیچے آجائے اور مرد کی محبت کا شعلہ اس کی سمت سے ٹھنڈا ہوجائے اور مرد اس سے بے رخی اختیار کرلے تو گویا کنبہ کا ایک ستون گرگیا یعنی فطرت کی بنیاد پر ایک فطری معاشرہ بکھر گیا۔ اسلام نے خاص کوشش وتدابیر کے سہارے کنبہ کی زندگی کو فطری انداز میں باقی رکھنا چاہا ہے۔ یعنی عورت مقام محبوبیت ومظلوبیت میں اور مرد مقام طلب وتوجہ وحاضر خدمت رہنے کی منزل میں باقی رہے۔

اسلام نے عورت کو ہدایت نامہ دیا، عورت کو چاہئے:

ہمیشہ اپنے شوہر کیلئے آراستہ پیراستہ رہے۔

اپنی ہنر مندی کے نئے سے نئے جلوے شوہر کو دکھائے۔

شوہر کے جنسی جذبات کو بڑھائے۔

شوہر کی باتوں کا نفی میں جواب دے کر اس کے واسطے نئی گرہ اور ذہنی و نفسیاتی الجھن نہ پیدا کرے۔

ادھر مرد سے کہا:

اپنی زوجہ سے محبت وعطوفت رکھے۔

اظہار عشق وتوجہ کرے۔

اپنی محبت نہ چھپائے۔

اس قسم کی متعدد تدبیریں اسلام نے اس لئے اختیار کیں تاکہ جنسی لذت اندوزی اپنے گھریلو دائرے میں محدود رہے۔ اسلام کی ہدایت کہ میاں بیوی کے باہمی سلوک رشتہ زن وشوہر کے کیڈر سے باہر بہت پاک صاف رہیں۔ یہ سب کچھ اس

لئے ہے کہ کنبہ کا معاشرتی ڈھانچہ بکھرنے کے خطرے سے بچا رہے۔

گھریلو زندگی میں شوہر کا فطری درجہ

اسلام کی نظر میں کسی زوجہ کی انتہائی توہین کہ بات ہے کہ شوہر یہ کہہ دے میں تم سے محبت نہیں کرتا مجھے تم سے نفرت ہے اوراس کے بعد قانون زور و جبر کرے اور بیوی کو گھر میں رکھنے پر مجبور کرے۔ قانون ، جبراً بیوی کو شوہر کے گھر میں رکھ سکتا ہے لیکن اسے فطری درجہ محبوبیت و مرکزیت اور میاں بیوی کی پر محبت و الفت فضا میں باقی رکھ سکے، یہ ممکن نہیں ہے۔قانون شوہر کو زوجہ کی نگہداشت اس کے اخراجات زندگی کی ادائیگی کا پابند کرسکتا ہے مگر اسے ایک ایک جاں نثار اور مرکز کے گرد گھومنے والا دائرہ اور ایک نقطہ نہیں بنا سکتا۔

بنابریں جب محبت و الفت شوہر کا شعلہ بجھ جائے تو فطری ضابطے کے مطابق شادی کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے ۔اگر محبت کا شعلہ بیوی کے دل میں ٹھنڈا پڑ جائے تو کیا ہوگا ؟ کیا بیوی کے رشتہ محبت توڑ لینے سے گھریلو زندگی باقی رہے گی یا ختم ہو جائے گی؟ اگر باقی رہے گی تو میاں بیوی میں کیا فرق ہے کہ مرد کا رشتہ الفت ٹوٹا تو گھریلو زندگی کا خاتمہ بن جائے اور بیوی کے رابطہ الفت ختم ہونے سے وہ زندگی ختم نہیں ہوتی ،آخر وجہ کیا ہے؟اور اگر بیوی کے رخ موڑنے اور رشتہ الفت تورنے سے بھی گھر کا شیرازہ بکھر جاتا ہے تو جس وقت زوجہ،شوہر سے رشتہ توڑنے تو اسی وقت نکاح کا بندھن بھی ختم مان لیں اور بیوی کو حق طلاق دے دیں۔

جواب یہ ہے کہ ''گھریلو زندگی ،فریقین کی دل بستگی پر موقوف ہے ایک فرد سے نہیں اور زن و مرد کی نفسیاتی تحقیق سے دونوں کا اختلاف ہم گزشتہ مقالات میں

ایک ماہر نفسیات کے حوالے سے بیان کر چکے ہیں۔فطرت نے میاں بیوی کا رشتہ کچھ اپسا رکھا ہے کہ بیوی، شوہر کے سامنے جوابدہ ہے۔ بیوی کی اصلی و حقیقی محبت والفت کوشوہر کے احترام وتوجہ کے جواب میں استوار و پائیدار ہونا چاہئے۔لہٰذا بیوی کا مرد سے تعلق معلول (نتیجہ) ہے شوہر کی توجہ کا اور سب کچھ مرد سے وابستہ ہے فطرت نے فریقین کومحبت کی کنجی شوہر کے ہاتھ میں رکھی ہے۔ شوہر اگر زوجہ سے محبت کرے اوروفاداری برتے تو زوجہ بھی اس چاہے گی اوروفاداری برتے گی۔یقینی طور پر عورت مرد سے زیادہ وفاداری ہوتی ہے عورت کی بے وفائی مرد کی بے وفائی کا ردعمل ہے۔

فطرت نے ازدواج فسخ کرنے کی کنجی مرد کودی ہے یعنی مرد اپنی بے تعلقی و بے توجہی اور بیوی سے بے وفائی کر کے بیوی کوسرد مہر و بے تعلق بناتا ہے اس کے برعکس اگر بے مہری عورت کی طرف سے ہوتو مرد کے رشتہ الفت پراس کا اثر نہیں ہوتا، بلکہ کبھی تواس کے جذبہ الفت میں قوت پیدا ہوجاتی ہے۔ بہرحال بیوی کی بے توجہی، طرفین کی بے تعلقی نہیں بنتی۔مرد کی توجہ میں کمی اوراس کا خاتمہ مرگ ازدواج وخاتمہ زندگانی خانوادگی ہے مگر شوہر کیلئے بیوی کے جذبہ التفات کی کمی گھریلو زندگی کومریض نیم جان بناتی ہے لیکن بہتری اور تندرستی کی امید باقی رہتی ہے جس وقت بے توجہی عورت کی طرف سے ہوتو مرد کی عقلمندی ووفاداری کا تقاضا یہ ہے کہ بیوی سے محبت والفت ونرمی کا مظاہرہ کرے اور اسے عشق والفت کی طرف واپس لائے۔مرد کیلئے اپنے روٹھے محبوب کومنانے میں کوئی سبکی نہیں، وہ قانون کے زور سے اس کی نگہداشت کر کے آہستہ آہستہ رام کرسکتا ہے لیکن عورت کی توہین ہے اس کے واسطے ناقابل برداشت ہے کہ وہ اپنے حامی اور عاشق کی حفاظت میں قانون کے زوروجبر کوسہارا بنائے۔

البتہ یہ اس صورت میں ہے جب عورت (بیوی) کی لاتعلقی کی علت شوہر کی بداخلاقی وظلم نہ ہو۔ اگر مرد ظلم شروع کردے اور بیوی ظلم ونقصان رسانی سے تنگ

آ کر دامن چھڑانا چاہتی ہوتو بات کچھ اور ہے ہم اس بارے میں ''مسئلہ دوم'' کے عنوان سے گفتگو کریں گے۔یعنی غیر شریفانہ طور پر طلاق سے پہلوتہی۔وہاں ہم بتائیں گے کہ مرد کو اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ غلط فائدہ اٹھائے اور عورت کو نقصان رسانی وستم گری کیلئے روکے رکھے۔

خلاصہ یہ ہے۔میاں بیوی،زن ومرد میں فرق یہ ہے کہ مرد عورت ذات کا نیازمند ہے اور عورت مرد کا دل چاہتی ہے،بیوی کیلئے شوہر کی حمایت اور دلی توجہ اتنی قیمتی ہے کہ اس کے بغیر شادی کا عمل عورت کیلئے ناقابل برداشت ہے۔

ماہر نفسیات فرانسیسی خاتون کا نظریہ

زن روز شمارہ113 میں ''ماں کے نفسیات'' کے عنوان سے ایک فرانسیسی خاتون Beatric Marbeau (بیٹرس ماربیو) کے مضمون کا ترجمہ چھپتا تھا۔اس مقالے کے مندرجات سے اس خاتون کا نفسیات میں ڈاکٹر ہونے کے علاوہ پیریس کے ایک اسپتال میں نفسیات شناس معالج ہونے کے ساتھ ساتھ تین بچوں کی ماں ہونے کا علم بھی ہوا۔

مقالے کے بعض حصوں سے حاملہ یا بچے والی عورت کی شوہر سے محبت ومہربانی کی توقع پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے،وہ لکھتی ہیں:

''جب عورت محسوس کرتی ہے کہ وہ جلد ماں بننے اور اولاد والی ہونے کو ہے اسی وقت سے وہ سوچ میں پڑ جاتی ہے وہ اپنے بدن کو ٹٹولنے اور سونگھنے لگتی ہے۔خصوصاً اگر پہلا بچہ ہوتو کریدنے کی حس بہت شدید ہوتی ہے بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی ذات سے بیگانہ ہوگئی۔وہ اپنے وجود کا انکشاف چاہتی ہے۔جیسے وہ پیٹ میں ننھی جان کی چھن محسوس کرتی ہے۔اسی وقت وہ کان لگاتی ہے کہ اپنے جسم میں نئے

آنے والے کی ہر آواز کو سنے وجود اسے خوش قسمتی اور مسرت بخشتا ہے وہ آہستہ آہستہ گوشے میں رہنے اور تنہائی میں بیٹھنے کی آرزومند ہو جاتی ہے۔ وہ بیرونی دنیا سے قطع تعلق کر لیتی ہے وہ اس ننھی جان سے خلوت میں دل بہلانا چاہتی ہے جو ابھی دنیا میں نہیں آئی ...... حمل کے زمانے میں شوہروں پر ان کی بیویوں کی بڑی ذمہ داریاں آپڑتی ہیں مگر افسوس ہے کہ مرد ان ذمہ داریوں سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہوتے۔ ہونے والی ماں چاہتی ہے شوہر اسے ٹٹولے اور سمجھے اس سے محبت کرے اس کا خیال رکھے، اس کی حمایت ومدد کرے جب وہ اپنا پیٹ ابھرتے دیکھتی ہے اس کے حسن کو نقصان پہنچتا ہے استفراغ آتے ہیں متلی ہوتی ہے، بچہ جننے کا خوف طاری ہوتا ہے۔ تو اپنے شوہر کو سب باتوں کا ذمہ دار قرار دیتی ہے کہ اسی نے حاملہ کیا............ شوہر کو ان دنوں بیوی سے زیادہ نزدیک رہنا چاہیے اور کنبہ کو بھی ایک غمخوار و ہمدرد باپ کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ بیوی بچوں سے مشکلات شادی وغم میں بات کرے ان کی پریشان کن باتوں کو برداشت کرے حاملہ عورت کی بڑی آرزو یہی ہوتی ہے کہ اس کے بچے کے بارے میں اس سے کوئی بات کرے عورت کی سب سے بڑی عزت وفخر کی بات ہے اس کا صاحب اولاد ہونا۔ اس وقت اگر وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اس کا شوہر اس کے بہت جلد دنیا میں آنے والے بچے سے دلچسپی نہیں رکھتا۔ تو اس کا غرو وافتخار پاش پاش ہو جاتا ہے۔ وہ حقارت اور چھوٹا پن محسوس کرنے لگتی ہے وہ ماں ہونے سے بیزار اور بچہ جننے کو ''احتضار'' وجاں کنی خیال کرنے لگتی ہے۔

ثابت ہو چکا ہے کہ ایسی زچائیں دردزہ زیادہ محسوس کرتی ہیں............

ماں اور اولاد کا رشتہ فقط دو افراد کا رشتہ نہیں بلکہ تین افراد کا درمیانی تعلق ہے ماں بچہ اور باپ۔ باپ غائب ہو (بیوی کو طلاق دے چکا ہو) جب بھی ماں کی اندرونی زندگی اسی کے خیالات وتصورات سے لبریز رہتی ہے۔ شوہری ''مادری جذبات میں بھی

بڑا موثر کردار ادا کرتی ہے......''

یہ تھے خیالات اس دانشمند خاتون کے جو ماہر نفسیات ہونے کے ساتھ ساتھ ماں بھی تھی۔

وہ عمارت جس کی بنیاد جذبات پر ہے۔

اب اچھی طرح سوچیے۔جو مخلوق اس حد تک دوسرے مخلوق کی نیاز مند۔توجہ،قلبی تعلق حمایت اور ہمدردی کی متلاشی ہے۔جو ہر مشکل صرف ''اس'' کی مہربانی وتوجہ کے سارے جھیل سکتی ہے۔اوراس کی محبت کے بغیر وہ اپنی اولاد کا صحیح مطلب بھی نہیں سمجھتی، وہ مخلوق، جو دوسرے کے صرف وجود سے ہی نہیں بلکہ اس کے دل،دل کے جذبات کی طلب گار ہو، کیسے ممکن ہے کہ اسے قانون کے زور سے ایسی مخلوق سے چپکا دیا جائے جس کا نام مرد ہے؟ سخت اور اکھڑ۔

کیا یہ دھوکہ نہ ہوگا کہ ہم ایک طرف بوالھوسی اور بیویوں سے لاتعلقی کے اسباب فراہم کریں اور ہوس رانی کے نئے نئے راستے نکالیں۔پھر قانون کے زور سے بیویوں کو شوہروں سے چسپاں رکھنا چاہیں؟ اسلام نے یہ کام کیا کہ شوہر عملی طور پر بیوی کو چاہے اور اس سے محبت کرے،اسلام بیوی کو شوہر کے سر تھوپنے کا اہتمام نہیں کرتا۔

مختصر یہ ہے کہ جہاں ارادت وخلوص کا قدم درمیان ہو اور جذبات پر تمام معاملات کی بنیا ہو وہاں قانون کا جبر کیا کرسکتا ہے ممکن ہے مقام افسوس ہو مگر جبر و پابندی بہرحال نہیں ہے۔

ایک مثال ہے۔ہمیں علم ہے کہ نماز جماع میں امام کی عدالت شرط ہے اور یہ بھی شرط ہے کہ ماموین امام کی عدالت کا یقین رکھتے ہوں۔یعنی امام وموین کا ربط واجتماع،عدالت امام اور ارادت وخلوص ماموین پر قائم ہے۔اسی وجہ سے یہ

اجتماع و تعلق جبر و پابندی قبول نہیں کرسکتا تنہا قانون اسے دوام واستحکام نہیں دے سکتا ۔اگر ماموں اپنے امام جماعت سے رابطہ توڑ لیں اور خلوص وارادت ختم ہوجائے تو ربط واجتماع درہم برہم ہوجائے گا۔ اس ارادت کا خاتمہ چاہے درست ہو یا غلط ۔فرض کرلیجئے کہ امام جماعت واقعاً عدالت وتقویٰ اور صلاحیت کے اعلیٰ درجے پر بھی فائز ہو۔ جب بھی ماموین کو اپنی اقتدار پر مجبور نہیں کرسکتا قابل مضحکہ ہوگا کہ یہ امام جماعت ،کچہری میں ماموین کے خلاف درخواست دائر کرے کہ لوگ مجھ سے ارادت کیوں نہیں رکھتے ۔لوگ میرے معتقد کیوں نہیں؟ اور آخری بات یہ ہے کہ لوگ میرے پیچھے نماز کیوں نہیں پڑھتے ؟ دراصل ایک امام جماعت کے مرتبے کی توہین ہے کہ عوام کو قوت و جبر سے اپنی اقتدا پر مجبور کرے۔

نمائندہ اسمبلی اور عوام کا رابطہ بھی اسی قسم کا رابطہ ہے ،یعنی انتخاب کرنے والے اور منتخب ہونے والے کا رابطہ ،تعلق وعقیدہ ویقین پر استوار ہوتا۔ اسی رابطہ کا وار ومدار،جذبات اور دل اور معاشرے پر موقوف ہے۔اگر عوام کسی شخص کو ووٹ نہ دیں۔تو ان سے جبراً ووٹ لیے نہیں جاسکتے ۔ خواہ عوام کو دھوکا ہی کیوں نہ ہو اور امیدوار موجود جگہ واقعاً اہل اور اعلیٰ درجے کی قابلیت رکھتا ہو۔شرائط انتخاب بھی پورے موجود ہوں کیونکہ الیکشن کی فطرت اور ووٹ دینے کا مزاج جبر کے خلاف ہے۔ یہ شخص کچہری میں اپنی صلاحیت وقابلیت کی بنیاد پر فریاد نہیں کرسکتا کہ جناب میں اتنا قابل ہوں لیکن عوام مجھے ووٹ نہیں دیتے۔

ایسے مراحل میں کرنے کا کام ہے عوام کی فکری سطح ہموار و بلند کرنا اور ان کی صحیح تربیت ہے جس کے بعد لوگ اپنی دینی ذمہ داری ادا کرتے وقت (نماز ادا کرنے کیلئے) واقعی عادل افراد پیدا کریں ،ان سے ارادت رکھیں۔ یا خلوص اور صحیح جذبے سے امیدواروں کو ووٹ دیں۔ اس کے بعد بھی اگر رائے بدل دیں، ارادت

چھوڑ دیں اور بلا وجہ کسی دوسرے کے پیچھے چل کھڑے ہوں تو افسوس کی جگہ ہے۔ جبروزور کا دخل بیکار ہے۔

کنبہ کا فرض بھی بالکل مذہبی فریضے اور معاشرتی ذمہ داری جیسا ہے ۔لہٰذا اچھی بات یہی ہے کہ ہم مان لیں کہ اسلام ،گھریلو زندگی کو ایک فطری معاشرہ مانتا ہے اور اس فطری اجتماع کو خاص تکنیکی عمل سمجھتا ہے ۔اس تکنیک کی نگہداشت ضروری اور اس سے انحراف کو غلط قرار دیتا ہے۔

اسلام کا بڑا معجزہ یہ ہے کہ اس نے اس تکنیک کی نشان دہی کی جب کہ مغرب آج تک گھریلو مشکلات پر قابو نہ پاسکا بلکہ آئے دن مشکلات میں اضافہ کرر ہا ہے جس کا سبب فطری تکنیک سے غفلت ہے۔البتہ خوش قسمتی کی بات ہے عملی تحقیقات آہستہ آہستہ یہ راستہ روشن کرر ہے ہیں۔ میں چمکتے سورج کی طرح دیکھ رہا ہوں ۔مغربی دنیا علم کی روشنی میں اسلام کے اصول اپنی گھریلو نظام میں قبول کرلیں گے۔ میں اسلام کو نورانی تعلیمات اور مستحکم اصول کو عوام کے ان رویوں سے ہم آہنگ نہیں مانتا جنہیں وہ اسلام کے نام سے اپناتے ہیں۔

گھریلو زندگی کو استوار کرنے والی چیز مساوات سے بھی اہم ہے۔

آج کی دنیا میں اہل مغرب جس کا شیدا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ ہے ’’مساوات‘‘ چودہ سو برس پہلے اسلام نے مساوات کے اس مسئلے کو جس طرح حل کیا ہے یہ لوگ اس سے غافل ہیں ۔فطرت نے فقط شہری معاشرے میں مساوات کا قانون وضع کیا ہے لیکن گھریلو معاشرے میں مساوات کے علاوہ بھی قانون وضع کیے

ہیں۔ اکیلی مساوات گھریلو تعلقات منظم کرنے کیلیئے کافی نہیں، خاندانی معاشرے میں فطرت کے دوسرے قوانین کو بھی معلوم کرنا چاہیے۔

فساد میں مساوات

افسوس ہے کہ مساوات و برتری کی تکرار اور اس کی تعلیم اپنے اصل خوبی و خصوصیت سے ہاتھ دھولیا ہے۔ بہت کم سوچا جاتا ہے کہ برابری سے مراد حقوق میں برابری ہے۔ عام خیال کے مطابق بس یہ کافی ہے کہ مساوات کا مفہوم جہاں بھی صادق آ گیا، بات پوری ہوگئی۔ ان بے خبر لوگوں کے خیال میں ماضی میں مرد عورت سے جھوٹ بولتے تھے۔ آج کل عورتیں، مردوں سے جھوٹ بولتی ہیں، لہٰذا سب کچھ ٹھیک ہوگیا۔ کیونکہ جھوٹ بولنے میں مساوات قائم ہوگئی۔ ماضی میں دس فیصد شادیاں مردوں کے ہاتھوں طلاق تک پہنچتی تھیں۔ اب دنیا کے بعض حصوں میں چالیس فیصد طلاق دی جارہی ہے، ان میں بیس فیصد عورتوں کی طرف سے ہیں لہٰذا جشن منایا جائے کہ مکمل مساوات قائم ہوگئی۔ گزشتہ زمانے میں مرد پاک دامن و پرہیزگار نہیں تھے۔ آج۔ عورتیں بھی خیانت کار ہوگئیں وہ بھی پاک دامنی و پرہیزگاری چھوڑ بیٹھیں، اس سے بہتر کیا ہوسکتا ہے؟۔۔ مساوات زندہ باد۔۔۔ فرق مدارج مردہ باد۔۔۔ پہلے زمانے میں مرد بے رحمی وسختی کا مظاہرہ کرتے تھے، مرد دل نواز بچوں کا باپ ہوتے ہوئے بیوی بچوں کو چھوڑ کر نئی نئی معشوقہ تلاش کرتے پھرتے تھے، آج دیرینہ پیوند بیویاں برسوں کی گھریلو زندگی اور کئی چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ چھاڑ، مجلس رقص میں ایک مرد کی آشنائی کر کے انتہائی قساوت و بے رحمی سے گھر اور آشیانے کو چھوڑ کر ، ہوس رانی کے پیچھے روانہ ہوجاتی ہیں۔۔۔ واہ واہ اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے ۔میاں بیوی ایک ترازو میں آئے برابری قائم ہوگئی۔

یہ ہے۔۔ دوا کے بجائے معاشرے کے بے شمار دردوں میں اضافے۔ میاں بیوی کے نقائص کی اصلاح اور کنبہ کی مرکزیت کو استوار کرنے کے بجائے آئے دن اسے کمزور اور متزلزل کرنے کی فکر میں رقص اور ناچ کہ شکر ہے۔ کچھ تو۔۔ مساوات کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ بلکہ آہستہ آہستہ بیویاں فساد وانحراف و بے رحمی میں مردوں سے آگے جا رہی ہیں۔

اب واضح ہو گیا کہ اسلام نے طلاق کو مبغوض اور قابل نفرت قرار دینے کے باوجود اس سے سامنے قانونی رکاوٹ کیوں نہ کھڑی کی۔ یہ معلوم ہو گیا کہ ''حلال مبغوض'' کسے کہتے ہیں اور ایک چیز حلال ہونے کے باوجود بے حد قابل نفرت و دشمنی کیسے ہو سکتی ہے۔

عقد ازدواج

شہید مطہری، فقیہ، فلسفی ہیں ان کی بحث قانون مملکت اور قانون اسلام دونوں سے مربوط ہے اس لیے عام قاری کو پہلی نظر میں مطلب تک پہنچنے میں بہت سوچنا پڑے گا۔ مثلاً عقد ازدواج عقود لازمہ میں ہے۔۔۔ ''عقد ازدواج طبیعتاً لازم ہے'' اس بات کو سمجھنے کیلئے عقد کے اصطلاحی معنی اور منطق یا فلسفہ قانون اسلام میں ''لازم ولزوم'' کے معنی سمجھنا ہوں گے جس کا خلاصہ یہ ہے:

عقد: بندھن، گرہ (فلسفہ کی اصطلاح میں) اطراف جسم کا جمع ہونا۔ اصطلاح فقہ میں یہ اصطلاح۔ باب معاملات ونکاح، میں استعمال ہوتی ہے جس کے مطلب ہیں: ایجاب وقبول یا شرعی طور پر معتبر خاص رابطہ۔ بیع، ھبہ، وقف، نکاح جیسے امور میں ایک شخص معین قانونی کلمہ یا کلمات ادا کرتا ہے دوسرا شخص اسے قبول کا اظہار کرنے والے کلمات زبان سے کہتا ہے اس کے بعد قائم ہو جاتا ہے۔ مثلاً عقد ازدواج

ونکاح میں عورت یااس کا وکیل ''زوجت۔۔۔۔'مرد یااس کا وکیل کہے''قَبِلْتُ۔۔''
وغیرہ یہ عقید صحیح وشرعی ہے اس کے بعد کچھ حقوق وفرائض، کچھ آزادیاں کچھ پابندیاں
ان دونوں عقد کرنے والوں پر عائد ہوجاتی ہیں۔ ایجاب وقبول کرنے
والے''متعاقدین'' کہے جاتے ہیں۔

عقد کے بعد منطقی لحاظ سے متعاقدین کے درمیان عقد''التزام'' کی صورت
رکھتا ہے؟ اس میں بحث ہے۔ کچھ لوگ۔ایک چیز کے مقابلے میں متعاقدیں کے
عقد کو التزام مانتے ہیں۔بعض لزوم والتزام نہیں مانتے۔بحث کی بنیاد یہ ہے کہ
عقد مقولہ فعل ہے اور التزام مقولہ، اضافت، جو حضرات ان میں التزام مانتے ہیں وہ
عقد کرنے والے دونوں افراد کے درمیان عقد ومعاہدے کو مقولات کی بحث سے الگ
کرتے اور''لزوم'' پر اصرار کرتے ہیں۔ اور جو حضرات لزوم کا انکار کرتے ہیں وہ
ایجاب وقبول کی تکنیک اور اس سے دو مفہوم حقیقی ومنطق کا اثبات کرتے ہیں۔ وہ کہتے
ہیں کہ لفظ کے تین مدلول (معنی یا مفہوم) ہوتے ہیں۔ مطابقی، تضمنی اور التزامی
عقد سے مراد ہے وہ ایجاب جو قبول سے مربوط ہے۔اور جہاں ایجاب قبول سے
مربوط ہو، وہاں یا تملیک مراد ہے یا مبادلہ۔لہٰذا تعہد (نگہداشت و پابندی
) اور التزام کا ربط نہیں رہتا۔ ہاں التزام عقد کے احکام میں ہوسکتا ہے۔عوارض میں
ہوسکتا ہے مگر لزوم نہیں ہوسکتا یعنی متعاقدین کے عقد سے نہ اس کا تعلق جز جیسا نہ اس کی
جدائی محال ہے۔ تفصیل کیلئے دیکھئے کتب استدلالی فقہ نیز۔ ڈاکٹر سید جعفر سجادی کی
کتاب''فرہنگ معارف اسلامی'' جلد سوم حرف ع ق د۔۔۔طبع تہران۔ایران۔

دیکھیے، حضرت مرجع اعظم، آیت اللہ العظمیٰ امام خمینی مدظلہ العالی''تحریر
الوسیلہ'' جو ثانی، ص294 کتاب الطلاق، القول فی الصیغۃ۔

طلاق (کوشش صلح کے پس منظر میں) (۴)

سابقہ بحث سے معلوم ہو چکا کہ اسلام طلاق اور کنبہ کے شیرازہ بکھرنے کے مخالف اور دشمن ہے۔ اسلام نے شیرازہ خاندان کے حفاظت کے بارے میں اخلاقی ومعاشرتی پیش بندیاں کی ہیں اس نے طلاق کو وقوع پذیر ہونے سے روکنے کی خاطر متعدد وسائل سے کام لیا ہے۔ صرف جبر اور قانون کا ہتھیار استعمال نہیں کیا۔

قوت اور قانون کے اسلحہ کے زور سے شوہر کو طلاق سے روکا اور بیوی کو قانون کے جبر سے شوہر کے گھر میں رکھا جائے۔ اسلام اس کے مخالف ہے۔ اس کے نزدیک گھریلو ماحول میں یہ اقدام عورت کے درجے کے شایاں شان نہیں ہے، وہ گھریلو زندگی کی بنیادی رکن اور جذبات واحساسات کا سرچشمہ ہے۔ جس شخصیت کو رشتہ ازدواج کے نرم وحسین جذبات جذب کر کے مہر ومحبت کے بادل اولاد پر برسانا ہیں وہ عورت ہے۔ شوہر کی سرد مہری، اس کے شعلہ محبت کا بجھنا، اس کے زوجہ سے متعلق جذباب خاتمہ گھریلو فضا سے گرمی اور روشنی کو ختم کر دیتا ہے۔ بات یہاں تک ہے کہ ماں کے ماورانہ احساسات اولاد کے بارے میں اس سے زیادہ ہوتے ہیں جتنے جذباب شوہر کے اس سے وابستہ ہوتے ہیں ''بیٹرس ماربو'' کی رائے ہم گذشتہ مضمون میں لکھ چکے ہیں ان کے بقول مادرانہ جذبات غریزہ وفطرت نہیں ہیں۔ یعنی ماں بہر حال غیر زوال پذیر جذبات محبت یا کم نہ ہونے والی مامتا اپنے بچوں کو دیتی رہے۔ بلکہ اس کے مادرانہ جذبات بڑی حد تک شوہر کی توجہ سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ بیوی کا وجود شوہر کی ذات سے جذبات واحساسات

کا تاثر لیتا اور اس کے نتائج اپنے سرچشمہ فیاض سے اولاد کے حوالے کرتا ہے۔

مرد کوہسار اور عورت جوئبار اور اولاد سبزہ وگل جیسے ہیں۔چشمہ و جوئبار پہاڑ پر بارش ہوتی ہے وہ بارش کا پانی جذب کر کے ،صاف وشفاف کر کے چشموں اور جوئباروں کے حوالے کرتے ہیں یہ چشمے سبزہ زاروں کو شادابی بخشتے ہیں، بارش نہ ہو، یا پہاڑ پانی جذب کرنے اور مصفا کر کے چشموں تک پہنچانے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو چشمہ خشک اور گل بوٹے مرجھا جائیں گے

جیسے بارش خصوصاً پہاڑوں کی بارش دشت وصحرا کی زندگی کی جان ہے۔ گھریلو زندگی کی جان بھی شوہر کے محبتانہ جذبات اور بیوی کے ساتھ پیار کی رفتار ہے۔اس سے بیوی بچوں کی زندگی میں چمک دمک شفافیت اور خوشیوں کی لہر دوڑتی ہے۔

جب شوہر کے اپنی زوجہ سے جذبات الفت ومحبت کی منزل وتاثیر یہ ہے اور کنبہ کی زندگی بلکہ روح پر اثر اتنا ہے تو پھر قانون کے اسلحہ اور ضابطے کے تازیانے سے مرد کو قابل استفادہ کیسے بنایا جا سکتا ہے۔

اسلام غیر شریفانہ طلاق کا سخت مخالف ہے۔یعنی ایک مرد پیمان رشتہ ازدواج پر دستخط کرنے کے بعد کبھی تو کچھ مدت تک رفیق حیات رہنے کے بعد ایک نو بیاہتا دولھن کے شوق میں پرانی بیوی کو چھوڑنے کا عمل ناپسند کرتا ہے۔لیکن اسلام کی یہ رائے بھی نہیں ہے کہ اس ''ناجواں مرد'' کو پہلی بیوی کے گھر میں رکھنے پر مجبور کیا جائے کیونکہ یہ نگہداشت عائلی زندگی فطری قانون سے مختلف شے ہے۔

اگر زوجہ قانون کے زور اور پولیس کے مدد سے شوہر کے گھر میں واپس آجائے تو کنبہ پر مارشل لا تو نافذ کر سکتی ہے، اس گھر کی ملکہ نہیں رہ سکتی ، وہ شوہر سے جذبات لے کر جذب کرنے اور اولاد تک پہنچانے کا وسیلہ نہیں بن سکتی وہ اپنے وجدان

کی اس ضرورت کو پوری نہیں جو محبت وتوجہ شوہر سے عبارت ہے پھر وہ اپنے وجدان کو سیراب و مطمئن کیونکر رکھے گی۔

اسلام نے کوششیں کی ہیں ناجوانمردی اور غیر شریفانہ طلاقوں کا خاتمہ ہو جائے اور ''مرد'' شریفانہ انداز میں اپنی بیویوں سے سلوک رکھیں اور ان کو برداشت کریں۔لیکن اسلام یہ نہیں چاہتا کہ قانون ساز کی حیثیت سے بیوی پر جسے وہ مرکز شیرازہ بندی خاندان ،اور وسیلہ حصول وتقسیم جذبات جانتا ہے زور و جبر کے ذریعے غیر شریف شوہر کے ساتھ باندھے رکھے۔

اسلام نے جو کچھ کیا ہے وہ مغرب اور مغرب پرستوں کے خلاف کیا ہے، مقابل کا نقطہ اسلام نے غیر شریفانہ رویے کے اسباب بے وفائی اور ہوس رانی سے جنگ کی اور اس پر تیار نہ ہوا کہ بیوی کو غیر شریفانہ مزاج اور بے وفا شوہر کے سر منڈھ دے۔جبکہ مغرب اور مغرب پرست ایک طرف غیر شریفانہ عوامل کو ہر لمحہ فروغ دے رہے ہیں بے وفائی و ہوس رانی مرد کو بڑھا رہے ہیں۔اس کے بعد یہ چاہتے ہیں کہ جبر کے ذریعے ہوس راں و بے وفا و غیر شریف شوہر سے بیوی کو اٹکائے رکھیں۔۔

آپ تصدیق کریں گے کہ اسلام نے غیر شریف شوہر کو بیوی کی نگہداشت اور اپنے گھر میں رکھنے پر مجبور نہیں کیا، اس نے دونوں کو آزادی دی اور اپنی تمام کوششیں ،روح انسانیت اور شرافت کی بقا پر صرف کی ہیں۔عملی طور پر اسلام اتنا تو بہر حال کر سکا کہ بہت زیادہ دقابل توجہ حد تک طلاقوں میں کمی کر سکے۔دراں حالے کہ دوسروں نے ان مسائل پر کوئی توجہ نہیں دی اور ہر قسم کی خوش نصیبی و شادکامی زور اور نیزے کی نوک طلب کی ہیں۔پھر بھی کامیابیاں بہت کم نصیب ہوئیں۔ان طلاقوں سے قطع نظر جو باہمی تعلقات کی خرابی (بقول رسالہ نیوز ویک) عورتوں کی لذت اندوزی کی بنا پر واقع ہوتی ہیں فقط مردوں کی ہوس رانی کی بنا پر ہمارے یہاں

دی جانے والی طلاقوں سے مغرب میں مردوں کی طرف سے دی جائے والی طلاقوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔

گھریلو صلح کا مزاج ہر قسم کی صلح سے جدا ہے

یقیناً، میاں میں بیوی، صلح، صفائی برقرار رہنا چاہیے مگر ایسی صلح وصفائی جوان کے باہمی رشتے پر حکمراں ہو۔ یہ صلح وصفائی اس صلح وہم آہنگی سے مختلف ہے جو دو شریک کار، دوہم سایے دو پڑوسی حکومتیں اور دو ہم سرحد سلطنتوں میں کارفرما ہوتی ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔

میاں بیوی کی زندگی میں صلح وصفائی کا مقابلہ کرنا ہوتو اس ہم آہنگی ولطافت سے کریں جو ماں باپ اور اولاد میں ہوتی ہے جس کو جاں نثاری ودرگزر کے ہم پلہ کہا جاتا ہے اور ربط جو ایک دوسرے کے مقدر سے ہو، جو دوئی کی دیوار گرادے۔ ایک کی خوشی دوسرے کی خوشی بن جائے اور ایک کی پریشانی دوسرے کی پریشانی ہو۔ برخلاف اس اتفاق و دوستی کے دوہم کار، دوشریک یا دوہم سایوں یا دو پڑوسی ملکوں میں ہوتی ہے۔

اس قسم کی صلح کا مطلب ہوتا ہے ایک دوسرے کے حقوق میں عدم مداخلت بلکہ دو متحارب حکومتوں میں ''مسلح صلح'' بھی ہوجاتی ہے۔ بشرطیکہ تیسری قوت مداخلت کرے اور دونوں کی سرحدی لائن پر قبضہ کرلے، اور دونوں حکومتوں کو جنگ روکنے کا حکم دے نتیجے میں دونوں میں صلح ہوجاتی، کیونکہ سیاسی صلح کے معنی صرف عدم تصادم کے ہیں۔

گھر کی صلح، سیاسی صلح سے مختلف ہے۔ گھریلو صلح میں فقط ایک دوسرے کے حقوق پر دست درازی سے باز رہنا کافی نہیں ہے۔ گھریلو صلح میں ''صلح مسلح'' سے کام

نہیں بنتا یہاں اس سے بڑھ کر اور کسی اہم ترین اساسی بات کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی اتحاد یگانگت ،دل وجان کا گھل مل جانا جیسے باپ اور اولاد کی صلح وصفائی میں ہوتا ہے۔ٹکراؤ سے بچنے کے علاوہ کوئی بڑا مرحلہ۔افسوس ہے کہ مغرب تاریخی اسباب ممکن ہے جغرافیائی عوامل کی بنا پر گھریلو جذبات سے بے بہرہ ہے حتیٰ کہ گھر کی فضا کے اندر بھی وہاں گھر کی صلح سیاسی یا معاشرتی صلح سے جدا نہیں سمجھی جاتی ،یورپ کے عوام جس طرح دوملکوں کی سرحدوں پر صلح برقرار رکھتے ہیں اسی انداز سے عدالی قوت کے ذریعے میاں بیوی کی سرحدات زندگی میں صلح قائم رکھنا چاہتے ہیں،انہیں یہ نہیں معلوم کہ زن وشوہر کی سراحدت زندگانی میں ''سرحد'' کا خاتمہ ہی بنیاد حیات ہے۔وحدت اور تیسری قوت کو بیگانہ سمجھنے کا احساس۔

مغرب پرست اہل یورپ کو ان کی غلط فہمیاں بتانے ان کو گھریلو مسائل اپنے فخر کی باتیں سمجھانے کے بجائے خود ان کے رنگ میں رنگنے کا وہ جنون مول لے چکے ہیں کہ سر اور پیر کا فرق یاد نہ رہا۔لیکن یہ خودفراموشی دیر تک رہنے والی نہیں ہے جس دن بھی مشرق نے اپنی شخصیت دریافت کرلی جس دن بھی مغرب کا جوا اتار پھینکا جس دن بھی آزادی کی فکر اور رآزاد فلسفہ زندگی پر بھروسہ کرلیا اس دن یہ عیب دور ہو جائیں گے اور وہ دن قریب ہیں۔

یہاں دو باتوں کا تذکرہ ضروری ہے:

اسلام،طلاق سے باز رکھنے والی ہر تجویز کا خیر مقدم کرتا ہے

۱۔ ممکن ہے کچھ حضرات ہماری گزشتہ گفتگو سے یہ نتیجہ حاصل کریں

کہ ہم شوہر پر طلاق کے سلسلے میں کسی رکاوٹ کے قائل وخواہش مندنہیں ہیں۔ مرد جب طلاق دینا چاہے ہر راستہ اس کے واسطے کھلا ہو۔نہیں۔ایسا کوئی خیال نہیں ہم نے اسلام کے نقطہ نظر کی توضیح میں صرف یہ بتایا ہے کہ شوہر کے سامنے قانون کا جبر رکاوٹ بنا کر فائدہ نہیں اٹھاسکتا۔سلام،شوہر کوطلاق سے باز رکھنے کیلئے جو بات بھی کی جائے اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔اسلام نے سوچ سمجھ کر طلاق کیلئے ایسے شرائط اورضابطے وضع کیے ہیں جوطبعی طور سے طلاق کوالتوامیں ڈال کر شوہر کواس سے موڑ دینے والے ہیں۔

اسلام نے ایک طرف،صیغہ طلاق وگواہ کی شرط رکھی،اورنصیحت کی ہے کہ طلاق دینے والے کوطلاق سے باز رکھیں ۔دوسری طرف دوعادل گواہوں کے بغیر طلاق کو باطل قرار دیا،یعنی ان دوآدمیوں کی جن کے سامنے طلاق دے گا انہیں عدالت وتقویٰ کے ساتھ پوری سعی وکوشش کرنا ہے کہ میاں بیوی میں صلح وصفائی کرادیں۔

آج کل،طلاق دینے والا ایسے دوعادل گواہوں کے سامنے طلاق جاری کرتا ہے جنہوں نے میاں بیوی کا نہ دیکھا بھالا نہ جانا پہچانا ان کے سامنے تو فقط دونوں کے نام لیے گئے ہیں۔یہ بات ایسی ہے جو بجائے خود کچھ بھی ہو اسلام کے نظریے اورمقصد سے الگ ہے۔ہمارے یہاں رسم ہے طلاق دینے والے دوعادل ڈھونڈھ لیتے ہیں اوران کو بٹھا کر میاں بیوی کا نام لے کہ صیغہ طلاق جاری کردیتے ہیں۔۔مثلاً کہتے ہیں:

شوہر،احمداوربیوی فاطمہ میں نے شوہر کی وکالت میں ان کی بیوی کوطلاق دی احمدکون صاحب ہیں اورفاطمہ نامی خاتون کی تعریف کیا ہے؟کیا دونوں عادل حضرات جوبطورگواہ موجود ،اورصیغہ طلاق سن رہے ہیں ان دونوں کودیکھ چکے

ہیں؟ اگر کسی دن ،شہادت طلب کرنے کا موقع آجائے اور ان سے گواہی کی تفصیل مانگی جائے تو کیا وہ بتا سکیں گے کہ ہاں ہمارے سامنے انہیں دو افراد کے درمیان طلاق واقع ہوئی ہے؟ یقیناً وہ یہ بات نہیں کہہ سکتے۔ اب یہ گواہی کس قسم کی گواہی ہے مجھے نہیں معلوم۔

بہرحال شوہروں کو دو عادل گواہوں کی فراہمی طلاق سے باز رکھنے کا ایک سبب ہے بشرطیکہ یہ عمل صحیح طور پر انجام دیا جائے۔ اسلام نے ازدواج یعنی پیمان کے آغاز میں دو عادلوں کی حاضری کی شرط نہیں رکھی۔ دو کار خیر میں تاخیر نہیں چاہتا۔ مگر طلاق جو آخری عمل ہے دو عادلوں کی حاضری پر موقوف کرنا اور شرط قرار دیتا ہے۔

اسلام نکاح کے وقت ماہواری آنے کو عقد میں رکاوٹ نہیں قرار دیتا، باوجودیکہ ہمیں معلوم ہے کہ ماہواری کے زمانے میں میاں بیوی جنسی عمل نہیں کر سکتے اور اس بات کا تعلق شادی سے ہے طلاق سے نہیں ہے۔ کیونکہ وہاں تو جدائی کا مرحلہ ہے اس کے بعد دونوں کا آپس میں کوئی رشتہ ہی نہ رہے گا۔ قاعدے کے مطابق صیغہ نکاح ماہواری کے زمانے میں جاری ہونے بلکہ جائز نہ ہونے کی ضرورت تھی کیونکہ دونوں کا پہلی مرتبہ یکجا ہونے کا مرحلے ہوتا ہے اور ممکن ہوتا ہے کہ وقت عادت کا خیال نہ کریں۔ بخلاف طلاق کے جو علیحدگی کا وقت ہے اس میں ماہواری کی عادت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن اسلام چونکہ ''وصل'' کا حامی اور ''فصل'' وفراق کا مخالف ہے اس لئے زمانہ عادت کی مانع صحت طلاق قرار دیتا ہے اور مانع صحت عقد نہیں مانتا ، بلکہ بعض مقامات پر تو تین مہینے تک ''تَرَبُّض'' کو واجب قرار دیتا ہے اس کے بعد صیغہ طلاق جاری کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔

صاف سی بات ہے ان سب رکاوٹوں کے پیدا کرنے کا مقصد یہی ہے اتنی مدت میں ان اذیتوں، اور غیظ وغضب کا زور ٹوٹ جائے جن کی وجہ سے طلاق پر آمادگی

تھی،اور دونوں میاں بیوی مفاہمت پر تیار ہوں اور پہلی جیسی زندگی گزارنے لگیں۔

مزید برآں ،مرد کی ناپسندیدگی کی بنا پر طلاق واقع بھی ہوجائے جب بھی ''عدے'' کے نام سے دوبارہ مہلت دی گئی ہے کہ وہ فیصلہ واپس لے اور بیوی کو دوبارہ آباد کرلے۔

شادی اورعدہ نیز اولاد کی نگہداشت کی صورت میں اخراجات شوہر کو ادا کرنے کا ضابطہ بجائے خود شوہر کیلئے عملی رکاوٹ ہے۔اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص طلاق اور نئی شادی کی فکر میں ہے تو اسے پہلے تو زوجہ اولیٰ کے عدے کے''نفقہ'' دینا ہوگا پھر بچے اس کے پاس رکھنا ہوں تو بچوں کے اخراجات ادا کرنا پڑیں گے۔اس کے بعد نئی بیوی کا مہر اور اس کی زندگی کے اخراجات اس کے یہاں ہونے والے بچے اور ان اخراجات کیلئے تیاری کرنا ہوگی۔

ان سب باتوں کے علاوہ بے ماں کے بچوں کی ذمہ داری ایسا بھیانک مستقبل سامنے لاتی ہے کہ آدمی خود بخود اپنے ارادہ طلاق کے سامنے ایک دیوار دیکھتا ہے۔

ان باتوں سے بڑھ کر چونکہ اسلام سمجھتا تھا کہ خاندان کا رشتہ اب بھی درہم برہم ہوسکتا ہے لہٰذا ایک گھریلو کچہری اور فیصلہ کن حاکم کا ضابطہ بنایا یعنی ایک بیوی کا نمائندہ ایک شوہر کا نمائندہ اپنے اپنے موکلوں سے حق فیصلہ لے کر ایک جگہ بیٹھیں اور ان کے جھگڑے کا فیصلہ کر کے دونوں میں صلح صفائی کرائیں۔

دونوں منصب انتہائی کوشش کریں گے اور دونوں کے گلے شکوے ختم کریں گے۔سب کچھ کرنے کے بعد بھی اگر صلح صفائی نہ ہوسکے اور طلاق ہی بہترین حل نکلے تو بہرحال دونوں کو الگ کردیں۔ یہاں بھی ان آدمیوں کا ہونا بہتر ہے جن کا تعلق دونوں کے گھروں سے ہو۔سورہ النساء کی آیت نمبر 35 کے الفاظ یہ ہیں:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ۝۳۵

اور اگر تم کو دونوں میں جدائی کا ڈر ہو تو ایک منصف شوہر کے خاندان اور ایک منصب زوجہ کے خاندان کی طرف سے مقرر کرو۔ اگر دونوں منصف اصلاح احوال چاہیں، اللہ ان دونوں میں موافقت واتحاد پیدا کرے گا، بے شک اللہ علیم وخبیر ہے۔

صاحب تفسیر کشاف نے ''حکم'' کی تفسیر میں لکھا ہے:

ایك رجلا مقنعا رضیا یصلح لحکومة العدل والاصلاح بینهما۔

یعنی جو شخص ثالث ومنصف منتخب کیا جائے وہ معتمد ہو، اس کی بات قابل قبول اور گفتگو مضبوط وبادلیل ہو اصلاح احوال اور عادلانہ فیصلے کے لائق اور پسندیدآدمی ہو۔

اس کے بعد لکھا ہے۔ پہلے مرحلے میں دونوں منصفوں کو میاں بیوی کے خاندان سے ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایسے افراد چونکہ دونوں کے نزدیکی اور باہمی قضیوں سے زیادہ باخبر ہوتے ہیں اور رشتے داری کی وجہ سے اجنبی کے مقابلے میں زیادہ اصلاح کرنے کے امکانات رکھتے ہیں۔ نیز میاں بیوی اپنے دل کی بات غیروں کے بجائے اپنوں سے زیادہ کہہ سکتے ہیں وہ اپنے راز اور خانگی معاملات غیروں سے یوں نہیں کہہ سکتے۔

یہ مسئلہ کہ ثالثی کا تقرر واجب ہے یا مستحب؟ علماء میں اختلاف ہے۔ محققین کے نزدیک یہ حکومت کی ذمہ داری ہے اور واجب ہے۔ شہید ثانی نے ''مسالک'' میں صاف صاف فتویٰ دیا ہے کہ ثالثی کا مسئلہ جس ترتیب سے بیان کیا گیا۔ واجب وضروری ہے کہ حکام کا فریضہ ہے کہ وہ ہمیشہ یہ ذمہ داری پوری کرتے رہیں۔

سید محمد رشید رضا، مولف تفسیر [1] ''المنار'' ثالثی کمیٹی بنانا واجب ہے کہہ کر علماء اسلام نے فتوؤں میں اختلاف پر روشنی ڈالتے اور بتاتے ہیں کہ ثالثی واجب یا مستحب ہونے کے بحث عجیب ہے۔

> عملاً اس بات سے مسلمان اس کے بے انتہا خصوصیات سے فائدہ ہی نہیں اٹھاتے، طلاق کا سلسلہ بدستور ہے، شقاق واختلاف گھروں میں رہتا ہے، نص قرآن ثالثی کے بارے میں ہوتے ہوئے ذرہ بھر اس کی طرف توجہ اور اس سے فائدہ اندوزی نہیں کی جاتی ہاں علما ر اسلام اس کے وجوب واستجبات کے اردگر بحث میں سرگرم ضرور رہتے ہیں۔ کوئی یہ کہنے والا نہیں جو ان سے کہے کہ واجب ومستحب کیا اس حکم کو نافذ کرنے کے سلسلے میں عملی اقدام کیوں نہیں کرتے؟ بحث مباحثہ ہی پر پورا زور کیوں لگ رہا ہے؟ اگر طے کرلیا ہے کہ اس حکم پر عمل نہ کیا جائے اور لوگ اس کے خصوصیات سے فائدہ نہ اٹھائیں تو واجب یا مستحب ہونے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟

شہید ثانی نے ان شرائط کے بارے میں لکھا ہے جو منصفین، میاں بیوی کی

---

[1] تفسیر المنار ج5 ص79 ضمن آیت مذکور

مصالحت کے ذیل میں طے کریں:

مثلاً: نصف حضرات شوہر کو پابند کریں کہ وہ اپنی بیوی کو فلاں شہر یا فلاں گھر میں رہنے کی جگہ دے یا یہ کہ مثلاً............ اپنی ماں یا دوسری بیوی کو اس گھر میں رہنے کی جگہ دے یا یہ کہ مثلاً۔۔ اپنی ماں یا دوسری بیوی کو اس گھر یا اس کے کمرے میں نہ رکھے یا مثلاً بیوی کا مہر جو واجب الادا ہے اسے ادا کرے یا بیوی سے لے ہوئے قرضے کو فوراً واپس کرے۔

غرض کہ جو اقدام بھی شوہر کو طلاق سے باز رکھنے پر کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کی نظر میں صحیح اور مطلوب ہے۔

بائیسویں مقالے میں سوال تھا۔ کیا معاشرہ یعنی وہ کمیٹی جو عدالت وغیرہ کے نام سے معاشرے کی نمائندہ ہوتی ہے اس کا حق رکھتی ہے کہ طلاق کے معاملے میں مداخلت کر سکتی ہے؟ اس طلاق کے معاملے میں جو اسلام کی نظر میں قابل نفرت وبغض ہے، ایسا اقدام جو شوہر کو طلاق دینے کے آخری اقدام سے روک دے۔

جواب۔۔۔ یقیناً وہ ایسا اقدام کر سکتی ہے۔ کیونکہ طلاق کیلئے ہر قسم کے حتمی فیصلے حقیقی موتِ ازدواج کی علامت نہیں ہوا کرتے۔ دوسرے لفظوں میں طلاق کے بارے میں تمام فیصلے ایسے نہیں ہوتے جو شوہر کے شعلہ محبت کی فسردگی کی دلیل کا حل ہوں اور یہ ثابت کر دیں کہ بیوی اپنے مقام ودرجے سے گر گئی اور وہ فطری درجہ کھو بیٹھی جس کی وجہ سے وہ شوہر کیلئے بحیثیت بیوی کے قابل نگہداشت نہ رہی۔ بہت سے فیصلے غصے، غفت یا غلط فہمی پر مبنی ہوتے ہیں، لہٰذا معاشرہ جس انداز اور جس ذریعے کو عملی اقدام کیلئے پسند کرے اسلام اسے خوش آمدید کہتا ہے۔

ثالثی ادارہ معاشرے کی نمائندگی کرتے ہوئے طلاق کی سند یا رجسٹریشن کرنے والے اداروں کو اس وقت تک قانونی توثیق سے روک سکتا ہے جب تک ارادہ

صلح کی تدبیروں کوعمل میں لا رہا ہو۔ جب ادارہ یہ کہہ دے کہ ہمیں صلح نہ ہونے کا یقین ہوگیا ہے اور میاں بیوی دونوں میں مفاہمت ممکن نہیں ہے اس کے بعد دفتر اور متعلقہ محکمے اپنی کاروائی شروع کر سکتے ہیں۔

خاندان کیلئے بیوی کے گزشتہ خدمات

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ غیر شریفانہ طلاق، گھر کی مقدس مرکزیت کونقصان پہنچانے کے علاوہ خود عورت کیلئے بہت سے مشکلات پیدا کرتی ہے۔ جنہیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایک خاتون جو کئی برس تک خلوص ومحبت کے ساتھ ایک مرد کے ساتھ اس کے گھر میں اپنے اور اس کے درمیان دوئی چھوڑ کر رہتی اور اس گھر کو آشیانہ راحت سمجھتی ہے۔ اس گھر کو آباد وشادر رکھنے کیلئے اپنی پوری قوت ومحبت صرف کرتی ہے۔ اصطلاح جدید کی بنا پر شہر کی ترقی پسند خواتین کے علاوہ عام طور پر خواتین گھر کے کام کاج کرتی اور کھانے، پہننے گھر کا خرچ چلانے میں دکھ اٹھاتی اور کفایت شعاری سے کام لیتی ہیں، فقط بچت کی خاطر شوہروں کو خادم نوکر رکھنے سے ناراض کر دیتی ہیں۔ اپنی صحت وسلامتی، جوانی اور طاقت گھر آشیانہ اور جھونپڑے بلکہ اپنے شوہر پر نثار کر دیتی ہیں۔ فرض کریں، ایسی بیوی کو برسوں ایک ساتھ زندگی بسر کرنے کے بعد نئی دولھن کے شوق میں کوئی شوہر طلاق دے مارے اور اسی گھر میں جسے خوش وخرم رکھنے کی خاطر اس نے اپنی عمر وجوانی وسلامتی وتمناؤں کی دنیا لٹائی تھی اب دوسری بیوی لانا چاہے اور اس سے عیش پرستی ہوس رانی دکھائے تو بتایئے ایسے عمل کی ذمہ داری کیا اور کس پر ہے؟

یہاں اس پر بحث نہیں ہے کہ گھریلو زندگی کی مرکزیت درہم برہم ہو رہی ہے شادی کا رشتہ ٹوٹ رہا ہے جو آپ جواب دیدیں کہ شوہر کی غیر شریفانہ روشن شادی

کو موت ہے اور غیر شریف آدمی کے سر کسی عورت کا تھوپا جانا،عورت کی فطری منزلت ومقام کے شایاں شان نہیں۔

یہاں زیر نظر بات ہے آوارہ وبے آشیاں ہونے کی اپنا سجا سجایا بسیرا رقیب کے حوالے کرنے کی، دکھ درد، زحمت وخدمت ضائع ہونے کی بات پر گفتگو ہے۔

شوہر گھر کی مرکزیت،شعلہ حیات خاندان کا بجھنا جہنم میں جائے ۔آخر ہرانسان آشیانے اور رین بسیرے کا محتاج ہے پھر وہ بسیرا جیسے اپنے ہاتھوں بنایا اور بسایا اس سے انس خاطر تو ہوتا ہے۔ اگر کوئی پرندہ اپنے بنانے ہوئے جو تجھ سے نکال دیا جائے تو کچھ نہ کچھ مزاحمت تو کرتا ہے کیا عورت کو اتنا بھی حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے گھر اپنے آشیانے کے لئے مزاحمت کرے؟ کیا یہ عمل مرد کی طرف کھلی ستم گری نہیں ہے؟ اسلام نے اس وقت کیلئے کیا حل تجویز کیا ہے؟

ہمارے عقیدے میں تو اس مشکل کی طرف پوری طرح دھیاں دینا چاہیے ۔اکثر غیر شریفانہ طلاق سے جو پریشانیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا زاویہ یہی ہے۔ ان مقامات پر طلاق، خاتمہ نکاح نہیں،عورت کی ٹوٹ پھوٹ اور نابودی ہے۔

گزشتہ سوال کے ضمن میں اشارہ ہو چکا ہے کہ گھر یا اشیانے کے مسئلہ طلاق سے جدا ہے یہ دو الگ الگ باتیں ہیں ان دونوں کو الگ الگ ہی رکھنا ہوگا۔ اسلام کے نقطہ نظر اور اسلامی ضابطوں کے لحاظ سے یہ مسئلہ حل شدہ ہے۔ اس کے باوجود جو مشکلات ہیں وہ اسلامی ضابطوں سے ناواقفیت اور شوہروں کے غلط طریقے سے فائدہ اٹھانے یا بیوی کی خوش نیتی ووفاداری کے ردعمل سے پیدا ہوئے ہیں۔

یہ مصیبت اس وقت شروع ہوئی جب اکثر میاں بیوی یہ سمجھ بیٹھے کہ بیوی اپنے شوہر کے گھر میں جو کام کاج کرتی ہے اور اس کے جو فوائد ہوتے ہیں وہ شوہر سے متعلق ہے۔ بلکہ گمان یہ کیا جاتا ہے کہ شوہر کا حق ہے کہ بیوی کو لونڈی یا مزدور سمجھ کر حکم

دیا کرے اور بیوی پر واجب ہے کہ ان معاملات میں شوہر کی اطاعت کرے۔ درآں حالیکہ میں کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ بیوی کام کاج میں پوری طرح آزاد ہے۔ اور جو کچھ وہ کرے گی وہ خواہ اپنی ذات کیلئے ہوگا، مرد کو ایک مالک کی طرح بیوی کے ساتھ آنے کا حق نہیں ہے۔ اسلام نے عورت کو اقتصادی آزادی کے علاوہ اس کے اور اولاد کے اخراجات شوہر کے ذمہ واجب کیے ہیں۔ بیوی کو اچھی خاصی مہلت دی ہے کہ آبرومند زندگی کیلئے روپیہ پیسہ اور امکانات حاصل کرے کہ اگر طلاق وجدائی کا وقت آپڑے تو شوہر سے بے نیاز اور پریشانی سے آزاد ہو۔ عورت اپنے رین بسیرے کو رونق دینے کیلئے جو کچھ جمع کرے وہ اپنی سمجھے مرد کو اسے چھیننے کا حق نہیں ہے۔ مذکورہ پریشانیاں اس سماج میں ہوتی ہیں جہاں بیوی کو میاں کے گھر میں بہرحال کام کاج کرنے کا پابند سمجھا جاتا ہے۔ پھر اس کی محنت کے نتائج شوہر کی ملکیت ہیں، بیوی کا اس سے کیا واسطہ۔ فکرمندی عوام کا تعلق ان کی لاعلمی اور قانون اسلام سے بے خبری سے ہے اور کچھ نہیں۔

دوسری وجہ، شوہر کا اپنی بیوی اور اس کی وفاداری سے غلط فائدے اٹھانا ہے کچھ خواتین اپنے شوہروں کے یہاں قانون اسلام سے بے خبری کی بنا پر نہیں، صرف شوہروں پر بھروسہ رکھنے کی وجہ سے جاں نثاری کرتی ہیں۔ ان کا دل چاہتا ہے کہ دونوں میں من وتو، اپنا پرایا نہ رہے۔ یہ پیسہ ہمارا، یہ ان کا ہے اچھا خیال نہیں سمجھتیں۔ لہٰذا اسلام کے دیے ہوئے حقوق سے فائدہ اٹھانے کی طرف دھیاں نہیں دیتیں، اچانک جو آنکھیں کھلتی ہیں تو محسوس کرتی ہیں کہ ایک بے وفا سے محبت کر کے اور جاں فدا کر کے ان مہلتوں سے فائدہ اٹھانے کا وقت ہاتھ سے کھو دیا۔

اس قسم کی خواتین کو شروع سے دھیاں دینا چاہیے کہ محبت کا موقع وہ ہے جہاں دونوں طرح ہو آگ برابر لگی ہوئی اگر بیوی مال جمع کرنے، دولت اکٹھا کرنے

آشیانہ بنانے بسیرا سجانے میں اپنا نام نظرانداز کرتی اور اپنا حق شرعی مرد کیلئے چھوڑتی ،اپنی قوت مرد کو ہدیہ دیتی ہے توشوہر کو بھی اسی انداز سے ردعمل دکھانا چاہیے:

واذا حییتم بتحیۃ فحیوا باحسن منہا اوردوھا

اور جب تمہیں ہدیہ دیا جائے توتم بھی اس سے اچھا ہدیہ دو یا اسی کو واپس کردو۔

یعنی اگر بیوی کوئی ہدیہ پیش کرتی ہے تو اسے اسی معیار ہی کا سہی کوئی ہدیہ بیوی کو بھی نذر کرنا چاہیے۔ وفادار شوہروں کا ہمیشہ یہ دستور رہا اور آج بھی ہے کہ بیوی کا مخلصانہ فداکاری کے جواب میں قیمتی ہدیے مکان یا آثاثہ اپنی بیوی کو نذر کیا کرتے ہیں۔

بہرحال شیانہ اجڑنے اور بے گھر ہونے کا قانون طلاق سے کوئی تعلق نہیں قانون طلاق کی تبدیلی اس کی اصلاح نہیں کرسکتی اس مسئلہ کا تعلق عورت کی اقتصادی آزادی و بے آزادی سے ہے اور اسلام نے اسے حل کر دیا ہے۔ ہمارے سماج میں یہ مشکل کچھ عورتوں کی اسلامی تعلیمات سے بے خبری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے یا پھر دوسرے گروہ کی غفلت وسادہ لوحی کا نتیجہ ہے۔خواتین کو اگر معلوم ہو کہ اسلام نے ان کیلئے کیا مواقع انہیں دیے ہیں۔ اور شوہر پر جاں نثاری میں سادہ لوحی کا مظاہرہ نہ کریں تو مشکل خود بخود حل ہو جائے۔

طلاق، آزادی۔ اور حق (۵)

مطالعہ کرنے والے کو یاد ہوگا، ہم نے بائیسویں فصل میں طلاق سے پیدا ہونے والے سماجی مشکلات دو پہلوؤں سے بیان کیے ہیں۔ ایک غیر شریفانہ طلاق کا رخ تو شوہر کی غیر شرافت مندی وغیر انسانی رویہ جو طلاق دلواتا ہے۔ دوسرے کچھ شوہر کا یہ رویہ کہ بیوی کو سزا دی جائے وہ غیر شریفانہ طور پر طلاق نہیں دیتے ان کا مقصد اس زوجہ کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے زندگی بسر کرنے کا ہوتا ہی نہیں ہے۔

دو فصل پہلے حصہ اول پر بحث ہو چکی، وہاں کہا ہے کہ اسلام ہر قسم کی غیر شریفانہ طلاق کو روکنے والے انتظامات کی حمایت کرتا ہے۔ ایسے طلاق کیلئے خود اسلام نے بھی رکاوٹوں کی تدبیریں کی ہیں۔ اسلام خاندانی تعلقات میں قوت استعمال کرنے اور زور آوری کے ذریعے فائدہ اٹھانے کے خلاف ہے۔

ان معروضات سے واضح ہو گیا کہ اسلام کی نظر میں اسلام ایک ''زندہ ادارہ'' ہے۔ اسلام کوشش کرتا ہے کہ یہ زندہ موجود اپنی زندگی باقی رکھے، مگر جب یہ زندہ موجود، مر جائے تو اسے افسوس کی نظر سے دیکھتا اور دفن کی اجازت جاری کرتا ہے وہ اس مر پر قانون کی مومیائی نہیں چڑھانا چاہتا تا کہ وہ حنوط شدہ لاش کو متحرک اور اٹھائے پھرا جائے۔

شوہر کو حق طلاق دینے کی علت و وجہ معلوم ہوگی۔ یعنی میاں بیوی کا رشتہ ایک فطری علاقہ مندی ہے۔ اس کی خاص ٹکنیک ہے۔ اس مشینری کو مضبوط بنانے اور

اسے بیکار کرنے کی دونوں کنجیاں تخلیق نے مرد کو عطا کی ہیں۔ میاں بیوی دونوں بجائے خود تخلیق کی بنیاد پر خاص پوزیشن کی مالک ہیں جن کا بدلنا یا بالکل ایک جیسا ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ یہ خاص وضع اور پوزیشن اپنی اپنی باری پر متعدد امور کی علت وسبب بنتی ہیں۔ جیسے حق طلاق ـــــ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس معاملے کی علت (خاص وجہ) میاں بیوی کا خاص کردار ہے۔ محبت وعشق ورشتہ زن وشوہری میں۔

حق طلاق مرد کے خاص کردار کا نتیجہ ہے، اس کا تعلق عشق سے ہے، مالکیت سے نہیں

اس موقع پر آپ مخالفین اسلام کی قدر وقیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں یہ گروہ کہتا ہے کہ اسلام نے مرد کو حق طلاق اس وجہ سے دیا ہے کہ وہ عورت کو ارادہ وخواہش وآرزو کا مالک نہیں جانتا، اسلام عورت کو ''چیز'' سمجھتا ہے ''شخص'' نہیں مانتا۔ اسلام شوہر کو بیوی کا مالک جانتا ہے، اسے حق دیتا ہے، جب چاہے اپنے مملوک کو آزاد کر دے۔ کیونکہ:

الناس مسلطون علیٰ اموالھم

لوگ اپنے مال کے مالک ومختار ہوتے ہیں۔

ہماری گفتگو سے معلوم ہو گیا کہ منطق اسلام شوہر کی مالکیت اور بیوی کی مملوکیت پر مبنی نہیں ہے۔ اسلام کی منطق واسلام کا فلسفہ ان لکھنے والوں کی فہم سے زیادہ عمیق اور ان کی ذہنی سطح سے زیادہ بلند ہے۔ اسلام نے گھر کی تعمیری بنیاد اور اس ادارے کی اساس اس کے نکات اور رمز وحی کے اشاروں سے معلوم کیے اور ان کا سراغ لگایا ہے۔ اب چودہ سو برس بعد علم ان کی گہرائیوں کے قریب پہنچ رہا ہے۔

طلاق، اس لئے آزادی ہے کہ شادی کی فطرت حقیقت ''رفافت'' ہے

کبھی کبھی یہ کہتے ہیں:

طلاق میں آزادی (چھوڑنے) کا انداز کیوں ہے؟ اسے یقیناً فیصلے کا رنگ ملنا چاہیے:

ان سے کہا جائے:

طلاق آزادی و رہائی اس لئے ہے کہ ازدواج وشادی رفاقت ہے۔ اگر آپ تمام اجناس نرومادہ سے ''جوڑے'' کے اس قانون (فطرت) کو بدل سکیں، اور ازدواج (جوڑے پن) کی فطری ساخت کو رفاقت کے قالب سے نکال لیں، اگر آپ سے یہ ہو سکے کہ جنس نر و جنس مادہ کو۔ انسان ہو یا حیوان___ ایک کو دوسرے جیسے اثرات دے دیں اور قانون فطری بدل ڈالیں، تو پھر طلاق کو بھی ''رہائی'' کے قالب سے نکال دیجئے۔

ان عناصر میں سے ایک نے لکھا:

عقد ازدواج کو شیعہ فقہا عموماً ''عقد لازم'' شمار کرتے ہیں، بظاہر ایران کا سول لا۔۔قانون مدنی۔۔بھی ''عقد لازم'' ہی جانتا ہے۔لیکن میں یہ کہنا چاہوں گا کہ فقہ اسلامی اور قانون مدنی ایران کے مطابق عقد نکاح فقط عورت کی جہت سے لازم ہے، مرد کی نسبت سے ''جائز عقد'' ہے کیونکہ مرد جب چاہے مذکورہ عقد کو ختم

کردے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

''عقد ازدواج مرد کی نسبت سے جائز اور عورت کی نسبت سے لازم ہے ایک لاقانونیت کی بات ہے۔یوں عورت کو مرد کا اسیر وقیدی بنادیا گیا ہے۔میں دفعہ 1133 (قانون مدنی کشور شہنشاہی ایران) کے ''قانون حق مرد بطلاق'' کا مطالعہ کرتے وقت ان ایرانی خواتین سے شرمندگی محسوس کرتا ہوں جو اس ایٹم کی صدی میں ،چاند اور ڈیموکریسی کے دور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھ رہی (وہ اس قانون کے بارے میں کیا کہیں گی!)

پہلے تو یہ حضرات ایک واضح بات نہیں سمجھ سکے۔طلاق ،فسخ نکاح سے مختلف چیز ہے یہ کہنا کہ عقد ازدواج فطرتاً لازم (بندھن) ہے۔یعنی میاں بیوی میں سے کسی کو حق فسخ نہیں۔چند مقامات مستثنیٰ ہیں۔ اگر عقد نکاح فسخ ہوجائے تو اس کے تمام اثرات بھی ختم ہوجائیں گے۔مثلاً۔مہر ختم ہوجائے گا، بیوی کو مہر طلب کرنے کا حق نہ رہے گا یا پھر عدے کے دنوں کا نفقہ نہیں ہوگا۔ طلاق کی صورت اس سے مختلف ہے۔یہاں زوجیت کا رشتہ ٹوٹنے کے بعد بھی عقد کے اثرات مکمل طور پر ختم نہیں ہوتے۔اگر کوئی شخص کسی خاتون سے شادی کرے اور فرض کیجئے پانچ سو ہزار روپے مہر طے کرے،ایک دن میاں بیوی کی طرح رہ کر طلاق دے دے۔اسے پورا مہر دینا ہوگا اور عدے کے دنوں کا نفقہ بھی ادا کرنا پڑے گا۔دوسری صورت یہ دیکھیے کہ مرد عقد کرتا اور میاں بیوی کے عمل سے پہلے بیوی کو طلاق دیتا ہے، یہاں آدھا مہر ادا کرنا ہوگا، اور چونکہ اس عورت پر عدہ واجب نہیں لہٰذا نفقہ طبعی طور پر واجب نہ ہوگا۔تو یہ معلوم ہوگیا کہ طلاق سے نکاح کے تمام اثرات ختم نہیں ہوتے ،درآنحالیکہ اگر مذکورہ نکاح فسخ ہوجائے تو بیوی کا حق مہر باقی نہیں رہتا۔لہٰذا طلاق اور ہے فسخ

اور ہے۔حق طلاق اورعقدازدواج کے لازمی ہونے میں کوئی منافات وفرق نہیں ہے۔اسلام کے پاس دو مدین ہیں۔ایک فسخ اور دوسری مدطلاق ہے۔فسخ کا حق وہاں دیا ہے، جہاں کچھ عیب میاں یا بیوی میں ہوں۔حق فسخ شوہر کو بھی حاصل ہے، بیوی کو بھی ہے۔بخلاف حق طلاق کے جب گھریلو زندگی مردہ و بے جاں ہوجائے تو صرف مرد کو حق ہے وہ طلاق دے کر اس صورت حال کو ختم کردے۔

اسلام نے طلاق کی مد فسخ سے الگ رکھی ہے اور طلاق کیلئے الگ ضابطے وضع کیے ہیں۔نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فلسفہ اسلام میں مرد کو طلاق کا اختیار اس کیلئے کوئی خصوصیت واعزاز نہیں ہے۔

ان حضرات سے کہنا چاہیے۔کالجوں اور یونیورسٹیوں اور مصنوعی چاند کے دور سے شرمندہ نہ ہوں، بہتر یہی ہے کہ ذرا سبق لیں۔فسخ وطلاق کا فرق سمجھ لیں اسلام کے معاشرتی فلسفہ کا ادراک حاصل کرلیں یہ فلسفہ گہرا بھی ہے اور گھریلو معاشرے کے واسطے مفید بھی ہے اس کی واقفیت سے آپ شرمندگی کے بجائے گردن اٹھا کر ان کے سامنے سے گزر سکیں گے۔افسوس۔جہالت، درد لا دوا ہے۔

طلاق کا جرمانہ

دنیا کے کچھ قوانیں میں طلاق کو روکنے کے خاطر جرمانہ بھی رکھا گیا ہے۔آج کی دنیا میں تو ایسے قانون کا مجھے تو علم نہیں مگر روم کی مسیحی شہنشاہی میں، بغیر کسی معقول وجہ کے بیوی کو طلاق دینے کی سزا موجود تھی۔

روشن حقیقت یہی ہے کہ جرمانہ ''گھریلو زندگی'' کی ہلتی نیو کو مضبوط کرنے میں قانون کے زور سے بھی فائدہ رساں نہیں۔ہاں، ایک قسم کا فائدہ اندوزی ضروری ہے۔

اگر حق طلاق بیوی کو تفویض ہو؟

اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ یہاں تک ہماری گفتگو یہی رہی کہ فطری حق کے طور پر ''طلاق کا تعلق شوہر ہی سے ہے۔ رہی یہ بات کہ آیا شوہر مطلقاً ہمیشہ اور ہر جگہ۔۔ یا خاص صورت میں اپنی سے بیوی کو وکیل بنا کر حق طلاق دے سکتا ہے؟ یہ بات فقہ اسلام بھی منظور کرتی ہے اور ''قانون مدنی ایران'' میں بھی صاف صاف درج ہے۔ضمناً شوہر کو اپنی وکالت بیوی کو دینے کے بعد اسے واپس لینے سے روکنے کی خاطر ''وکالت بلاعزل'' کا ضابطہ بھی رکھا ہے۔عقد لازم میں یہ وکالت ضمنی شرط کے طور پر دی جاتی ہے۔ اس شرط کے بعد بیوی ،مطلقاً،یعنی ہر وقت اور ہر جگہ یا صرف پہلے سے معین شدہ اور طے کردہ صورتوں میں اپنے تئیں مطلقہ بنا سکتی ہے۔

مدتوں سے یہ قاعدہ چلا آ رہا ہے کہ جو بیویاں اپنے شوہروں سے شروع ہی سے متردد ہوتی ہیں وہ ''شرط ضمن العقد'' کے طور پر حق طلاق محفوظ کر لیتی ہیں اور بوقت ضرورت اس سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔

فقہ اسلام کی رو سے فطری طور پر حق طلاق تو نہیں رکھتی لیکن معاہدے کے طور پر یعنی شرط ضمن عقد کی صورت میں یہ حق حاصل کرنا ممکن ہے۔

قانون مدنی، دفعہ 1119 ہے:

''عقد ازدواج کے دونوں فریق، ہر وہ شرط طے کر سکتے ہیں جو عقد مذکور کے تقاضوں کے خلاف نہ ہو۔ایسی شرط عقد ازدواج یا عقد لازم میں رکھی جا سکتی ہے۔مثلاً یہ شرط کر لی جائے کہ شوہر جب بھی دوسری شادی کرنا چاہے گا، یا اس مدت کے درمیان غائب ہو جائے گا، یا ترک نان ونفقہ کرے گا، یا بیوی کے قتل کی تدبیر کرے گا، یا ایسی بدسلوکی سے پیش آئے گا جس سے دونوں کی زندگی ناقابل برداشت ہو جائے تو بیوی

وکیل در وکیل ہے کہ شرط پوری ہوتے ہی محکمے میں دعویٰ ثابت کرنے کے بعد اپنے تئیں مطلقہ بنالے۔''

آپ نے ملاحظہ فرمایا: جولوگ کہتے ہیں کہ فقہ اسلام اور قانون مدنی ایران میں طلاق کو ایک طرفہ حق قرار دیا گیا ہے۔ یہ حق صرف مرد کو حاصل ہے اور بیوی سے بالکل چھین لیا گیا ہے صحیح بات نہیں ہے۔

فقہ اسلامی کے نقطہ نظر اور قانون مدنی ایران کے زاویے سے حق طلاق فطری طور پر نہیں مانا گیا ہے، البتہ ایک معاہداتی اور تفویض شدہ حق موجود ہے۔

اب وہ منزل آ گئی ہے کہ ہم بحث کے دوسرے حصے پر گفتگو شروع کریں یعنی بعض مردوں کا غیر شریفانہ وظالمانہ انداز سے طلاق نہ دینے کا موضوع۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے اس مشکل کا حل نکالا ہے؟ واقعاً کہ بات بہت پریشانی کی ہے۔اس مدعا پر گفتگو کا عنوان ہے''عدالتی طلاق'' جسے ہم شروع کرنے سے پہلے، ناظرین سے معذرت خواہ ہیں کہ پہلے مسئلہ پر بات ذرا لمبی ہوگئی۔

عدالتی طلاق

عدالتی طلاق یعنی شوہر کے ذریعے کے بغیر قاضی یا جج کے ذریعے جاری ہونے والی طلاق۔

دنیا کے اکثر قوانین میں، طلاق کا اختیار قاضی کو حاصل ہے۔ عدالت ہی طلاق دے سکتی ہے وہی زوجیت کی گرہ کھلنے کا فیصلہ کرسکتی ہے۔ اس رائے کے بموجب تمام طلاق عدالتی ہی ہیں۔ ہم گزشتہ مقالات میں روح ازدواج اور خاندانی مرکزیت کا مقصد اور گھریلو ماحول میں بیوی کا درجہ بیان کرتے ہوئے مذکورہ بالا رائے کی تردید کر چکے ہیں۔ ہم نے ثابت کیا ہے کہ جو طلاق اپنی فطری راہ سے منزل تک آتے ہیں وہ قاضی سے وابستہ نہیں کیے جاسکتے۔

سردست ہماری بحث یہ ہے کہ کیا اسلام کی نظر میں قاضی، سخت وسنگین شرائط قضاوت وقاضی کے باوجود۔کسی صورت حال میں طلاق جاری کرنے کا حق نہیں رکھتا؟ یا ایسے خصوصی حالات ہیں جہاں قاضی کو یہ حق حاصل ہوجاتا ہے؟ اگرچہ وہ حالات استثنائی اور بہت ہی کم کیوں نہ ہوں۔

طلاق، مرد کا طبیعی حق ہے بشرطیکہ، بیوی سے تعلقات کی رفتار فطرت کے مطابق طے ہوں میاں بیوی کی فطری روابط کی رفتار کا تقاضہ اگر باہم زندگی گزارنا ہے تو اس کی بخوبی نگہداشت کرے اور اچھی طرح خیال رکھے، حقوق ادا کرے حسن

معاشرت وحسن سلوک سے پیش آئے ۔اوراگر بیوی کی رفاقت کا خیال نہیں توحسن وخوبی سے طلاق دیدے یعنی بے طلاق اسے نہ چھوڑ دے۔اوراس وقت بھی حقوق واجب کے علاوہ ایک اضافی رقم بطورشکریہ اسے پیش کرے۔

قرآن مجید کا حکم یہی ہے:

وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ

ان کا مال ومتاح دوخوش حال شوہراپنی حیثیت اورتنگدست اپنی حیثیت کے مطابق ۔(سورہ بقرہ ۔236)

اس کے ساتھ ہی اس رشتے کے خاتمہ کا اعلان کردے۔

ہاں،اگرطبیعی رفتار طے نہ ہو،پھرکیا ہوگا؟یعنی،ایک ایسا شوہر پیدا ہوجائے ،جوزندگی بھی ایک ساتھ نہ گزارے حسن سلوک بھی نہ رکھے۔اسلام کی پسندیدہ خوش نصیب گھرانے کی مرکزیت بھی نہ چاہےاوربیوی کا رشتہ بھی نہ توڑے تاکہ وہ اپنی راہ لے یوں کہہ لیجئے کہ نہ توفرائض شوہری پورے کرےاوربیوی کوراضی رکھنے کی کوشش کرے نہ طلاق دینے پرراضی ہو۔یہاں کیا کرنا چاہیے؟

طلاق ،فطری انداز سے ولادت کا عمل ہے،جواپنی طبیعی رفتار سے چلتا ہے لیکن شوہرکی طرف سے وہ طلاق جس میں نہ توشوہراپنی ذمہ داریاں نبائے ،نہ طلاق پرتیار ہو۔ایسا عمل ہے جیسے غیرطبیعی طور پر بچہ ہونے کا عمل جس میں ،سرجن بچے کوشکم سے باہرلائے۔

کیا بعض شادیاں سرطان ہیں،بیوی جلتی رہےاور نباہتی جائے۔

دیکھنا ہے کہ اس طرح کی طلاق اور ایسے شوہروں کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟ کیا اس صورت حال کے باوجود یہی حکم دیتا ہے کہ طلاق کا عمل سو فی صد ،شوہر کے ہاتھ میں ہے۔ اور جب تک ایسا شوہر طلاق پر راضی نہ ہو، بیوی جلتی اور بنا ہتی رہے۔ اسلام ایک ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں دیے دور سے اس ظالمانہ رویے کو دیکھتا رہے؟

بہت سے حضرات کا خیال یہی ہے کہ۔ وہ کہتے ہیں:

اسلام کی نظر میں اس مرض کی کوئی دوا نہیں، یہ ایک قسم کا سرطان ہے کبھی کبھی آدمی اس کا مریض ہو جاتا ہے اس کا علاج ہی نہیں ہے۔ بیوی دکھ جھیلے اور ساتھ دے ،آخر جلتے جلتے ٹھنڈی ہو جائے۔

میرے نزدیک یہ طرز فکر اصول اسلام سے قطعی طور پر متضاد ہے۔ جو دین ہمیشہ عدل کا دم بھرتا ''قِيَامٌ بقِسط ''یعنی انصاف کا قیام اپنا نصب العین اور تمام پیغمبروں کا اساسی دستور بتاتا ہو:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ

ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو اتاری تا کہ وہ لوگوں میں انصاف قائم کریں۔ (سورہ حدید۔25)

اس کے بعد کیسے ممکن ہے کہ وہی دین کھلم کھلا ظلم کا علاج نہ کرے، کیا ممکن ہے کہ اسلام اپنی قوانین اس انداز سے وضع کرے جس کا نتیجہ یہ نکلے کہ ایک بے چارہ انسان سرطان کا دکھ جھیلے اور مر جائے؟

افسوس کی بات ہے کچھ حضرات اقرار کرتے اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ اسلام

''دین عدل'' ہے اپنے تئیں ،عدلیہ فرقے میں شمار کرتے ہیں وہ اس طرح کا نظریہ رکھیں اگر یہ طے کرلیا جائے کہ ظالمانہ قانون کو سرطان کا نام دے اسلام کے سرتھوپ دیں تو پھر کیا ہرج ہے ایک اور ستم گرانہ قانون کو ''ٹٹنس'' اور تیسرے کو ''سل'' پھر چوتھے قانون کو ''اعصابی فالج'' جیسے نام دے کر معاف بھی کردیں اور قبول بھی کرلیں۔

اگر یہی بات ہے تو اصل عدل ''جو اسلامی قانون سازی کا بنیادی ستون ہے وہ کہاں برقرار رہے گا۔

کہتے ہیں۔۔ سرطان۔۔ میں عرض کرتا ہوں بہت اچھا ،سرطان سہی ،تو اگر کوئی بیماری سرطان میں مبتلا ہو جائے کیا اسے اہمیت نہ دی جائے ،اس کا علاج نہ کیا جائے ،فوری اقدامات کے ذریعے بیمار کی جان نہ بچائی جائے۔

ایک خاتون ،زندگی بھر کیلئے کسی مرد کے ساتھ رہنے پر تیار ہوتی ہے، اس کے بعد حالات پلٹا کھاتے ہیں اور معاملہ یہ آپڑتا ہے کہ شوہر اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے ،اور ازدواجی زندگی کی خاطر نہیں ، بلکہ اسے دوسری شادی اور دوسرے رفیق حیات سے محروم رکھنے کی نیت سے بہ تعبیر قرآن مجید ''متعلقۃ'' کی طرح چھوڑ دیتا ہے کہ وہ ہوا میں لٹکی رہی۔ واقعاً ایسی خاتون سرطان کی بیمار ہے۔مگر یہ سرطان وہ سرطان ہے جس کا بہ آسانی علاج ہوسکتا ہے۔اور بیمار ایک معمولی سے آپریشن کے بعد قطعی طور پر مکمل شفا حاصل کرسکتا ہے۔ یہ آپریشن اور عمل جراحی حاکمان وقضیان شرع کرسکتے ہیں جو خاص شرائط اور کوالیفکیشن کے مالک ہوں۔

ہم گزشتہ مقالات میں اشارے کرچکے ہیں کہ دو مشکلوں میں سے ایک مشکل ومصیبت جس سے ہمارا معاشرہ دوچار ہے، وہ یہی ہے چند ظالم شوہر، طلاق سے پہلوتہی کرتے ہیں۔اور اس عمل بد کے لیے دین کا نام لیتے اور ظلم ڈھاتے ہیں۔ پھر ان

ستم ظریفیوں پر اضافہ ان کا انداز فکر ہے وہ بھی دین واسلام کے نام سے کہتے ہیں:
عورت کو یہ ظلم، لاعلاج سرطان سمجھ کر برداشت کرنا چاہیے۔اس سوچ نے ہر اسلام دشمن پروپیگنڈے سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔

باوجودیکہ یہ بحث فنی (فقہی) اور ماہرانہ پہلو رکھتی ہے پھر ان مقالات کے دائرے سے باہر بھی ہے۔مگر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں تھوڑی سی گفتگو کرتا چلوں تاکہ بدبین افراد پر یہ روشن ہوجائے کہ اسلام ان باتوں کے علاوہ کچھ اور کہتا ہے۔

بند راستے

مسائل ازدواج وطلاق کے بند راستوں کی طرح کچھ اور مقالات بھی ہیں جہاں راہیں بند معلوم ہوتی ہیں۔مثلاً ''مالی مسائل'' تو آیئے دیکھیں ''ازدواج وطلاق'' کے علاوہ اور بھی جہاں راستے بند ہیں وہاں اسلام نے کیا کیا ہے؟ کیا اس راستے کو بند ہی رہنے دیا ہے۔یا اسے راستے کو روک نہیں بننے دیا بلکہ کوئی حل نکالا ہے۔

فرض کریں، دو شخص ترکے یا اور طرح سے ایک ناقابل تقسیم چیز کے مالک ہوجاتے ہیں۔مثلاً ایک موتی یا ایک انگوٹھی یا موٹر یا پینٹنگ ۔۔دونوں مل کر اس سے فائدہ اٹھانے پر تیار نہیں کہ ایک مرتبہ ایک لے جائے، دوسری مرتبہ دوسرا استعمال کرے۔اس پر بھی تیار نہیں ایک آدمی اپنا حصہ دوسرے کے ہاتھ فروخت کردے، اس کے علاوہ بھی کوئی مفاہمت نہیں ہوتی۔ہمیں معلوم ہے اس چیز سے فائدہ اسی وقت اٹھایا جاسکتا ہے۔جب دوسرے کی رضا حاصل ہو۔ایسی جگہ کیا کریں؟ اس مال کو پڑا رہنے دیں کوئی فائدہ نہ اٹھائیں اور موضوع ناقابل حل یا ناقابل علاج حادثہ

سمجھ کر اسے چھوڑ دیں یا اسلام نے کوئی حل نکالا ہے؟

درحقیقت فقہ اسلامی نے ان مسائل کو ناقابل حل مشکل کے طور پر کبھی تسلیم ہی نہیں کیا۔حق مالکیت اور مال پر ایسا قبضہ جو مال کو بے استفادہ بنادے۔ اسلام ایسے شخص کا احترام نہیں کرتا۔اور ایسے تمام مقامات میں جہاں مال کو بے فائدہ بنادیا جائے فوراً اسلامی عدالت سے مداخلت کی درخواست دی جائے ،حاکم شرع سے رجوع کے وقت اسے معاشرتی مسئلہ سمجھا جائے یا ایک اختلافی مسئلہ سمجھ کر قاضی اجازت دے دے کہ صاحبان حقوق کی باہمی چپقلش کے خلاف فیصلہ یہ ہے اور صحیح حل یوں ہوگا۔مثلاً زیر بحث مال دونوں مالکوں سے لے کر کرایے پر دے دیا جائے اور کرایے سے حاصل شدہ رقم،ان میں تقسیم کردی جائے۔ یا وہ مال بیچ کر قیمت ،مالکوں میں بانٹ دی جائے۔ بہرحال حاکم یا قاضی شرع کا یہ اعتبار ''ولی ممتنع'' کام یہی ہے کہ وہ اس قصے کی صحیح حلی تدبیر کرے۔حاکم شرع کو اصل مالکان کی رضا لینے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

ایسے مقامات پر قانون حق مالکیت کی پرواہ کیوں نہیں کی جاتی ؟ اس لئے اسے نظرانداز کیا جاتا ہے کہ یہاں ایک دوسری ''اصل'' (قانون کلیہ' سے کام لیتے ہیں۔یعنی اصل یہ ہے کہ مال ضائع ہونے اور قابل ہونے اور قابل استفادہ نہ ہونے سے بچایا جائے۔ مالکیت اور مالکان مال کے قبضے کی ایک حد تک رعایت کی جائے گی وہ حد یہ ہے کہ مال و دولت منجمد اور بے فائدہ نہ ہونے پائے۔

فرض کریں، وہ مال جس پر اختلاف ہوگیا ہو۔موتی یا تلوار جیسی چیز کوئی اس پر تیار نہ ہو کہ اپنا حصہ دوسرے کے ہاتھ بیچ ڈالے۔ دونوں اس پر تیار ہوں کہ اس چیز کے دو ٹکڑے کردیے جائیں اور ہر حصہ دار ایک حصہ اٹھالے ،جھگڑا یہاں تک پہنچ جائے کہ مال کی قیمت واہمیت ہی ختم ہوجائے ۔ظاہر ہے کہ موتی یا تلوار یا موٹر کاٹ

دی جائے تو بیکار ہو جائے گی۔ اسلام کی اجازت دیتا ہے؟ نہیں کیوں؟ اس واسطے کہ مال کی ضیاع ہے۔

فقہاء اسلام میں درجہ اول کے فقیہ، علامہ حلی کہتے ہیں کہ اگر مالک ایسا اقدام کرنا چاہیں تو حاکم اسلام نہیں روکے۔ ارباب دولت و مال کی باہمی موافقت اور ایسے کام پر ان کا سمجھوتہ تسلیم نہیں ہوگا اور انہیں اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

طلاق کا بند راستہ

اب دیکھیں مسئلہ طلاق میں کیا کیا جائے۔ ایک شخص تباہی خاندان کا سر میں سودا لیے ہو۔ اسلام کے عائد کردہ حقوق وفرائض ادا نہ کرنے پر تلا ہو۔ مالی ذمہ داریوں میں نفقہ، اخلاقی فرائض میں حسن سلوک جنسی فرائض میں ساتھ رہن سہن اور ہم خوابی سے عہدہ برآ نہیں ہوتا۔ ایک بھی حق ادا نہ کرے یا کچھ ادا کرے کچھ نہ کرے۔ بہر حال بیوی کو طلاق نہیں دینا چاہتا اب کیا کرنا چاہیے؟ اسلام کی نظر میں مورد کی اہمیت کے لحاظ سے کوئی اصل نافذ ہے جس کی بدولت حاکم یا قاضی شرع مداخلت کا حق رکھتا ہے جیسے مال کے معاملے میں اسے اجازت حاصل تھی۔ یا کوئی ایسی اصل موجود نہیں؟

آیت اللہ حلی کا خیال

میں اس موقع پر سلسلہ گفتگو آیت اللہ حلی مقیم نجف کے حوالے کرتا ہوں موصوف ہمارے عہد کے علماء صف اول میں ہیں۔ انہوں نے ''حقوق الزوجیہ'' نامی رسالے میں اظہار نظر کیا ہے۔ حقوق زوجہ اور مرد کی رکاوٹ پر ان کے نظریے کا خاصہ یہ ہے:

''ازدواج ایک مقدس پیمان ہے۔عین اسی وقت دوانسانوں میں شرکت اور دوفریقوں میں معاہدہ ومفاہمت ہے اور دونوں فریقوں کی خوش نصیبی وخوش حالی کی ضمانت بھی ان مفاہمتوں کی پابندی میں ہے پھران کی خوش حالی سے معاشرے کی خوش حالی بھی وابستہ ہے۔''

زوجہ کے اہم حقوق ہیں نان ونفقہ ولباس ہم خوابی وحسن معاشرت وحسن اخلاق۔

اگرزوجہ کے حقوق کی ادائیگی میں شوہرغفلت کرے اورطلاق بھی نہ دے تو بیوی کا حق کیا ہے؟ وہ شوہر سے کیونکر مقابلہ کرے؟

یہاں دوراہیں ہیں۔ایک تو حاکم شرع کا حق مداخلت ہے۔وہ طلاق جاری کرکے قصہ تمام کرے دوسری بات یہ ہے کہ بیوی اپنی ذمہ داریاں ادانہ کرے اور شوہر سے کیے ہوئے معاہدات کی پابندی چھوڑ دے۔

آیات واحادیث

پہلا نکتہ یعنی حاکم شرع کی مداخلت دیکھنا ہوگا کہ اسے مواقع پر کون سی ''اصل''اوراس اقدام کوجائزقرار دینے والی وجہ جواز حاکم شرع کے واسطےکیا ہے

قرآن،سورہ بقرہ میں ہے:

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ

حق طلاق (ورجوع) دومرتبہ سے زیادہ نہیں اس کے بعد مناسب انداز میں گھرآباد رکھا جائے یانیکی کے ساتھ رہائی دی جائے۔(سورہ بقرہ۔229)

اسی سورہ بقرہ میں ہے:

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ

اور جب بیویوں کو طلاق دو اور ان کا عدہ تمام ہو جائے تو یا انہیں اچھی طرح آباد رکھو یا اچھے انداز میں ان کا راستہ چھوڑ دو۔ اور انہیں ایذا رسانی کیلئے پابند نہ کرو کہ ستم ڈھاؤ اور جو شخص ایسا کرتا ہے وہ خود اپنے اوپر ستم کرتا ہے (سورہ بقرہ۔231)

ان آیات سے ایک ''اصل کلی'' کا استفادہ ہوا۔ یعنی ہر شوہر گھریلو زندگی میں دو میں سے ایک رویہ پسند کر لے۔

الف: تمام حقوق و فرائض بحسن و خوبی انجام دے۔ امساک معروف اچھے انداز میں نگہداشت۔

ب: زوجیت کا رشتہ توڑ دے، بیوی کو آزادی دے۔ تسریح باحسان نیکی کے ساتھ رہا کرنا۔

رہا تیسرا رویہ کہ بیوی کو طلاق نہ دینا، پھر اسے آباد نہ رکھنا ربط و ضبط توڑ لینا یہ نقطہ نظر اسلام میں وجود نہیں رکھتا۔ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ (ان کو ضرر دینے کیلئے نہ روکو کہ ان پر ظلم کر سکو) اسی رویے کی نفی کرتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس جملہ کا مفہوم زیادہ عام ہو۔ یعنی ان رویوں کی بھی ممانعت ہے جہاں شوہر عمداً کوتاہیاں کرتا ہے کہ بیوی کی زندگی اجیرن ہو جائے۔ اور ان رویوں کو بھی برا کہا گیا ہے جہاں اگر شوہر جان بوجھ کر تو نقصان و ضرر نہ پہنچائے لیکن بیوی کا گھر میں

رہنا اور ساتھ رکھنا بیوی کیلئے سراسر زیاں ہو۔

یہ آیات، نازل تو ہوئی ہیں عدہ ورجوع وعدم رجوع شوہر کے بارے میں یعنی مرد کی ذمہ داری واضح کی جارہی ہے کہ طلاق کے بعد بیوی سے رجوع کسی معقول بنیاد پر ہونا چاہیے ۔رجوع اس لئے ہو کہ اب بیوی کو اچھی طرح رکھے گا۔رجوع کا مقصد بیوی کی اذیت رسانی نہ ہو۔مگر مطلب اسی میں منحصر نہیں ہے۔ بلکہ یہ آیات ''اصل وکلیہ'' بتاتی ہیں۔اس سے ہر وقت اور ہر حال میں حق زوجہ واضح ہوتا ہے۔یعنی شوہر مکمل طور پر زندگی میں دوروںیوں میں سے ایک کو پسند کرلے ۔کوئی تیسرا طریقہ اختیار نہیں کیا جاسکتا۔

بعض فقہا اسی مقام پر لغزش سے دوچار ہوئے ہیں وہ سمجھ بیٹھے کہ ان آیتوں کا تعلق مردوں سے ہے کہ وہ طلاق رجعی میں رجوع کریں۔حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ آیتیں تمام شوہروں کو بیویوں کے متعلق فرائض کی نشاندہی کرتی ہیں۔اس بات پر ہماری دلیل سیاق وسباق آیات کے علاوہ یہ ہے کہ ائمہ طاہرین علیہم السلام نے موضوع طلاق کے علاوہ بھی ان آیتوں کو استدلال میں پیش کیا ہے۔مثلاً

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

ایلاء کرنے والا۔ جوشوہر اپنی بیوی سے نزدیکی نہ کرنے کی قسم کھالے ۔ چار ماہ بعد جبراً قسم توڑے اور کفارہ دے یا بیوی کو طلاق دے۔ کیونکہ اللہ عزاسمہ نے فرمایا ہے:

اِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ط

امام جعفر صادق علیہ السلام کے حضور میں مسئلہ عرض کیا گیا کہ فلاں آدمی نے ایک شخص کو اپنا وکیل بنا کر ایک عورت سے مہر طے کر کے نکاح پڑھنے کو کہا اس شخص نے یہ خدمت انجام دی لیکن موکل نے اپنی وکالت سے انکار کردیا۔امامؑ نے فرمایا: ٹھیک

ہے اس خاتون پر کوئی پابندی نہیں ہے وہ اپنے لئے دوسرا شوہر اختیار کرے۔ لیکن اگر اس شخص نے واقعا! وکیل بنایا تھا اور جو عقد ہو وہ وکالت کی بنیاد پر ہوا، تو اس شخص پر واجب ہے کہ وہ اپنے اور خدا کے درمیان معاملہ صاف کرے اور اس عورت کو طلاق دیدے۔ کیونکہ قرآن میں ہے: فَإِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌۢ بِإِحْسَانٍ ۗ ان روایات سے معلوم ہوا کہ ائمہ طاہرین آیت مذکورہ کو ''اصل کلی'' سمجھتے تھے اور خاص مورد میں منحصر نہیں جانتے تھے۔

جب شوہر نہ فرائض ادا کرنے نہ طلاق دے تو حاکم شرع اسے طلب کرے اور پہلے تو اسے طلاق کا حکم دے اگر وہ طلاق جاری نہ کرے تو خود حاکم شرع طلاق جاری کرے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بروایت ابوبصیر مروی ہے کہ امام نے فرمایا: جو شخص اپنی بیوی کو لباس ونفقہ نہ دے مسلمان کے امام پر واجب ہے کہ ان دونوں کو (طلاق کے ذریعے) الگ کردے۔

درجہ اول کے ایک ہم عصر فقیہ کے فرمودات کا یہ خلاصہ آپ نے ملاحظہ فرمایا مزید تفصیلات کیلئے موصوف کے درس کی تقریروں کا مجموعہ ''حقوق الزوجیہ'' ملاحظہ کریں۔

آپ نے غور کیا۔ فَإِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌۢ بِإِحْسَانٍ ۗ ایک اصل اور قاعدہ کلی ہے جسے قرآن مجید نے ''حقوق زوجیت'' دائرہ مقرر کرنے کیلئے وضع کیا ہے لہٰذا مذکورہ اصل نیز ''وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ '' کے اضافے سے کوئی حق باقی نہیں رہتا کہ خوف خدا نہ رکھنے والا شوہر اپنے غلط فائدہ اٹھائے۔ یعنی کسی خاتون کو صرف ستانے اور دوسری شادی سے روکنے کی خاطر طلاق دیے بغیر متعلق رکھے اور خود بھی اسے رشتہ نہ رکھے۔

دوسرے دلائل وشواہد

رسالہ ''حقوق الزوجیہ'' میں بیان شدہ دلائل کے علاوہ اور بھی شواہد و دلائل سے تائید ہوتی ہے کہ:

اِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ

اسلام کے نزدیک ایک اصل کلی ہے، اسی کے دائرے میں حقوق زوجیت کی نگہداشت ہونا چاہیے۔ اس مفہوم آیت پر جس قدر غور کیا جائے اسی قدر مطلب روشن سے روشن تر اور دین مبین اسلام کے ضابطے مستحکم ہوتے نظر آئیں گے۔

الکافی، جلد5 صفحہ 502 پر امام جعفر صادق علیہ السلام کی روایت ہے حضرت نے فرمایا:

اذا ارادالرجل ان تزوج المراۃ فلیقل: اقررت بالمیثاق الذی اخذاللہ: اِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ

جب کوئی آدمی شادی کرنا چاہے تو کہے: اللہ نے جو مجھ سے پیمان لیا ہے میں اس کی تجدید کرتا ہوں اور وہ ہے کہ بیوی مناسب طریقے سے رکھوں گا یا نیکی کے ساتھ طلاق دیدوں گا۔

آیت 21 سورۃ النساء میں ہے:

وَكَيۡفَ تَاۡخُذُوۡنَهٗ وَقَدۡ اَفۡضٰى بَعۡضُكُمۡ اِلٰى بَعۡضٍ وَّاَخَذۡنَ مِنۡكُمۡ

اور تم بیویوں کو دیے ہوئے مہر' زور اور سختی کر کے) واپس کیوں لیتے ہو حالانکہ ایک سے دوسرے کے پاس جاچکا اور دونوں ایک

دوسرے سے کام بھی لے چکے، اور بیویوں نے تم سے توسخت قول وقرار لے لیے ہیں۔

شیعہ اور سنی مفسرین کہتے ہیں ''پیمان استوار'' وقول وقرار سے مراد امساک بمعروف اور تسریح باحسان ہے۔ یہی خدا کا پیمان ہے جو مردوں سے لیا گیا ہے۔ یعنی وہ عہد جس کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے تاکید فرمائی کہ شادی کے وقت مرد کو اعتراف واقرار کرنا چاہیے کہ بیوی کی مہذب انداز سے نگہداشت رکھے گا یا حسن وخوبی کے ساتھ چھوڑ دے گا۔

حج وداع کے موقع پر حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ مشہور جملہ فرمایا جو شیعہ سنی دونوں نقل کرتے چلے آئے ہیں:

اتقوالله فی النساء فانکم اخذتم وهن بامانة الله واستحللتم فروجهن بکلمة الله.....................

عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو کیونکہ تم نے ان کو بطور امانت الٰہی حاصل کیا ان کی عصمت ''کلمۃ اللہ'' کے ذریعے حلال کی..................

ابن اثیر نے کتاب النہنایہ میں لکھا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان ''کلمۃ اللہ'' جس سے عصمت خواتین، مردوں پر حلال قرار پاتی ہے، سے مراد وہ جملہ ہے جو قرآن مجید میں باین الفاظ موجود ہے ''اِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ'' ان خواتین کو دستور کے مطابق اچھی طرح رکھو یا بھلائی کر کے چھوڑ دو۔

شیخ الطائفہ کا نظریہ

شیخ ابو جعفر طوسیؒ نے کتاب اخلاف جلد 2 صفحہ 185 پر لکھا ہے۔ جب ثابت

ہوجائے کہ مرد ''عنین'' ہے تو بیوی کو فسخ کا اختیار رہے۔ فرماتے ہیں:

اس بات پر فقہا کا اجماع ہے .... نیز اس آیت سے استدلال بھی اِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ ''عنین چونکہ بیوی کو اچھی طرح نہیں رکھ سکتا، لہٰذا اسے چھوڑ دینا چاہیے۔

ان توضیحات سے بخوبی وقطعی واضح ہوگیا کہ اسلام ہرگز مرد کو زور آوری کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے حق طلاق سے ناجائز فائدہ اٹھائے اور بیوی کو قیدی بنا کر رکھے۔

جو کچھ کہا ہے اس سے یہ بھی نہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو شخص اپنا نام قاضی رکھ لے اسے ان جیسے مسائل میں دخل دینے کا حق مل جائے گا۔ اسلام کے نزدیک قاضی کے شرائط بہت سخت اور وزنی ہیں جن پر گفتگو کی یہ جگہ نہیں ہے۔

ایک اور بات جس پر توجہ رکھنا ہوگی وہ ''عدالتی طلاق'' گھر کی مرکزیت پر اسلام کی خصوصی وجہ اور نگہداشت کے باوجود بڑی مستثنٰی اور نادر و کمیاب مقامات ایسے آئیں گے جہاں قاضی طلاق دے۔ اسلام اس طلاق کا قائل نہیں جو امریکہ اور یورپ میں ہوتی ہے اور وہ اس قسم کی طلاق جائز نہیں جانتا جس کی داستانیں ہم روزانہ اخبار میں پڑھتے ہیں۔ مثلاً ایک عورت نے اپنے شوہر کے بارے میں شکایت کر دی اور طلاق مانگ لی۔ صرف اس لئے کہ جس فلم کو میں پسند کرتی ہوں شوہر پسند نہیں کرتا۔ یا ''فی فی'' صاحب میرے پیارے کتے کو چومتا نہیں اسی قسم کے مضحکہ انگیز قصے جو انسانیت کے زوال کا نمونہ ہیں۔

ناظرین محترم گزشتہ چند مقالات میں جو کچھ عرض کیا ہے اور اکیسویں مضمون میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ طلاق کے سلسلے میں پانچ نظریے ہیں:

۱۔ طلاق معمولی چیز ہے اس پر سے ہر قسم کی پابندیاں اٹھالی جائیں

خواہ معاشرتی بندشیں ہوں یا اخلاقی۔

۲۔ ازدواج ایک ابدی بندھن ہے اور طلاق بالکل ناممکن ہے۔ (کیتھولک چرچ کی رائے)

۳۔ ازدواج مرد کی طرف سے قابل جدائی ہے عورت اس بندھن کو نہیں کھول سکتی۔

۴۔ ازدواج شوہر کی طرف سے خاتمہ پاتا ہے اور خاص شرائط کے ساتھ بیوی بھی یہ بندھن کھول سکتی ہے۔ یہ راستہ میاں بیوی دونوں کیلئے ہے۔ دونوں اس معاملے میں یکساں و برابر ہیں۔ (دعوے داران مساوات حقوق کا نظریہ)

۵۔ طلاق کا راستہ جس طرح شوہر کے لئے کھلا ہے، بیوی کیلئے بند نہیں ہے۔ لیکن میاں بیوی کیلئے نکلنے کے دروازے الگ الگ ہیں۔ میں نے اپنے مضمون میں کہا ہے کہ اسلام پانچویں نظریے کا حامی ہے پھر شرط ضمن عقد اور عدالتی طلاق کے ذیل میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اسلام کا نقطہ نظر بتا دیا کہ ''طلاق فطری حق کے طور پر بیوی کو حاصل نہیں ہے۔ اس کے باوجود اس کیلئے راستہ مکمل طور پر بند بھی نہیں۔ خواتین کیلئے خصوصی دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

عدالتی طلاق، کے بارے میں اس سے زیادہ بحث کی گنجائش ہے، خصوصاً اسلامی فقوں کے علماوفقہا کے خیالات اور تمام اسلامی ملکوں میں عالم مسلمانوں کا رویہ سامنے رکھ کر بات ہوسکتی ہے۔ مگر ہم ان مقالات میں اسی قدر کافی سمجھتے ہیں۔

گیارھواں حصہ

تعدد ازواج

تاریخ زندگی بشر میں بیویوں کی قسمیں۔

اسلام نے جاہلیت کی تین چار قسم کی بیویاں ممنوع کردیں۔

جنسی کیمونزم، ایک بیوی کئی شوہر۔

چند شوہری نظام کیوں ناکام ہوا، اور چند ازواجی نظام رواج پا گیا؟

عورت کیلئے، مرد کے برخلاف خانگی زندگی، مادی پہلو سے زیادہ روحانی ونفسیاتی پہلو رکھتی ہے۔

تعدد ازواج، عورت کا حق ہے، مرد کے حقوق میں نہیں ہے۔

تعدد ازدواج کے تاریخی اسباب۔

کیا تعدد ازواج مشرقی آب وہوا کی پیداوار ہے؟

چند ازواجی ڈھانچہ مغرب میں اور چند ازواجی ڈھانچہ مشرق میں۔

مغرب میں عیاشی کی فراوانی نے تعدد ازواج کو روکا، اس میں دین مسیحی کے ضوابط کا دخل نہیں ہے۔

تعدد ازواج کے معاملے میں، مرد کبھی زور آوری دکھاتا ہے، کبھی قانونی

جواز سے فائدہ اٹھاتا ہے، کبھی بیوی کا حق ادا کرتا ہے۔

چنداز واجی صورت حال میں بیوی کا حق۔

شماریات بولتے ہیں۔

ہمیشہ شادی کے قابل لڑکیوں کی تعداد۔شادی کے قابل لڑکوں کی تعداد سے زیادہ رہتی ہے، کیوں؟

منشور حقوق انسانی نے انسان کے ایک بہت بڑے حق کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے۔

بہ فتوائے اہل حل وعقد انگلستان اگر ''ہودی زن'' ڈاڑھی مونچھ والا ہوتو کئی بیویاں رکھنے کی ممانعت نہیں ہے۔

کیا مرد کی فطرت کا تقاضہ تعدادازواج ہے؟

کہتے ہیں ۔۔مرد قانوناً ایک بیوی کا پابند ہے مگر عملی طور پر چند بیویاں رکھتا ہے۔

خراب معاشرے نے مرد کی خیانت کے اسباب پیدا کیے ہیں، اس کی فطرت نے نہیں۔

بیسویں صدی کے مرد،عورت کے بارے میں اپنی ذمہ داریاں کم کرنے اور اپنی مقصد برآری میں کامیاب ہوگئے۔

بے شوہر خواتین جو بحران پیدا کرتی ہیں وہ ہر بحران سے زیادہ خطرناک ہے۔

''چنداز واجی'' پراعتراضات اورخرابیاں۔

اکثر مردوں کا عقیدہ: خدا ایک، بیوی ایک۔

عشق اور جذبات قابل تقسیم و درجہ بندی نہیں ہیں۔

کئی بیویاں، گھریلو زندگی کو مہر و محبت کے مرکز سے میدان جنگ میں منتقل کردیتی ہیں۔

مرد، اپنی عائلی زندگی کو ایک مرتبہ بیچنے کے بعد دوبارہ کیسے فروخت کرتا ہے؟

کئی بیویوں کے مسئلے میں اسلام کا کردار۔

اسلام نے چند ازواجی کو محدود بھی کیا اور مشروط کیا ہے۔

تعدد ازواج میں دولت اور صحت کی شرط

تعدد ازواج سے آج کے مرد کی نفرت کے اسباب۔

تعدد ازواج کی جگہ اس صدی میں گناہ نے پر کی ہے۔ ''وفا'' نے ہیں۔

(خلاصہ مطالب)

تعدد ازواج

گھریلو زندگی کی فطری شکل ''ایک بیوی'' سے بنتی ہے ۔ایک بیوی کے گھر میں اپنائیت کی روح ،یعنی خصوصی وانفرادی مالکیت کا رواج ہوتا ہے۔ جو دولت کی خاص مالکیت سے جدا شے ہے۔ ایک بیوی کے گھر میں میاں ،بیوی دونوں ۔جذبات ونفسیات ،توجہ اور جنسی فائدے ''اپنے'' اور اپنی ذات سے مخصوص سمجھتے ہیں۔

ایک بیوی والے گھر کے مقابلے میں۔ چند ازواج ۔ یا اشتراکی زوجیت کا نظام ہے۔ چند ازواجی یا اشتراکی زوجیت، چند صورتوں میں فرض کی جاسکتی ہے۔

جنسی کمیونزم

ایک صورت یہ ہے کہ فریقین میں کسی فریق کا دوسرے فریق سے خصوصی تعلق نہ ہو۔ نہ مرد، کسی خاص عورت سے وابستہ ہو، نہ عورت کسی معین مرد کی پابند ہو۔ یہی مفروضہ وہ ہے جسے ''جنسی کمیونزم'' کہا جاتا ہے ۔جنسی کمیونزم ،گھریلو زندگی کی نفی کے مساوی ہے۔ تاریخ بلکہ قبل از تاریخ کے تاریخی مفروضے بھی کسی ایسے دور کی نشان دہی نہیں کرتے جس میں انسان یکسر خاندانی زندگی سے خالی رہا ہو۔ اور جنسی کمیونزم کا رواج ہو۔ جس مدت کو اس نام سے یاد کرتے اور دعویدار بنتے ہیں کہ کچھ وحشی مردوں میں یہ نظام تھا۔ ایک وسطی دور ممکن ہے رہا ہو کہ جسے خاص گھریلو زندگی اور جنسی

کمیونزم کی کڑی سمجھا جا سکتا ہے کہتے ہیں کہ بعض قبائل میں، چند بھائی چند بہنوں سے مشترک طور پر شادی کر لیتے تھے۔ یا مردوں کا ایک گروہ عورتوں کے ایک گروپ سے شرکت کے طور پر شادی رچاتے تھے۔

ویل ڈیورانٹ نے تاریخ تمدن کی پہلی میں (صفحہ 60 پر) لکھا ہے:

بعض علاقوں میں، گروپ کی صورت میں شادی ہوتی تھی۔ یعنی ایک قبیلے کے مردوں کا ایک گروہ، دوسرے خانداں کی لڑکیوں کے ایک گروہ سے شادی کر لیتے تھے۔ مثلاً تبت میں رسم تھی، چند بھائی، اپنی تعداد کے مطابق چند بہنوں سے رشتہ کر لیتے تھے اور کسی کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ کس لڑکی کو کس کی بیوی بننا ہے رشتہ زن وشوہر کا یہ انداز ایک طرح کا جنسی کمیونزم ہے۔ اس مرحلے جو مرد جس عورت سے چاہتا ہم بستر ہو جاتا تھا۔ ''سیزر'' نے اس سے ملتی جلتی رسم کا انگلستان میں تذکرہ کیا ہے۔ ان حادثات کے بچے کچھے نشانات میں ایک رسم بھی ہے کہ بھائی کے مرنے کے بعد بھاوج زندہ بھائی کی بیوی شمار ہونے لگتی تھی۔ یہود اور ان جیسی قدیم قوموں میں اس کا رواج زیادہ تھا۔

افلاطون کا نظریہ

افلاطوں کی کتاب ''جمہوریت'' سے مطلب نکلتا اورمورخ اس کی تائید کرتے ہیں۔۔ وہ اس کا نظریہ خاص ہے ''فلسفی حاکم اور حاکم فلسفی'' اس نے ایک طبقے کیلئے'' گھریلو اشتراکیت'' کی تجویز رکھی ہے انیسویں صدی کے چند کمیونسٹ رہنماؤں نے بھی یہی کہہ دیا۔ فرائڈ اور محرموں سے حرمت ازدواج کے منصف کے بقول 1938ء میں بے شمار تلخ تجربوں کے بعد کچھ طاقتور کمیونسٹ ملکوں نے ''ایک بیوی'' کے نظام کو قانونی صورت دے دی۔

چند شوہری نظام

ازدواجی زندگی کے ضمن میں ایک مفروضہ ''چند شوہری'' ہے۔یعنی ایک عورت ایک وقت میں ایک سے زیادہ شوہر رکھے۔ ویل ڈیورانٹ کے بقول'' یہ رسم تھوڑا جیسے تبتی قبائل میں مشاہدے کے قابل ہے۔''

صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ جاہلی عرب میں چار طرح کی شادیاں رائج تھیں۔

ایک قسم تو وہی ہے جواب تک رائج ہے کہ مرد لڑکی کے باپ کے خواستگاری کرتا ہے اور مہر کے بعد شادی ہو جاتی ہے۔ جو لڑکا پیدا ہوتا ہے وہ باپ کے معین ہونے کی وجہ سے روشن مستقبل رکھتا ہے۔

دوسری صورت یہ تھی کہ شوہر، زمانہ ازدواج کے اندر اپنی بیوی کیلئے کسی دوسرے مرد کو تجویز کرتا تھا کہ وہ دونوں محدود عرصے تک ساتھ رہیں، اس سے وہ ایک اچھی نسل حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یعنی وہ خود کچھ عرصے کیلئے بیوی سے الگ ہو جاتا اور بیوی کو سمجھا دیتا تھا کہ تم فلاں شخص کے ساتھ رہو، جب تک وہ عوت حاملہ نہ ہوتی اس وقت تک وہ شوہر الگ رہتا، جیسے ہی بیوی کا حاملہ ہونا معلوم ہو جاتا فوراً اس سے رابطہ پیدا کر لیتا تھا۔ یہ عمل اس شخص کیلئے ہوتا جسے شوہر تولید فرزند کیلئے اپنے سے بہتر سمجھتا تھا۔ دراصل یہ کام نسل کی بہبود اور خاندان کی اصلاح کیلئے انجام پاتا تھا۔ ایک شوہر کے ہوتے ہوئے دوسرے شوہر کے ساتھ میاں بیوی جیسے روابط کا نام۔۔ نکاح استبضاع۔۔تھا۔

تیسری صورت یہ تھی کہ دس آدمیوں سے کم ایک ٹولہ، ایک عورت سے ربط پیدا کرتے، جب اس کے یہاں بچہ ہوتا تو وہ اس ٹولہ کو بلاتی۔ اس عہد کے دستور کی

بنا پر وہ مرد آنے سے انکار نہیں کر سکتے تھے،سب حاضر ہو جاتے ۔وہ عورت ان میں جس مرد کو چاہتی نومولود اس کے نام کر دیتی اور وہی اس کا قانونی باپ قرار پاتا، پھر اس مرد کو انکار کا حق نہ رہتا تھا۔

چوتھی قسم ۔۔ایک عورت ''طوائف'' تسلیم کر لی جاتی تھی، بلا استثناء ہر مرد اس سے رابطہ پیدا کر سکتا تھا۔ان عورتوں کے مکان پر ایک جھنڈی لگی ہوتی تھی یہی ان کی پہچان تھی ۔ایسی عورتوں کے یہاں جب بچہ پیدا ہوتا اس کے بعد وہ اپنے یہاں آنے جانے والے مردوں کو جمع کرتیں کاہن او قیافہ شناس بلاتیں، وہ قیافہ اور علامات دیکھ کر اپنی رائے بتاتے تھے کہ اس بچے کو فلاں کیا ولاد ہونا چاہیے وہ مرد مجبور ہو کر قیافہ شناس کا فیصلہ مانتا اور وہ اولاد قانونی ورسمی طو پر اس شخص کی اولاد قرار پاتی تھی۔

یہ جاہلیت کے ازدواجی اقسام اس وقت تک رہے جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث نہ ہوئے تھے،آنحضرتؐ نے چند اقسام کے سوا سب کو ختم کر دیا۔

معلوم ہوا کہ ''چند شوہری'' کی رسم جاہلیت عرب میں جاری تھی ''مان ٹسکو'' روح قانون میں لکھتا ہے۔

''ابوظہیر حسن ایک عرب سیاح ،نویں صدی عیسوی میں ہندوستان وچین گیا تو اس نے ''چند شوہری'' کی رسم دیکھی اور اسے عیاشی کا ثبوت قرار دیا''۔۔اسی نے کہا ہے۔''مالابار کے ساحلوں پر'' نائیر'' نامی قبیلہ رہتا ہے۔اس قبیلے میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت نہیں،حالانکہ عورتوں کئی شوہر رکھ سکتی ہیں میرے نزدیک اس قانون بنانے کی وجہ یہ ہوگی کہ نائیر قبیلے کے مرد بڑے جنگجو ہوں گے،اور اپنی اصالت کی بنا پر جنگ ان کا پیشہ ہوگی ،اور جیسے ہم یورپ میں فوجیوں کو شادی سے روکتے ہیں تا کہ تاھلی زندگی ان کی پیشہ وارنہ جنگی مصروفیت کو نہ روکے، مالابار کے قبیلہ نائیر کو بھی گھریلو رشتوں سے آزاد رکھا گیا ہوگا، وہاں کی آب وہوا میں گرمی ایسی تھی کہ انہیں شادی سے روکنا بالکل

ممکن نہ تھا، لہٰذا یہ طے کیا گیا ہوگا کہ چند آدمی مل کر ایک عورت رکھ لیا کریں۔ اس طرح گھریلو رشتہ کمزور رہے گا اور پیشہ وارنہ کام میں رکاوٹ پیدا نہ ہوگی۔''

''چند شوہری'' نظام مشکلات

چند شوہری نظام میں بنیادی بڑی مشکل یہ پیدا ہوگی کہ نسب کا تعین ختم ہوگیا یہی سبب اس رسم کے بروئے کار آنے میں رکاوٹ بنا، شاید اس دستور کی ناکامی اسی بنا پر عمل آئی۔ اس قسم کی ناھلی زندگی میں باپ کا بیٹے سے رشتہ عملی طور پر معین نہ ہوسکتا تھا۔ جیسے جنسی کمیونزم میں باپ بیٹے کا رشتہ عملاً غیر معین ہے۔ اور جس طرح جنسی کمیونزم اپنا رستہ نہ کھول سکا، یونہی چند شوہری رسم بھی حقیقی معاشرے میں قابل قبول نہ بن سکی۔ ہم نے گزشتہ سلسلہ مقالات میں لکھا ہے کہ آنے والی نسل کیلئے گھریلو زندگی اور آشیانہ کی تعمیر ضروری ہے اس سے گزشتہ اور آئندہ نسل میں رشتہ استوار ہونا فطری بشری کا ایک جبلی تقاضہ ہے۔ یہ جو کبھی کبھی یا کہیں کہیں، کچھ انسانی گروہوں یا قبیلوں میں ''چند شوہری'' رسم ملتی ہے وہ مرد کے جذبہ تشکیل خاندان کی خاص ہیئت کی دلیل نہیں بن سکتی۔ اسے فطرت مرد کا فطری تقاضہ مان لینا صحیح نہیں ہے۔ جیسے کچھ مردوں یا چند عورتوں کا، شادی سے پرہیز اور عائلی زندگی سے علیحدگی، فطرت سے انحراف تو ہے مگر اس میں اتنی صلاحیت نہیں کہ اسے انسان کی فطری خانگی خواہش زندگی کے خلاف دلیل بنالیا جائے۔ چند شوہری رسم، مرد کی خواہش انفرادیت وانحصار طلبی واولاد دوستی ہی کے خلاف نہیں، خود عورت کی فطرت سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔ نفسیاتی مطالعات وتحقیق نے ثابت کردیا ہے کہ عورت مرد سے زیادہ ایک رفیق حیات چاہتی ہے۔

تعدد ازواج

چند رفقاء زندگی کی ایک شکل ''چند زنی'' یا ''تعدد ازواج'' ہے۔ چند بیویوں یا تعدد ازواج کی رسم نے جنسی کمیونزم اور چند شوہری نظام سے زیادہ رواج حاصل کیا۔ یہ دستور فقط وحشی قبیلوں میں ہی نہ تھا، اسے تو متمدن قوموں نے بھی اپنایا، عرب جاہلیت، یہود اور ساسانی عہد میں ایرانی قوم بلکہ دوسری قوم میں بھی یہ رسم وقانون موجود تھا۔ مان ٹسکو نے لکھا ہے۔ مالدیو قوموں میں تین بیویاں رکھنے کی اجازت تھی۔ اسی مصنف کے بقول۔ والنٹینین (VALENTINIAN) شہنشاہ روم نے خاص حالت میں مردوں کو کئی بیویاں رکھنے کی اجازت دی تھی۔ لیکن یورپ کی جغرافیائی آب وہوا کی نامناسبت تمام رومی بادشاہوں کی اس قانون پر آمادہ نہ کر سکی اور تھیودوس۔ ارکیڈیس۔ اور ''ہونوریس'' نے اس قانون کو ختم کر دیا۔''

اسلام اور تعدد ازواج

اسلام نے ''چند شوہری'' کے برخلاف، چند زنی یعنی چند ازواجی نظام کو مکمل طور پر منسوخ ومعطل نہیں کیا البتہ اس میں حدبندی اور پابندی لگا دی، یعنی ایک سمت نامحدودیت کو ختم کیا دوسرے طرف زیادہ سے زیادہ کی چار مقرر کر دی۔ پھر ضابطے اور شرطیں بڑھائیں نیز ہر شخص کو اجازت نہیں دی کہ متعدد بیویاں کرتا پھرے۔ آئندہ ہم گفتگو کریں گے کہ اسلام نے کیا شرائط وضوابط بنائے اور کیوں تعدد ازواج کو ختم نہ کیا۔

حیرت ہے کہ گزشتہ صدیوں اسلام کے خلاف پروپیگنڈا مہم چلتی رہی کہ پیغمبر اسلامؐ نے تعدد ازواج کی رسم ایجاد کی ہے۔ وہ لوگ دعوے کرتے پھرتے

تھے۔اسلام کی بنیاد تعدداز واج ہے۔ اسلام دنیا کی مختلف قوموں میں اتنی جلدی پذیرائی کی وجہ کئی بیویاں رکھنے کی اجازت تھی۔ یہ بھی دعوے کرتے تھے کہ مشرق کے زوال کا باعث بھی تعدداز واج ہے۔

تاریخ تمدن، جلد 1 صفحہ 61 پر ویل ڈیوارانٹ نے لکھا ہے: ''وسطی صدیوں میں مذہبی عالم یہ تصور کیے ہوئے تھے کہ تعدداز واج پیغمبر اسلامؑ کی ایجاد ہے درآں حالیکہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ابتدائی معاشروں میں ہم میں رفیق زندگی کے بارے یہی رویہ موجود تھا۔ایسے اسباب وعلل بہت ہیں کہ اس دور میں بیویوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ جیسے مرد جنگ وشکار میں مصروف رہتے تھے لہٰذا ان کی زندگی خطرے میں ہوتی اور مردوں کی موت عورتوں سے زیادہ ہوتی تھی۔ نتیجہ میں عورتوں کی تعداد میں اضافے کا حل ایک تو تعدداز واج تھا یا پھر بہت سی عورتوں کو بے شوہر و وارث رہنے دیا جائے۔لیکن جن قوموں میں موت کی فراوانی ہو وہاں کوئی مناسب بات نہ تھی کہ عورتوں کی ایک نمایاں تعداد بلا شوہر رہے اور تولید مثل کا عمل نہ ہو.................. بلاشبہ ابتدائی دور میں تعدداز واج ایک مناسب دستور تھا، کیونکہ عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ تھی، پھر نسل کی بہبود کیلئے بھی نظام تعدداز واج آج کے نظام یک زن سے زیادہ مفید تھی۔سب جانتے ہیں کہ مضبوط وتوانا، طاقت ور اور محتاط مرد آج کی دنیا میں مدت بعد شادی کرتے ہیں،اس کے برخلاف گزشتہ زمانے میں طاقت ور افراد بظاہر اچھی عورتیں آسانی سے حاصل کر لیتے اور زیادہ بچے پیدا کرتے تھے۔اسی بنا پر شروع میں متعدد قبائل بلکہ متمدن اقوام میں تعدداز واج کا سلسلہ مدتوں جاری رہا۔اور ابھی کچھ دنوں سے ہمارے زمانے میں یہ رسم ہمارے مشرق سے کم ہوتی چلی گئی ہے۔دراصل اس کے زوال میں متعدد عوامل کارفرما ہیں:

کاشتکاری کی فراوانی، اس نظام نے مردوں کی بھاری اور خطرناک زندگی کو

نسبتاً پرسکوں اور پائدار بنادیا ہے۔عورتوں کی تعداد بھی کم وبیش مردوں کے برابر آ گئی ہے۔ان حالات میں ''چندزنی'' کی بات یا تو ابتدائی معاشرے کی بات قرار پا گئی ہے۔یا پھر مٹھی بھر دولت مندافراد کے خصوصیات میں شمار ہونے لگی ہے۔ اور''زنا'' کا مشغلہ منہ کا مزہ بدلنے کیلئے ہے۔''

تاریخ تمدن،صفحہ 507 پر گوستاولوین نے لکھا ہے:

''یورپ میں مشرق رسم ورواج میں تعدداز واج سے زیادہ برے پیرائے میں اور کسی چیز کا تعارف نہیں کرایا گیا ہے۔اہل مغرب کا نقطہ نظر کسی رسم کے بارے میں اس قدر غلط نہیں جتنا اس مسئلے میں غلط ہے،یورپی منصف تعدداز دواج کوسلام کی بنیاد جانتے اور اسلام کی ترویج ،نیز مشرقی اقوام کے زوال وانحطاط کا اہم ترین سبب مانتے رہے ہیں۔ اعتراضات کی بوچھار کے ساتھ ،یہاں کی خواتین سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہا۔ بدنصیب عورتیں سخت اور اکھڑ خواجہ سراؤں کے ہاتھ گھروں کی چاردیواریوں میں اسیر رہتی ہیں، اگر کوئی بات گھر کے ان رکھوالوں کی مرضی کے خلاف ہوجاتی ہے تو جاں کے لاے پڑجاتے اور ممکن ہوتا ہے کہ بڑی بے رحمی سے قتل کردی جائیں مگر یہ ایسے تصور ہیں جن کا کوئی ثبوت یا بنیاد نہیں ۔ہماری کتاب کے مغربی قاری اگر تھوڑی دیر کیلئے تعصب کو دور کرسکیں تو انہیں تائید کرنا پڑے گی اور مشرقی تمدن کی خوبی تسلیم کریں گے کہ اس میں کئی بیویاں رکھنے کی اجازت ہے ،جن گھرانوں میں یہ رسم موجود ہے ان میں اخلاقی روح ترقی پذیر ہے ۔اور عائلی رشتے مستحکم ہیں اسی رسم کے نتیجے میں عورت کا اعزاز واکرام مغرب سے زیادہ ہے،ہم اس دعوی پر دلیل لکھنے سے پہلے یہ بتادیں کہ تعدداز وزج کا تعلق ہرگز اسلام ہی سے نہیں اسلام سے پہلے بھی رسم مشرق اقوام میں پائی جاتی تھی ،یہود ایرانی ،عرب وغیرہ جوقومیں اسلام لائیں انہوں نے اس بارے میں کوئی نیا فائدہ نہیں اٹھایا ،آج تک

دنیا میں کوئی مذہب ایسا بااقتدار وجود پذیر نہیں ہوا جو تعدد ازواج جیسے رسوم کو ایجاد یا منسوخ کر سکے۔ مذکورہ رسم مشرق آب و ہوا کا نتیجہ ہے، اس کی وجہ سے کچھ نسلی خصوصیات تیز دوسرے اسباب وعلل جنم لیتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا تعلق مشرق کی آب و ہوا اس رسم کیلئے ساز گار نہیں اور وہاں اس کے تقاضے موجود نہیں ہیں اس کے باوجود ایک بیوی وہاں کی رسم ہے قانونی کتاب میں تو پڑھتے ہیں ورنہ مجھے تو باور نہیں کہ ہمارے معاشرے میں کوئی یہ کہہ سکے کہ ''ایک بیوی'' کا کوئی اثر ہو۔ سچ مچ مجھے حیرت ہے مجھے نہیں معلوم کہ مشرق کی متعدد جائز بیویوں کے مقابلے میں یورپ کی مکارانہ بہت سی بیویوں میں کیا کمی ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ پہلا نظام دوسرے نظام سے بدرجہا بہتر و شائستہ ہے۔ اہل مشرق جب بڑے شہروں کی سیاحت کو آتے ہیں اور ہمارے اعتراضات یا حملوں سے دوچار ہوتے ہیں تو انہیں حیرت ہوتی اور غصہ آتا ہے..................

ہاں اسلام نے ''تعدد ازواج'' کا نظام ایجاد نہیں کیا، مگر اسے ایک سمت سے محدود کر کے اکثریت کی تعداد ضرور مقرر کی۔ دوسری سمت، بھاری شرطیں لگادیں۔ جو قومیں مسلمان ہوئیں ان کے یہاں عموماً یہ رسم تھیں، اسلام کے ذریعے وہ حدود کا گردن بند پہننے پر ضرور مجبور ہوئی ہیں۔

ایران میں تعدد ازواج

کریسٹن سن کے ''ایران ساسانیوں کے عہد میں'' صفحہ 346 پر لکھتا ہے:

''(ساسانیوں کے زمانے میں (یران کے اندر) متعدد بیویوں ہی سے خاندوادہ تشکیل پاتا تھا، مرد کی استطاعت کے لحاظ سے عورتوں کو رکھنے کا حق تھا۔ بظاہر غریب لوگ ایک ہی بیوی کرتے تھے۔ خاندان کا سربراہ، کنبے کی سربراہی سے

بہرہ ور ہوتا تھا۔ بیویوں میں محترم ومحبوب خاتون تمام حقوق کی مالک ہوتی اوراس کو''زن پادشاییہا''(باشاہدزن) یا''زن ممتاز'' کہتے تھے اس کے کم درجہ عورت خدمت گار''زن چگاریھا'' کہلاتی ،ان دنوں درجے کی بیویوں کے حقوق جدا جدا تھے۔ بظاہر زرخرید کنیز اورقیدی عورتیں نوکر بیویاں سمجھی جاتی تھیں ممتاز بیویوں کے بارے میں یہ نہیں معلوم کہ ایک مرد کے یہاں محدود تھیں یانہیں؟ لیکن متعدد قانونی حوالوں میں ایک شوہر کی دوممتاز بیویوں کا اشارہ تو ملتا ہے۔اس درجے کی بیویاں خانہ دارمعلوم ہوتی ہیں ،گویاان کے الگ الگ گھر ہوتے تھے۔ شوہر،زندگی بھرزن ممتاز کوآذوقہ دینے کا پابند تھا۔اوراسکی دیکھ بھال کرتا،لڑکا،بالغ ہونے اورلڑکی شادی ہونے تک یہی حق رکھتی تھی، چاکرزن قسم کی بیویوں کی اولادمذکورباپ کے خاندان میں قبول کی جاتی تھیں۔''

''تاریخ تمدن ایران ازانقراض ساسانیوں تاانقراض امویاں''میں سعید نفیسی مرحوم نے لکھاہے:

''مرد لامحدودبیویاں رکھ سکتا تھا، بعض یونانی دستاویزوں سے معلوم ہوتاہے کہ ایک آدمی کے گھرمیں سوبیویاں بھی ہوتی تھیں۔''

مان ٹسکو نے''روح القوانین''میں''اکوٹیٹس''رومی مورخ سے نقل کیا ہے جسٹی ٹین ،کچھ رومی فلسفی مسیحوں کے ہاتھ اذیت وتکالیف کا نشانہ بنے ،یہ لوگ عیسائی مذہب قبول کرنے پرتیارنہ تھے ۔آخران لوگوں نے روم کوچھوڑ دیااورخسرو پرویز بادشاہ کے دربار میں پناہ گیرہوئے۔ یہاں پہنچ کرجس بات نے انہیں حیرت سے وہ چارکیا،ہویہی نہیں کہ تعددازدواج کی رسم پائی جاتی تھی ۔انہوں نے دوسروں کی بیویوں سے اختلاط بھی دیکھا۔''

یہ بات ذہن میں رہے کہ رومی فلاسفہ نوشیروان باشادہ ایران کے دربار

میں حاضر ہوئے تھے،خسرو پریز کے یہاں نہیں ،مان ٹسکو کے یہاں خسرو پرویز کا نام غلط فہمی پر مبنی ہے۔

عربوں میں بیوی کی تعدد کا حساب وشمار ہی نہ تھا، اسلام کا اس پر بند باندھنا اور زیادہ کی تعدد معین کرنا، ان عربوں کیلئے مشکل بن گیا جن کی بیویاں چار سے زیاد تھیں ، کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کی دس بیویاں تھیں وہ چھ بیویوں کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

معلوم ہوا کہ اسلام نے تعدد ازواج کی رسم ایجاد نہیں کی ،اس کے برعکس اس رسم پر حدو بندش عائد کی ،اسے یکسر ختم بھی نہیں کیا۔آئندہ گفتگو میں ہم دیکھیں گے کہ تعدد ازواج کی وجہ فراد بشر میں کیا ہے؟ کیا اس کی علت وجہ مرد کی زورآوی اور عورت پر حکومت کرنے کا جذبہ ہے، یا خاص ضرورتیں تھیں جن کی وجہ سے یہ عمل ضروری ہوا؟ وہ ضرورتیں کیا تھیں؟ کیا ان کا تعلق جغرافیائی حالات سے ہے یہی اور طرح کے تقاضے تھے؟اسلام نے اس رسم کو بالکل ختم کیوں نہ کیا؟ اسلام نے تعدد ازواج پر کیا بندشیں لگائیں ہیں؟ آخر آج مرد وزن دونوں تعدد ازواج کے خلاف کیوں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں؟ اس کے پس منظر میں انسانی واخلاقی بنیاد ہے یا دوسرے اسباب وعلل کارفرما ہیں؟

یہ مطالب ہیں جن پر ہم گفتگو کریں گے۔

تعدد ازواج کے تاریخی اسباب (۱)

تعدد ازواج کے تاریخی اور سماجی وعلل وسباب کیا ہیں؟

اس رسم کو بہت سی قوموں نے قبول کیا خصوصاً مشرق اقوام وملل نے اور کچھ قوموں نے اسے قبول نہیں کیا خصوصاً، مغربی قوام وعلل نے اس کی وجہ کیا ہے؟

تین قسم کے جنسی روابط میں ۔ چند ازواجی صورت نے کیوں رواج وقبولیت حاصل کی، اور چند شوہری اور جنسی اشترا کیت کے نظام یا تو نافذ ورائج ہی نہ ہو سکے یا اکا وکا وقوع پذیر ہوئے ایسا کیوں ہے؟

جب تک ان اسباب وعلل کی چھان بین نہ ہو، ہم اسلام کے نظریہ تعدد ازواج پر بحث نہیں کر سکتے اور نہ آج کے انسان کی ضرورت کے بارے میں گفتگو ممکن ہے۔

اگر ہم ان لاتعداد مطالعات کو نظر انداز کر دیں۔ جو نفسیاتی اور معاشرتی سلسلے میں کیے گئے ہیں اور بہت سے مصفنین کی طرح سطحی طور پر سوچنا کافی سمجھیں تو سماجی اور تاریخی عوامل واسباب تعدد ازواج پر وہی مشہور ''ترجیح بند'' دھرانا ہوگا جو اس قسم کے مسائل میں ہمیشہ دھرایا جاتا ہے کہ

تعدد ازواج کی علت بہت واضح وروشن ہے۔ اس کی علت ووجہ مرد کی زور آوری اور تسلط طلبی اور عورت کی کنیزی اس کا سبب ہے۔ اس رسم کی علت پدر شاہی

ہے چونکہ مرد عورت پر بالا دستی اور حکمرانی رکھتا ہے اس لئے اپنے فائدے کے رسم ورواج ڈھالتا اور بناتا رہتا ہے۔''چندزنی'' کی رسم بھی اس نے اپنے نفع اور عورت کے نقصان کیلئے صدیوں سے بنارکھی ہے۔عورت چونکہ مرد کی محکوم تھی لہٰذا وہ ''چندشوہری'' کی رسم اپنے نفع کی خاطر جاری نہ کرسکی۔ اب مرد کی طاقت آزمائی کا دور ختم ہوگیا ہے لہٰذا ''چندزنی'' کا طرہ امتیاز چھین لیا جائے گا اور اس غلط امتیازی رویے کی جگہ زن ومرد کو برابر کے حقوق دیے جائیں گے۔

اگر ہم یوں سوچنے لگیں تو بڑی سطحی اور گھٹیا بات ہوگی۔۔''چندزنی'' رسم کے رواج پانے کا سبب نہ تو مرد کی زورآوری ہے نہ ''چندشوہری'' نظام کی ناکامی کی وجہ عورت کی محکومیت وکمزوری۔ نہ یہ حقیقت ہے کہ آجکل مرد کی زورآوری کا دورختم ہوگیا ہے لہٰذا ''تعدداز واج'' کا دستور منسوخ ہورہا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ ''ترک تعدداز واج'' سے مرد نے واقعتاً اپنا امتیاز ضائع کردیا ہے۔ بلکہ واقعتاً مرد نے عورت کے خلاف آج ایک امتیاز مزید حاصل کرلیا ہے۔

میں ''روز وقدرت'' کو تاریخ بشر بدلنے والے عامل تسلیم نہیں کرتا۔ میں اس نظریہ کا منکر بھی نہیں کہ مرد نے اپنی قوت کے سہارے عورت سے غلط فائدہ اٹھایا ہے۔مگر میرا یہ عقیدہ ضروری ہے کہ طاقت واقتدار کو اکیلا عامل سمجھنا، خصوصا گھریلو زندگی اور میاں بیوی کے رشتوں اور رویوں میں کوتاہ نظری ہے۔

اگر مذکورہ بالا نظریہ صحیح ہے تو لازمی طور پر ماننا پڑے گا کہ جب اور جہاں ''چندشوہری'' کی رسم عملی تھی۔ جیسے جاہل رب اور بقول مان ٹسکو ، ملایا کے ساحلوں میں نائیر قبیلہ۔۔ وہاں ایک دور ایسا تھا، جب عورت کو موقعہ ملا، اور اس نے مرد کے خلاف اقتدار حاصل کرلیا تھا۔اس لئے ''چندشوہری'' نظام مردون پر مسلط کردیا، وہ دور خواتین کا ''طلائی دور'' ہے۔حالانکہ جاہلیت عرب کا دور سب کے نزدیک عورت کی

زندگی کا تاریک ترین عہد تھا۔ ہم نے گزشتہ مقالے میں مان ٹسکو کا مطالعہ نقل کیا جس میں اس کے بقول ''چند شوہری'' کی رسم نائیر قبیلے میں رائج ہونے کا سبب عورت کی عزت قوت نہیں بتائی گئی بلکہ اس رسم کے رائج کرنے کی علت یہ کہی گئی ہے کہ وہاں کے لوگ فوجیوں کو گھریلو زندگی کے بندھن سے آزاد رکھ کران کے فوجی جذبہ وکردار کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

اس کے علاوہ سوچنے کی بات ہے کہ اگر تعدد ازدواج کی وجہ ''پدرشاہی'' اور ''پدرسالاری'' ہے تو اس کا رواج مغربی اقوام میں کیوں نہ ہوا؟ کیا ''پدرشاہی'' نظام سرزمین مشرق سے مخصوص تھا۔مغربی باشندے اس وقت بھی ''عیسی مزاج'' و''مریم سرشت'' تھے۔وہ لوگ شروع ہی سے عورت کیلئے مرد کے مقابل اور مساوی حقوق جانتے تھے؟ کیا فقط سرزمین مشرق ہی میں مرد کی قوت کا سبب مرد کے نفع کا انتظام کرتا رہا، اور مغرب میں اس عامل وسبب کا رویہ عادلانہ ومنصفانہ رہا ہے؟

مغربی عورت نصف صدی پہلے تک بدنصیب ترین خواتین عالم تھی ۔وہ اپنی ذاتی املاک ودولت میں بھی مرد کی سربراہی (قیمومیت) کی محتاج تھی۔خود اہل مغرب کے بقول قرون وسطیٰ میں مشرق عورت کی حالت مغربی عورت سے بہت اچھی تھی۔ گوستادلوبن نے لکھا ہے: اسلامی تمدن کے دور میں خواتین کو بعینہٖ وہی درجہ ومقام حاصل تھا جو مدت مدید کے بعد یورپی خواتین کو حاصل ہوا یعنی عربوں کے اس دلیرانہ کردار کے بعد جس نے یورپ میں ان کے خلاف پر پیگنڈے کی بنیاد رکھی .... بہادرانہ اخلاق جس کا ایک جزا حسین خواتین سے حسن سلوک ہے۔اہل یورپ میں مسلمان کے ذریعہ پہنچے، مغربی باشندے نے مسلمانوں کی تقلید کی ۔ جو مذہب، عورت کو پست درجے اور مقام ذلت سے اوج ،عزت وسربلندی تک لا سکا وہ اسلام ہے، عیسائیت نہیں ہے۔ جسے عام لوگ سمجھتے ہیں۔ کیونکہ قرون وسطی میں ہمارے

لیڈراور بڑے رہنما عیسائی تھے اس کے باوجود احترام خواتین کا خیال نہ رکھتے تھے۔ قدیم تاریخی کی چھان بین سے اس بارے میں **شبہے** کی گنجائش نہیں رہی کہ ہمارے بزرگوں کو مسلمانوں کی تعلیم احترام خواتین سے پہلے ہمارے امراو سردار عورت سے انتہائی وحشایانہ سلوک کرتے تھے۔

دوسرے منصفین نے بھی کم وبیش اس دور کے مغربی حالات کی ایسی ہی تشریح کی ہے۔ان حالات کے ہوتے ہوئے ، جب قرون وسطی میں ''پدرشاہی'' وقوت وزبردستی حکومت کا عروج تھا، تعدد ازواج کی سم پھر رائج کیوں نہ ہوئی؟

حقیقت یہ ہے:

جہاں ''چندشوہری'' نظام موجود تھا، وہاں عورت کو مہلت اقتدار اور جہاں نظام چندشوہری نہ چل سکا وہاں سبب اصلی خواتین کی کمزوری نہیں تھا۔

مشرق میں تعدد ازواج ،مرد کی بالادستی وحکومت یا مغرب میں تعدد ازواج کا نہ پایا جانا،مردوزن کی مساوات کا نتیجہ نہیں ہے۔

چندشوہری نظام کی ناکامی کی وجہ

چندشوہری رسم کی شکست کا سبب یہ ہے کہ یہ رسم ودستور نہ مرد کی فطرت کے مطابق ہے نہ عورت کی طبیعت سے ہم آہنگ پہلی بات کہ فطرت مرد کے خلاف ہے ،مطلب یہ ہے کہ مرد انحصار طلب اور بیوی کو فقط اپنا دیکھنا چاہتا ہے چندشوہری اس تقاضے سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ رسم چندشوہری اطمینان پدری برشتہ فرزندی کی بنیاد کے خلاف ہے۔انسان کا طبیعی وفطری تعلق اولاد سے بہت گہرا ہے۔انسان فطرتاً توالدوتناسل چاہتا ہے۔اس کی خواہش رہتی ہے کہ نسل آئندہ اورنسل گزشتہ سے اس کا سلسلہ معین اوراطمینان بخش ہو۔

وہ جاننا چاہتا ہے کہ کس بیٹے کا باپ اور کس باپ کا فرزند ہے۔ چند شوہری عورت آدمی کے اس فطری مطالبہ سے جوڑ نہیں کھاتی تھی۔ بخلاف ''چندزنی'' نظام کے اس رسم میں نہ مرد کو چوٹ لگتی تھی نہ عورت..................

کہتے ہیں تقریباً چالیس خواتین کا وفد حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھنے لگا کہ اسلام نے مردوں کو کئی عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت کیوں دی اور خواتین کو چند شوہر کرنے کی اجازت کیوں نہیں دی؟ کیا یہ درجہ بندی کی بات نہیں ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے کچھ چھوٹے پانی بھرے برتن طلب کئے اور وہ برتن ان خواتین کو دئے۔ پھر حکم دیا کہ ہر ایک اپنے ہاتھ کے برتن کا پانی سامنے رکھے ہوئے بڑے برتن میں انڈیل دے، سب نے تعمیل حکم کی، اس کے بعد فرمایا کہ اب ہر ایک اپنے اپنے انڈیلے ہوئے اصل پانی کو دومرتبہ کوشش کر کے اپنے برتن میں نکالو۔۔ سب نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ پانی ایک دوسرے میں مل چکا اسے مشخص ومعین کرنا ناممکن ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا: اگر ایک عورت کئی شوہر کرے تو ہر ایک سے ہم بستری بھی ہوگی جب حمل ہوگا تو وہ کیسے مشخص ومعین کر سکے گی کہ بچہ کس شوہر کی نسل سے ہے۔۔ یہ بات ہوئی مرد کے زاویے سے۔

عورت کے زاویے سے دیکھیے۔۔ چند شوہری سسٹم، فطری زن اور اس کے منافع کے خلاف ہے۔ بیوی اپنے شوہر سے فقط جنسی آسودگی ہی نہیں چاہتی، جو یہ کہا جائے کہ جتنے زیادہ شوہر ہوں گے اتنا ہی اچھا ہے۔ بیوی ایک ایسا وجود چاہتی ہے وہ جس کے دل کو اپنائے اسے اپنا حامی ومحافظ بنائے جو اسے ہر ناپسند بات سے بچائے اور وہ خود اس پر جاں نثار کرے، محنت کرے اور اس سے دولت حاصل کرے، حاصل محنت ومشقت اس پر قربان کرے، غمخوار وہمدرد ہو۔ ایک طوائف کو مرد جو روپیہ

دیتا ہے یا وہ پیسہ جو عورت ،محنت مزدوری کر کے حاصل کرتی ہے، وہ عورت کے وسیع اخراجات وضروریات کے لئے ناکافی ہوتے ہیں۔اس کے اخراجات ایک مرد سے کئی گنا زائد ہوتے ہیں۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس آمدنی کا مقابلہ اس دولت سے کہاں ،جو دولت ایک مرد بیوی کے عشق ومحبت کی بنیاد پر پیش کرتا ہے۔شوہر جو مال ودولت اپنی بیوی کے ضروریات کیلئے خرچ کرتا ہے وہ ایک فداکار کے انداز میں صرف کرتا ہے۔گھریلو زندگی کی مرکزیت اور رفیق حیات واولاد کی محبت وکشش ،شوہر کو شوق دلاتی ہے کہ وہ اس سلسلے میں کارکردگی وفداکاری کو باقی رکھے۔

ای عورت کئی شوہروں کے ہوتے ہوئے ایک مرد جیسی حمایت ومحبت ومخلصانہ جذبات وفداکاری حاصل کر سکے،اسی لئے ''چند شوہری'' سسٹم کو طوائف پیشگی کی طرح قابل نفرت سمجھا گیا ہے۔لہٰذا ''چند شوہری'' رسم نہ مرد کے رجحانات کے مطابق ہے نہ عورت کے جذبات ورجحانات سے ہم آہنگ ہے۔

جنسی اشتراکیت کی شکست

جنسی اشتراکیت کی ناکامی کی علت بھی یہی ہے جنسی اشتراکیت میں اختصاص ختم ہوجاتا ہے نہ عورت کسی معین مرد سے اختصاص رکھتی ہے نہ مرد کسی معین عورت سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہی تجویز افلاطون نے پیش کی تھی، یہ بات ضرور ہے کہ اس نے طبقہ حاکمہ کی سطح پر اسے سوچا تھا۔یعنی یہ دستور (اس کی زبان واصطلاح میں) فلسفی حاکم اور حاکم فلسفیوں کیلئے ہونا چاہیے۔افلاطون کی یہ تجویز نہ دوسروں کے نزدیک منظوری کے لائق تھی نہ خود افلاطون اس نظریہ پر باقی رہا ،اس نے بھی رائے بدل لی۔

ایک صدی قبل فارڈریک انجلس ،کمیونزم کے دوسرے باپ نے بھی یہی

تجویز رکھی اور اس کے خلاف نظریوں اور دلیلوں کو رد کیا، لیکن کمیونسٹ بلاک نے اسے منظور نہ کیا۔ کہتے ہیں کہ شوروی حکومت (روس) نے بے شمار تلخ تجربوں کے بعد عائلی اشتراکی تھیوری جو انجلس نے بتائی تھی اسے 1938ء میں بدل دیا اور کچھ قوانین گھریلو زندگی کی فلاح و بہبود کے واسطے وضع کر کے ایک شوہر ایک بیوی کا قانون کمیونسٹ حکومت کا رسمی قانون مان لیا۔

ایک شوہر کیلئے کئی بیویاں امتیازی بات مانی جاسکتی ہے لیکن ایک بیوی کے واسطے چند شوہر کوئی اعزاز نہ پہلے مانا گیا نہ آئندہ مانا جائے گا۔ اس فرق کا باعث یہی ہے کہ مرد عورت کی ذات چاہتا ہے اور عورت مرد کا دل اور اس کی فداکاری کی طلب گار ہے۔ مرد جب تک بیوی کی ذات پر اختیار رکھتا ہے اس وقت اس سے اس کا دل دے دینے سے کوئی دلچسپی نہیں، لہٰذا ایک سے زیادہ بیویاں اگر اسے اپنا دل نہ دیں تو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اس کے مقابلے میں بیوی شوہر کے دل اور توجہات کو اصل سمجھتی ہے۔ اگر وہ ہاتھ سے دے دیتی ہے تو سب کچھ ضائع کر دیتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں----ازدواجی زندگی میں دو عنصروں کا دخل ہوتا ہے ایک مادی دوسرا روحانی----مادی عنصر ازدواج جنسی پہلو لیے ہوتا ہے جوانی میں یہ پہلو جوش وعروج پر ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ کم ہوکر ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ روحانی عنصر (معنوی ونفسیاتی حصے) میں وہ نرم ولطیف جذبات اور خلوص ومحبت کی حکمرانی ہوتی ہے جو کبھی تو وقت گزرنے کے ساتھ بڑی مضبوط ہوجاتی ہے۔ عورت ومرد کے درمیان جو فرق ہیں، ان میں سے ایک فرق یہی ہے کہ عورت کی نظر میں دوسرا عنصر زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور مرد کے خیال میں پہلا عنصر، ورنہ کم از کم مرد کی نظر میں مادی وروحانی دونوں پہلو مساوی تو بہرحال ہوتے ہیں۔

ہم نے چوبیسویں مقالے میں اس موضوع پر گفتگو کے دوران ایک مغربی

ماہر نفسیات خاتون کو سند میں پیش کیا تھا کہ عورت چونکہ شکم اور آغوش میں بچے کی پرورش کرتی ہے۔اس کے نفسیاتی حالات ہی کچھ اور ہوتے ہیں،وہ اپنے شوہر سے اس کی محبت اور خصوصی توجہ کی بے حد آرزو رکھتی ہے،اسی محبت وتوجہ جو اس کے شوہر تب کے احساس کے ساتھ اس کے زیر تربیت بچے کے باپ کی حیثیت بھی لیے ہوئے ہو۔ یہاں تک کہ ماں کی مامتا کا پلا باپ کی محبت فرزند کے پلے سے زیادہ وزنی ہوتا ہے باپ کی محبت میں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ بچے کے وجود میں آنے کا ایک عامل ہے۔عورت کی یہ خاص نیازمندی اسی وقت پوری ہوسکتی ہے جب شوہر ایک ہو۔

بنابریں ''چندشوہری کا مقابلہ'' چندازواجی سے بہت بڑی غلطی ہے، پھر ان میں فرق کا نہ ماننا یا دنیا کے ایک بڑے حصے میں ''چندازواجی'' نظام کے رواج پانے کی علت مرد کی زورآوری قرار دینا،اور یہ کہنا کہ عورت اپنی کمزوری اور بے اختیاری کی وجہ سے ''چندشوہری'' سسٹم جاری نہ کرسکی سراسر غلط ہے۔

کتاب انتقاد بر قوانین اساسی و مدنی ایران کے صفحہ 34 پر خانم منوچہریان کہتی ہیں:

قانون مدنی کی دفعہ 1049 میں ہے--- ''بیوی کی اجازت کے بغیر کوئی شخص بھائی کی لڑکی، یا سالی کی لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا............اگر بیوی اجازت دے دے تو اس کا شوہر بھائی کی یا سالی کی لڑکی سے شادی کرسکتا ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر بیوی اجازت نہ دے تو کیا ہوگا؟ کچھ بھی نہیں۔ وہی جومثل ہے'' آنکہ عوض داردگاندارد'' مرد کسی اور سے نکاح کرلے گا۔ اچھا۔ اب مسئلہ کو الٹ کر دیکھیں پھر کیا ہوگا؟ مثلاً، یہ کہیں۔ بیوی اپنے شوہر کے بھائی کے لڑکے یا بہن کے لڑکے سے شوہر کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کرسکتی (جب تک وہ اس شخص کی بیوی ہے)۔یہ بات سن کر خدائی رگ پھڑکتی،خون جوش مارتا اور آدمی چیخنے لگتا ہے، یہ تجویز خلاف

انسانیت ہے۔عورت کی فطرت ومزاج کے خلاف ہے۔جواب میں دینا چاہئے کہ یہ تجویز دراصل (اصل کلیہ) کنیزی زوجہ کے خلاف ہے۔جیسے ایک مال کا ایک مالک ہوتا ہے اور اگر متعدد مالک ہوں بھی نفع اور محصول ایک ہی حاصل کرتا ہے قانون مملکت کے واضح اور ضمنی مطالب کی بنا پر بیوی بھی اموال کے ذیل میں آتی ہے۔لہٰذا اسے بھی ایک سے زیادہ مالک نہ رکھنا چاہیے..................

اسی کتاب کے صفحے 73 پر لکھا ہے:

''ہم یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ جیسے مرد کو چار بیویوں کے رکھنے کا حق ہے ،عورت بھی انسان ہے وہ بھی مرد کے برابر ہے۔اسے بھی مرد جیسے حقوق کا مالک ہونا چاہئے۔اس صغریٰ، کبریٰ کا نتیجہ مردوں کیلئے بڑا وحشت ناک ہے۔اسی وجہ سے ان کی رگوں میں خون کی رفتار تیز ہوجاتی ہے، چہرا بھڑک اٹھتے ہیں آنکھیں آگ برسانے لگتی ہیں۔ گلے پھاڑ پھاڑ کر کہنے لگتے ہیں ۔عورت ایک شوہر سے زیادہ مرد کیوں چاہتی ہے؟ ہم اس کے جواب میں نرمی وسرد مہری سے کہتے ہیں۔مرد ایک سے زیادہ بیویاں کیوں کرتا ہے؟

ہم فساد اخلاق کا پروپیگنڈا نہیں چاہتے ۔ہم خواتین کی عفت وآبرو کو حقیر نہیں جانتے۔البتہ۔مردوں کو یہ ضرور سمجھانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے عورت کے بارے میں جو خیالات ونظریات قائم کر لیے ہیں وہ غیر مستحکم بنیاد پر قائم ہیں ۔مرد بھی اکائی ہے،عورت بھی اکائی ہے۔اس لئے زن ومرد برابر ہیں۔اگر مردوں کو مردانگی کی بنیاد پر چار عورتوں سے شادی کا حق دیا گیا ہے تو عورت کو بھی یہی حق ملنا چاہیے۔فرض کیجئے کہ عورت عقل کے زاویے سے بہ نسبت مرد کے عقل میں زیادہ توانا نہ ہو، جب بھی یہ یقین رکھنا چاہئے کہ روحانی تجلی اور نفسیاتی کیفیت عورت میں مرد سے کم نہیں ہے۔''

آپ نے ملاحظہ فرمایا: مذکورہ بالا بیانات میں ''چند زنی'' اور ''چند شوہری''

نظام میں کوئی فرق نہیں بتایا جاسکا ہے۔بس ایک ہی بات دھرائی ہے۔ چونکہ مرد زورآور تھالہٰذاذاتی نفع کیلئے ''چندبیویوں'' کی رسم چلالی،عورت آزادنہ تھی،لہٰذاوہ اپنی کنیزی کے خلاف ''چندشوہری'' کورواج نہ دے سکی۔ہاں مذکورہ بیان میں ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے ''چندزنی'' کے رواج اور ''چندشوہری'' کی ناکامی کاباعث مرد کی مالکیت اورعورت کی مملوکیت تھی،مرد مالک سمجھاجاتاتھااس لئے اسے ایک سے زیادہ عورتیں یعنی متعدداموال رکھنے کاحق تھا۔عورت مملوک تھی اور مملوک کوایک مالک سے زیادہ مالک بنانے کاحق نہیں لہٰذاوہ چندشوہری نعمت سے محروم رہ گئی۔

اتفاقاًمقالہ نگارخاتون کی رائے کے برخلاف ''چندشوہری نظام'' کاناکام ہونادلیل ہے کہ مردعوت کومال نہیں سمجھتا تھا۔کیونکہ مال میں شرکت،چندآدمیوں کا ایک مال مل کرخریدنے اورسب کامل جل کرملکیتی مال سے فائدہ اٹھانے کی رسم پوری دنیامیں جاری ہے۔اگرمردخواتین کومال سمجھتے تواس میں شرکت جائز سمجھتے اورسب مل جل کرفائدہ اٹھاتے۔دنیامیں کہاں کاقانون یہ ہے کہ ایک مال کامالک ایک سے زیادہ نہ ہو؟اس کاجواب دیں پھرہم سمجھیں گے کہ ایک شوہری کافلسفہ ملکیت ہے۔

کہتے ہیں:مرداکائی ہے۔عورت اکائی ہے۔لہٰذادونوں کے حقوق برابر ہوناضروری ہے۔مردچندعورتوں سے فائدہ اٹھائے اورعورت چندمردوں سے فائدہ نہ اٹھائے کیوں؟

میں کہتاہوں:آپ کی غلط فہمی یہی ہے کہ تعددازواج کوآپ حقوق مرد میں شمارکرتی ہیں اورتعددشوہران حقوق زوجہ میں۔حالانکہ تعددزوجات حقوق زن سے متعلق ہےاورتعددشوہراں نہ مردکےحقوق میں ہے نہ عورت کےحقوق سےاس کاکوئی تعلق ہے یہ بات مردکے مقاصدومنافع کے بھی خلاف ہے اورعورت کے مقاصد ومنافع کے بھی حق میں اچھی نہیں۔ہم آگے چل کرثابت کریں گے کہ قانون تعدد

ازواج اسلام نے عورت کے حقوق کو زندہ وثابت رکھنے کیلئے منظور کیا ہے اگر اسلام مرد کی حمایت کرنا چاہتا تو وہی اقدام کرتا جو یورپ والوں نے کیا ہے وہاں قانون نے مردوں کو دوسروں کی عورتوں سے فائدہ اٹھانے کا حق دیا۔اس نے پہلی بیوی کے علاوہ سب سے پہرہ اٹھالیا، پھر ستم یہ کہ اولاد بلکہ خود اس عورت کے قانونی حقوق بھی تسلیم نہیں کیے۔

چند شوہری عورت کیلئے کوئی فائدہ رسان حق نہیں تھا جو اس سے چھین لیا گیا۔کہتی ہیں۔ ہم مردوں کو سمجھانا چاہتے ہیں کہ خواتین کے بارے میں ان کے نظریات خود ان کے پندار کے مطابق مضبوط و ناقابل تبدیلی نہیں۔

اتفاق دیکھیے کہ ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔آئندہ مقالات میں تعدد ازواج کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر واضح کریں گے، پھر اس مصنف اور دوسرے انصاف پسند صاحبان نظر سے التماس ہے کہ ان مقالات کو دیکھیں اور بتائیں کہ کیا اسلام کا نقطہ نظر کسی تغیر ناپذیر اصل پر مبنی ہے یا نہیں؟ میں ایک شریفانہ وعدہ کرتا ہوں اگر کوئی شخص اس نظریے میں کوئی عیب نکال کر دکھائے تو میں حقوق خواتین کے بارے میں اپنی پوری بحث کو نظر انداز کر دوں گا۔

تعدد ازواج کے تاریخی اسباب

جغرافیائی علل (۲)

''چند ازواجی'' رسم کے رواج پانے کیلئے یہ عامل کافی نہیں کہ مرد ہوس پیشہ ہے اور بے چون و چرا اس کو تسلط حاصل ہے۔ یقیناً اس کے علاوہ کچھ اور علل واسباب بھی موثر ہوں گے ورنہ عیاش مرد کیلئے آسان اور بے دردسری کا راستہ، پھر وراثٹی بازار کی آزاد طوائفوں سے حاصل ہوسکتی تھی، دوست، ساتھی، معشوقہ اور آزادی کی آزادی ایک پسندیدہ عورت کو بیوی بنا تا اس کے مشکوک بچے کی ذمہ داری سنبھال لیتا۔

بنابریں، جن معاشروں میں ''چند ازواجی'' رائج تھی وہاں تو یا عیاش وہوس پیش افراد کیلئے اخلاقی رکاوٹیں تھیں۔ یا سماج نے ہوس رانی اور تنوع طلبی کا جرمانہ یہ رکھا تھا کہ قانونی بیوی قبول کرے، اور اس کی اولاد کو اپنی اولاد مانے اور سب کی دیکھ بھال کرے۔ یا پھر کچھ اور اسباب وجوہ ہوں گے خواہ وہ جغرافیائی ہوں یا اقتصادی یا سماجی، بہرحال ہوس رانی وتنوع طلبی کا عمل دخل نہیں تھا۔

جغرافیائی عوامل

مان ٹسکو۔۔اور۔۔گوستاولوبن تو جغرافیائی عوامل ہی پر زور دیتے ہیں۔

ان مفکرین کے خیال میں مشرق کی آب وہوا کا تقاضا یہی تھا کہ ایک مرد کئی بیویاں کرے۔مشرقی علاقوں میں عورت جلدی بالغ ہوتی ہے اور جلدی بوڑھی ہوتی ہے۔اس وجہ سے مرد کو دوسری اور تیسری شادی کی ضرورت پڑتی ہے۔مزید یہ کہ مشرقی آب وہوا مرد کی جنسی قوت کے لحاظ سے کچھ ایسی ہے کہ ایک بیوی اسے کافی نہیں ہوتی۔

گوستاولوبن ،تاریخ تمدن اسلام وعرب (ترجمہ فارسی) صفحہ 509 پر لکھا ہے: مذکورہ رسم (تعدداز واج) فقط مشرق کی آب وہوا کا نتیجہ تھی۔آب وہوا کی وجہ سے نسلی اور طرز زندگی کے خصوصیات دوسروں سے الگ ہوئے۔یہ نہیں کہ مذہب یہ رسم لایا تھا۔آب وہوا،اور قومی خصوصیات ہی وہ عوامل ہیں جو روزمرہ سے زیادہ مضبوط اور اثر انگیز ہوتے ہیں۔یہاں تک کہ ہم اس بارے میں زیادہ لکھنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے۔مشرقی عورت کی اصل فطری وطبیعت اور اس کی ساخت نیز بچے کی پرورش اور بیماریاں جیسے عوارض انہیں مجبور کرتے ہیں کہ وہ جلدی مرد سے دوری اختیار کرلیں موسم ،اور قومی خمیر کچھ ایسا ہے کہ مرد اس وقت علیحدگی کو برداشت ہی نہیں کرسکتا لہٰذا تعدداز واج لازمی صورت اختیار کرلیتی ہے۔

مان ٹسکو ،روح القوانین (فارسی ترجمہ) صفحہ 430 پر لکھتا ہے:

''جن ممالک میں گرم آب وہوا ہے۔وہاں لڑکیاں عموماً آٹھ نو برس کی عمر میں بالغ ہوجاتی ہیں۔اور شادی کے بعد حمل آجاتا ہے۔یعنی گرم علاقوں میں شادی اور حمل یکے بعد دیگرے ہونے والے عمل ہیں۔''

پیریڈو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح میں کہتا ہے:

''آنحضرتؐ نے پانچ سال کی عمر میں خدیجہ رضوان اللہ علیہا سے عقد کیا اور آٹھ سال کی عمر میں ہم خوابی کی ،اسی لئے گرم سرزمین کو خواتین بیس برس میں بوڑھی

ہوجاتی ہیں۔ جب وہ چاہتی ہیں کہ عقل کمال حاصل کرے تو بڑھاپے میں مبتلا ہوچکتی ہیں ....جن ممالک میں موسم معتدل ہوتا ہے وہاں خواتین کا حسن دیر تک باقی رہتا ہے۔دیر میں بالغ ہوتی ہیں۔ جب شادی کرتی ہیں تو زیادتی سن وسال کی وجہ سے تجربہ کاری ہوتی ہیں۔اولاد ہونے کے بعدان کی عمراور آگے جاتی ہے اور میاں بیوی تقریباً ہم سن ہوجاتے ہیں دونوں کا بڑھاپا ایک ساتھ آتا ہے۔دونوں میں برابری برقرار ہوتی ہے مرد کو دوسری عورت کی ضرورت پیش نہیں پڑتی............''

اس وجہ سے یورپ میں تعدداز واج کی ممانعت کا قانون اور ایشیا میں اس کا جواز موسم کا تقاضا ہے............

یہ توجیہہ کسی حیثیت سے درست نہیں۔ پہلے تو یہی دیکھئے کہ ''تعدداز واج'' کی رسم مشرق کے گرم خطوں میں ہی رائج نہیں۔متعدل موسم کے علاقوں میں ایران کو لیجئے، یہاں قبل از اسلام بھی یہ رسم جاری تھی۔ مان ٹسکو کا یہ کہنا۔۔گرم خطوں میں عورت بیس برس میں بوڑھی ہوجاتی ہے۔ایک بے حقیقت خرافات ہے۔اوراس سے زیادہ لاف زنی۔۔۔ پیر دیڈو۔۔۔ نے کی، کہ پیغمبر اسلامؐ نے پانچ برس کی عمر میں حضرت خدیجہؓ سے عقد کیا۔اور آٹھ برس کی عمر میں ہم خواب ہوئے۔سب کو معلوم کہ آنحضرتؐ نے پچیس برس کی عمر اور حضرت خدیجہؓ کی چالیس برس کی سن سے زیادہ میں شادی کی تھی۔

دوسرے اگر عورت کا جلدی بوڑھا ہونا اور مرد کی جنسی طاقت کا ہیجان ہی اس رسم کا سبب ہوتا تو مشرق اقوام نے مغربی علاقوں کے وسطی دور اور جدید زمانے کے رواج کیوں نہ اپنائے۔یعنی تعدداز واج کے بجائے رنڈی بازی اور عیاشی کیوں نہ اختیار کی، کیونکہ بقول گوستاولوبن، ایک بیوی کا فقرہ تو مغرب کے قانونی کتب میں تو ہے لیکن سماج میں اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے۔

نیز بقول اسی مصنف کے۔۔مشرقی علاقوں میں تعدد ازواج قانونی صورت میں تو ہے ہی ،رسمی طور پر یہ آبرومندانہ معاہدہ قبول کیا جاتا ہے اوران بیویوں کی اولادکوان کا باپ بخوشی اپنی فرزندی میں لے آتا ہے۔مغرب میں متعدد رفقاء حیات مکارانہ وغیر دقانونی طور پر پائی جاتی ہیں۔یعنی معشوقہ سازی اور رفیقہ بازی کے انداز میں باہمی معاہدے اور پدری ذمہ داری اولاد سے آزاد۔

یورپ میں چند ازواجی رسم کی صورت حال

میں ضروری سمجھتا ہوں کہ تھوڑی تفصیل مغرب میں ''چند ازواجی'' رسم کے بارے میں لکھتا چلوں ،وہاں قرون وسطی میں کیا رویہ تھا۔مغرب ہی کے ایک محقق کا بیان ناظرین ملاحظہ کریں۔ اوروہ لوگ بھی سنیں جوایشیا کو''تعدد ازواج'' اورکبھی''حرم سرائی'' نظام کے نام سے قابل تنقید اورمشرق کی شرمندگی کی بات سمجھتے سمجھاتے ہیں۔ یہ معلوم رہے کہ ایشیا میں بہت سے عیب اور متعدد رسوائیوں کی باتیں ہوں گی، اس کے باوجود جو ماجرا یورپ میں گزرتا ہے وہ ہزار درجہ فضیلت وشرافت مندانہ ہے۔

''ویل ڈیورانٹ'' تاریخ تمدن جلد 17 میں ''سستی اخلاق'' کے نام سے ایک فصل قائم کر کے،اٹلی کی عہد رنسانس میں عام اخلاقی رویوں کی تفصیل لکھتا ہے۔

''اخلاق وروابط جنسی'' کے ذیل میں جو کچھ ہے اس کا خلاصہ ملاحظہ کیجئے۔''

ویل ڈیورانٹ بطور تمہید کچھ باتیں یوں کرتا ہے جیسے معذرت خواہی کررہو۔کہتا ہے:

''غیر مذہبی عوام کی اخلاقی حالت اورجنسی تعلقات کے بارے میں یاد کرادوں کہ مرد،ذاتی طور پر چند ازواجی فطری کا مالک ہے، اورفقط طاقت ورترین

اخلاقی پابندیاں، غربت اور محنت کی ایک خاص حد اور بیوی کی مناسب دیکھ بھال مرد کو ایک بیوی برداشت کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔''

اس کے بعد وہ اصل مدعا پر آتا ہے:

''معلوم نہیں، رنسانس کے عہد تک قرون وسطیٰ میں شوہر دار خواتین سے زنا کم تھی، اور جس طرح قرون وسطیٰ میں پہلوانی کے پردے میں زنا خوبصورت عمل قرار دیا گیا تھا، اسی طرح رنسانس کے دور میں یہی عمل طلب علم لڑکیوں کے واسطے، دل کشی، اور نسوانی جادوگری کے نام سے عام تھا۔۔ اونچے خاندانوں کی لڑکیاں، بڑی حد تک خاندان سے باہر کے مردوں سے الگ اور چھپا کر رکھی جاتی تھیں۔ شادی سے پہلے ان کو پاک دامنی کی تعلیم دی جاتی تھی، کبھی اس تعلم کے دوررس نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں ایک واقعہ ہے کہ ایک جوان خاتون نے ناموس لوٹنے کے بعد دریا میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔ مگر یہ مثال اکیلی تھی کیونکہ اس کی موت کے بعد پادر کو اس کا مجسمہ بنانے کی فکر ہوئی۔

شادی سے پہلے کے قصے قابل توجہ تھے۔ رنسانس کے اٹلی میں ہر شہر کے اندر ناجائز بچوں کے وجود کی دلیل زنا کے علاوہ کیا ہو سکتی تھی۔ ناجائز اولاد کا کسی گھر میں نہ ہونا عزت کی بات تھی مگر حرامی اولاد کا وجود کوئی رسوائی کا سبب بھی نہ تھا۔ عام رواج کے مطابق شادی کے وقت ہی مرد اپنی بیوی کا ناجائز اولاد گھر میں لانے کی تشویق کرتا تھا۔ تاکہ دوسرے گھر کے بچوں کے ساتھ وہ بھی پرورش پائے۔ حرام زادہ ہونے سے کسی کی عزت کم نہ ہوتی تھی۔ اور سماج کی طرف سے جو داغ لگایا جاتا تھا، اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ مزید براں اس لڑکے کا جائز ہونا بھی مشکل نہ تھا، چرچ کے ممبروں کو رشوت دیکر سند حاصل کی جاسکتی تھی، اگر جائز اولاد نہ ہوتی تو باصلاحیت ناجائز لڑکا تخت وتاج شاہی کا وارث بھی ہو سکتا تھا۔ اس کی مثال فرینٹ

اول (FERRANTE) نپلز (NAPLES) کے بادشاہ، الفانسواول (Alponsi.1) کا نانشین ہوا۔ یا۔ لیونی لو، ڈی الیسٹ ۔(Leo Nello) (D,Este)، فیرار (Ferrara) کے حکمران نکولوسوم ۔(Nccolo.3) کا جانشین ہوا تھا۔ 1459ء میں جب پیوس دوم ۔(Pius.2) فیرارا آیا تو سات شاہزادوں نے اس کا استقبال کیا، یہ ساتوں شاہزادے ہلال زادے نہ تھے۔ رانسانس کے عہد میں حلال زادوں اور حرام زادوں میں بڑی رقابت اور کشمکش رہی ....رہی ہم جنسی تعلقات کی بات تو یونان قدیم کی ایک رسم کا جبری احیا ہوا............

سان برنارڈ نیو (San,Brnardino) نے یہ شرمناک عمل اتنا دیکھا کہ شہر کی قسمت کو سدوم اور عمورہ کی سرنوشت کہہ کر ڈار یا۔ اریٹی نیو (Are Tion) نے بھی روم میں اس بداخلاقی کا مشاہدہ اسی فراوانی سے کیا................

دوسری فحاشیوں کے سلسلے میں بھی یہی باتیں کی جاسکتی ہیں۔این فسوار (Infessura) کو یورپ نشین روم میں اپنے شماریات کی اہمیت بڑھانے کے شوق نے کہا۔۔1490ء میں 90 ہزار کی رومی آبادی تھی اور 6800 طوائفوں کا نام درج دفتر تھے۔اور اس تعادا میں چھپ کر اور بغیر لائنس کی طوائفوں کا شمار نہیں ہے۔ وینز کے شماریات 1509ء کے مطابق 11654 فاحشہ عورتیں تھیں، جبکہ شہر کی آبادی تین لاکھ تھی........... پندرھویں صدی میں جو لڑکی پندرہ برس کی عمر تک شوہر کے گھر نہ جاسکتی تھی وہ ننگ خاندان سمجھی جاتی تھی۔ سولھویں صدی میں ''رسوائی کی عمر'' سترہ سال تک کردی گی، تاکہ لڑکی اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکے جن مردوں کو عیاشی کی تمام تر سہولتیں حاصل تھیں، وہ صرف اس وقت شادی پر مائل ہوتے تھے جب لڑکی اپنے ساتھ قابل کشش جہیز لائے...........قرون وسطیٰ کے قوانین ازدواج کے مطابق، شادی کے دوران دونوں کے تعلقات دیکھے جاتے تھے کہ میاں بیوی میں محبت پختہ ہوجائے، خوشی اور غمی

،خوشحالی و تنگی میں ایک دوسرے کے ساتھ اور غمخوار رہیں، عام طور پر یہ آرزو پوری بھی ہوتی تھی۔ اس کے باوجود شادی شدہ عورتوں سے بدکاری کا رواج تھا اونچے درجے کے آدمیوں میں شادیاں ڈیپلومیٹک اور سیاسی واقتصادی اتحاد کیلئے ہوتی تھیں، بہت سے شوہر کسی محبوب داشتہ سے تعلق اپنا حق جانتے تھے۔ بیوی کو ناگوار بھی ہوتا تو آنکھیں لب بند رکھنے پر مجبور ہوتی تھی۔

متوسط طبقے میں کچھ لوگ تفریحی بدکاری کو جائز سمجھتے تھے۔ میکیاولی اور اس کے دوست اپنی بیوفائیوں کی داستانوں سے رنجیدہ نہیں ہوتے تھے۔ ایسے موقعوں پر جب بیوی اپنے شوہر کی تقلید میں شوہر ہی سے انتقام لیتی تھی تو عموما شوہر اس کے اقدامات سے چشم پوشی کرتے اور غیرت کی ٹوپی ذرا اور اونچی کر لیتے تھے۔ جی، یہ تھی عوامی زندگی ان حضرات کی جو تعدد ازدواج کو مشرق کا نا قابل معافی جرم سمجھتے تھے اور کبھی کبھی اس علاقے کے موسم کو بقول ان کے اس غیر انسانی عمل کا ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ مگر ان کا علاقہ ان کا موسم اور ان کا ماحول انہیں بیوی سے بے وفائی اور ایک بیوی سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

ضمناً، یہ نکتہ بھی بن کہا نہ رہ جائے کہ قانونی (شرعی) طور پر کئی بیویاں رکھنے نہ رکھنے کا دستور اہل یورپ میں اچھے برے سے بحث کئے بغیر اصل دین عیسوی سے غیر متعلق ہے۔ بن مسیحؑ میں کئی بیویاں نہ رکھنے کا کوئی حکم ہے ہی نہیں۔ بلکہ حضرت مسیح علیہ السلام تورات کے ضابطوں کی تائید کرتے ہیں اور تورات میں کئی بیویوں کو قانوناً تسلیم کیا گیا ہے۔ بنابریں ہمیں تو یہ کہنا چاہے کہ دراصل دین مسیحؑ میں کئی بیویاں جائز قرار دی گئی ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پرانے مسیحی کئی کئی بیویاں رکھتے تھے۔ لہذا یورپ والوں کا کئی بیویوں کے قانون نظام سے الگ رہنا ایک یا متعدد اسباب پر مبنی ہوگا، مذہب تو علت نہیں ہے۔

ماہواری

کچھ لوگوں نے تعدد ازواج کا سبب بتایا ہے کہ ماہانہ بیماری اور مدت ماہواری میں مرد کو لذت اندوزی سے روکنے کا احساس ، پھر بچہ جننے سے تھکن اور علیحدگی کی خواہش بچہ کی خوراک و پرورش کا مسئلہ ایک بیوی سے زیادہ تقاضا کرتا ہے۔

ویل ڈیورانٹ کے بقول:

''ابتدائی معاشرتوں میں بیوی جلدی بوڑھی ہوجاتی ہے اور مرد سے دوسری شادی کی خواہش کرتی ہے تاکہ اپنے بچوں کے کھانے پینے کا انتظام کرسکے اور تولید اولاد میں درمیانی فاصلہ بڑھا سکے اور مرد کے شوق تولید اور جنسی عمل میں رکاوٹ نہ بنے عموماً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ پہلی بیوی، اپنے شوہر سے دوسری شادی کی فرائش اس لئے بھی کرتی تھی کہ اس کا کام ہلکا ہو، اور نئی خاتون سے بچے ہوں جس سے فائدہ اور سرمایہ بڑھے۔''

بلاشبہ، عورتوں کی ماہانہ بیماری اور بچہ جننے سے تھکن کی بنا پر جنسی عمل میں دونوں دو الگ سمتوں میں واقع ہوتے ہیں اس بنیاد پر مرد کو کچھ نہ کچھ دوسری عورت کا خیال آتا ہے لیکن دونوں مذکورہ علتیں مستقل سبب تعدد ازواج نہیں۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ اخلاقی یا سماجی رکاوٹ موجود ہو جو مرد کو اس کی آرزو پورا کرنے اور معشوق بنانے یا آزاد زن پرستی کا عمل نہ کرنے دے۔

خواتین کی زچگی کا سن محدود ہوتا ہے

بعض حضرات کے خیال میں مرد کے برخلاف خواتین کی تولیدی قوت ایک خاص عمر تک رہتی ہے، پھر وہ ''یائسہ'' ہوجاتی ہے یہ بھی تعدد ازواج کی وجہ ہے

۔ہوسکتا ہے یہ بیوی اس وقت ''یائسہ'' ہو جب یا تو شوہر کیلئے اولاد کافی نہ پیدا ہوئی یا وہ بچے فوت ہو چکے ہوں۔

مرد کا رجحان فرزند طلبی اور بیوی کو طلاق نہ دینے کا خیال سبب ہوتا ہے کہ دوسری یا تیسری بیوی گھر میں لائے جیسے پہلی بیوی کا ناقابل تولید ہونا شوہر کے لئے دوسری بیوی کا محرک ہے۔

اقتصادی اسباب

تعدد ازواج کے اقتصادی اسباب وعوامل کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے۔کہتے ہیں اس زمانے کے برعکس پرانے زمانے میں زن وفرزند کی کثرت اقتصادی طور پر مرد کیلئے نفع بخش چیز تھی۔مرد اپنے بیوی بچوں سے غلاموں کی طرح بیگار لیتا تھا،کبھی اپنے بچوں کو بیچنا بھی تھا۔بہت سے افراد کی غلامی جنگی قیدی ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ ان کے باپوں نے انہیں بازار میں لے جا کر بیچا تھا۔

تعدد ازواج کی یہ توجیہ ممکن ہے صحیح ہو کیونکہ فقط یہی ایک طریقہ ہے کہ مرد قانونی بیوی کے ذریعے کثرت اولاد سے فائدہ اٹھائے محبوباؤں کی تلاش اور رنڈی بازی سے مرد یہ خصوصیت حاصل نہیں کرسکتا تھا لیکن اس سبب کو ہر ایسے معاشرے میں موثر نہیں مانا جاسکتا،جہاں کثرت ازواج کی رسم موجود ہو یعنی یہ سبب عام نہیں ہے۔

فرض کریں کہ شروع شروع میں اقوام وقبائل اسی وجہ سے متعدد شادیاں کرتے تھے،لیکن سب قومیں ایسی نہ تھیں۔پرانی دنیا میں کئی بیویاں رکھنے کی رسم اس طبقات میں رائج تھی۔جو شان وشوکت ،شخصیت وامتیاز کے ساتھ زندگی گزارنے والے تھے۔بادشاہ،امیر سردار،مذہبی رہنما اور خاص تاجر جیسے لوگ۔

معلوم ہے کہ یہ طبقات بیویوں اور اولاد کی فراوانی سے کوئی اقتصادی فائدہ

حاصل نہیں کرتے تھے۔

تعداد و خاندان ایک سبب

کثرت اولاد اور خاندان کی نفری بجائے خود ایک اور عامل تھا کہ کئی شادیاں کی جائیں۔ زن و مرد کو دو مختلف جہتوں اور دو فرق مراتب رکھنے والی ایک بات یہ بھی ہے کہ ایک عورت جس تعداد میں بچے پیدا کرسکتی ہے وہ محدود اور گنتی کے ہیں خواہ ایک شوہری نظام ہو یا چند شوہری ،لیکن مرد کی قوت تولید، زیر اختیار عورتوں سے ہزاروں بچے پیدا کروا سکے۔

آج کی دنیا کے برخلاف، پرانے زمانے میں ایک اور اہم عامل یہ تھا کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔لڑکیوں کی شرح پیدائش لڑکوں سے زیادہ نہ اس وقت تھی نہ اب ہے۔ اگر اتفاقاً کچھ علاقوں میں لڑکیوں کی شرح پیدائش زیادہ ہو بھی تو دوسرے علاقوں میں اس کے برعکس ہے وہاں لڑکوں کی شرح پیدائش لڑکیوں سے زیادہ ہوگی۔ ایک چیز ضروری ہے اور وہ ہے مردوں کی شرح اموات کا عورتوں سے زیادہ ہونا۔ مردوں کی شرح اموات ہمیشہ ایک سبب رہا ہے کہ اگر ایک بیوی کے دستور پر قائم رہا جائے تو عورتوں کی بڑی تعداد قانونی شوہر، گھر زندگی اور جائز اولاد سے محروم رہے گی۔

ابتدائی زمانے کے معاشرے میں ایسا ہی تھا بحث کی بات ہی نہیں ہم ویل ڈیورانٹ کی رائے نقل کر چکے ہیں کہ:

سماجی کی پہلی منزل میں جنگ و شکار کی وجہ سے مردوں کی زندگی خطرے میں رہتی تھی۔ اور مرد عورتوں سے زیادہ مرتے تھے۔عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوتی تھی۔ اسی سبب سے یا کئی بیویوں کا نظام رواج پاتا یا عورتیں بے شوہر کے

رہتیں۔

تحقیق

تاریخی لحاظ سے جن عوامل واسباب کو ''تعدد ازواج'' کی اساس مانا جاسکتا ہے وہ یہی ہیں جو ہم نے بیان کیے۔لیکن جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ان عوامل واسباب میں کچھ علتیں حقیقی نہیں، تعدد ازواج کے ذیل میں ان کا تذکرہ بلاوجہ کیا جاتا ہے جیسے موسم۔اس کے علاوہ مزید تین قسموں کے علل واسباب کا مزید جائزہ لیجئے۔

پہلی قسم ان علل واسباب کی ہے جن کے اثر سے مرد تعدد ازواج کی طرح مائل ہونا ممکن ہے یعنی مرد کیلیئے وجہہ جواز تو کوئی نہیں،مگر زور وظلم واستعداد کا پہلو قوی ہے۔اقتصادی عامل بھی اسی قسم کا ہے،اور ہم اس پر توجہ دلا چکے ہیں۔

دوسرے علل کا قانونی زاویہ سے مطالعہ کرنا چاہئے،ہوسکتا ہے کہ وہاں کوئی وجہہ جواز مرد یا معاشرے کے واسطے موجود ہو۔۔ مثلاً بیوی کا بانجھ ہونا یا اس کا ''یائسہ'' (ماہواری بند ہونے کی عمر کی عورت ہونا) دوسری طرح شوہر کا محتاج فرزند یا قبیلے اور ملک کا طالب کثرت آبادی ہونا۔ یہاں کلیہ کے طور پر زن ومرد کی فکری عوامل کو اززاویے سے دیکھا جائے گا کہ جنسی آسودگی یا تولید نسل کی بنیاد پر دونوں کی نوعیت غیر مساوی ہے۔اسی پہلو کو تعدد ازواج کیلیئے یا وجہ جواز قرار دیا جاسکتا ہے۔

تیسرے علل کا وہ حصہ ہے،جسے تیسرے نوع میں اس وقت شمار کیا جاسکے گا۔جب یہ فرض کرلیں کہ وہ گزشتہ صدیوں میں موجود بھی تھے،یا آج وہ علل موجود ہیں ان میں سے بعض اسباب تو اتنے موثر ہیں کہ نہ صرف وہ تعداد ازواج کا جواز مہیا کرتے ہیں بلکہ اس سے تو مرد پر عورت کا ایک واجب الاداحق عائد ہوتا ہے اور فقط عورت ہی نہیں،معاشرے اور سماجی کی ذمہ داری بھی یہی ہوگی کہ مرد کئی شادیاں

کرے،اس کی علت عورتوں کی عددی اکثریت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ فرض کریں گزشتہ دور یا موجود زمانے میں شادی کے قابل لڑکیاں،شادی کے قابل لڑکیوں سے زیادہ ہوں اور ایک شادی ہی قانونی قرار دی جائے۔تو بن بیاہی اور گھریلو زندگی سے محروم خواتین کا ایک طبقہ سماج میں موجود ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے عورتوں کے کاندھے پر ایک قانون پابندی آپڑے گی۔ کہ بن بیاہی اور عائلی زندگی سے محروم عورتوں کو آباد کریں تا کہ وہ بھی خانگی زندگی حاصل کرسکیں۔

گھریلو زندگی سب سے زیادہ انسان کا فطری حق ہے۔کسی بشر کو کسی نام اور کسی عنوان سے اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ خانگی زندگی ایسا حق ہے جو ہر فرد اپنے معاشرے میں پیدا کرتا ہے اور معاشرہ کوئی ایسا اقدام نہیں کرسکتا جس کے نتیجے میں سماج کا کوئی گروہ اس حق سے محروم رہ جائے۔اس حق کی نظیر روزگار، روٹی، کپڑا، مکان،تعلیم وتربیت اور آزادی، ہر بشر کا اولین حق اور حقیقی حق ہے۔یہ حق کسی نام وعنوان سے چھینا نہیں جاسکتا۔ عائلی زندگی بھی ایک فطری حق ہے اور جب شادی کے قابل عورتوں کی تعداد شادی کے لائق مردوں کی نفری سے زیادہ ہوتو ''صرف ایک بیوی'' کا قانون ،مذکورہ فطری حق کے خلاف ہے۔ لہٰذا یہ قانون بھی حقوق فطری بشر کے خلاف ہوگا۔

ماضی کے بارے میں تو یہ سب کچھ ہوگیا،سوال یہ ہے کہ آج کیا کہا جائے ؟ کیا آج بھی ان اسباب کا وجود ہے جن کی بنا پر کئی بیویاں رکھنے کا جواز نکلتا ہے اور وہ علت بھی موجود جو تعدد ازواج کو بطور ''حق'' فرض کرتی ہے۔ یا آج ان چیزوں کا وجود نہیں ہے۔

مقصد یہ ہے کہ اگر یہ موثر اسباب موجود ہیں تو پہلی بیوی کا حق کیا ہوگا؟ ان سوالوں کے جواب آئندہ فصل میں آرہے ہیں۔

کئی بیویوں کی صورت میں عورت کا حق

''ایک بیوی کئی شوہر'' کی رسم ختم ونا کام ہونے نیز ''ایک شوہر کئی بیویوں'' کی کامیابی کے اسباب وعلل پر گفتگو ہوچکی ۔ ہم نے ''تعدداز واج'' کی رسم شروع ہونے پر متعدد اسباب بیان کیے اوران پر روشنی ڈالی ۔اس کا ایک سبب جنس مرد کے نفسیات میں حکومت واستبداد کا جذبہ ہے۔ایک وجہ زن ومرد میں فطری ساخت کا فرق ہے، دونوں میں سن وسال کے لحاظ سے تولید نسل کی صلاحیت ،اورتولید فرزند کی تعداد میں امکانات کا اختلاف بھی ''تعدداز واج'' کا جواز بن سکتا ہے۔

لیکن جو خاص ''علت'' پوری تاریخ میں اثرانداز رہی ہے وہ ہے تعدداز واج عورت کا مرد ایک ''حق'' اور براہ راست مرد کا ایک فرض ہے ۔اوروہ علت ہے قابل نکاح خواتین کی عددی کثرت اورشادی کے قابل مردوں کی کمی ہے۔

ہم طول کلام سے بچنے کیلئے ان علتوں پر بحث چھوڑ رہے ہیں جو اگر چہ وجوب ''چندزنی'' کیلئے کافی نہیں مگر مرد کیلئے وجہ جواز ضرور ہیں۔ ہم اپنی گفتگو اس علت پر محدود کرتے ہیں کہ اگر وہ علت موجود ہوتو تعدداز واج عورتوں کے طبق کا حق ضرور بنتا ہے۔

مذکورہ دعوے کے ثبوت سے پہلے دو باتیں بطورتمہید واضح ہونا ضرور ہیں:

ا۔ حتمی وتصینی شماریات کی روسے یہ ثابت ہونا چاہئے کہ قابل شادی عورتوں کی تعداد شادی کے قابل مردوں کی تعداد سے زیادہ ہے

۲۔ اگر ایسی سند مل جائے تو حقوق انسانی کی رو سے محروم خواتین کا ایک حق مردوں اور خانگی عورتوں کے ذمہ عائد ہو جائے گا۔

پہلی بات: خوش قسمتی سے آج کی دنیا کے پاس اس بارے میں بڑی حد تک صحیح شماریات موجود ہیں۔ دنیا بھر کے مما لک چند سال بعد مردم شماری کرتے ہیں۔ مردم شماری کی مہم ترقی یافتہ ملکوں میں بڑے اہتمام سے انجام دی جاتی ہے۔اس طرح مردوزن کی الگ تعداد ہی نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس سے مختلف برسوں میں عورت ومرد کی اوسط تعداد بھی دریافت ہوتی ہے۔مثلاً یہ بھی علم میں آجاتا ہے کہ 20 سے 24 سال کے لڑکوں کی تعداد کیا ہے اور اسی عمر کی لڑکیاں کتنی ہیں؟ ہر عمر کے افراد معلوم ہو سکتے ہیں ۔ادارہ اقوام متحدہ اپنے سال مردم شماری میں اس اعداد و شمار کی اشاعت کرتا ہے۔غالباً اب تک سولہ رپورٹیں شائع ہو چکی ہیں۔

1964ء کی مردم شماری کی رپورٹ 1965ء میں چھپی تھی اس نکتہ پر توجہ دلانا ضروری ہے کہ ثبوت مدعا کیلئے ہر ملک کے مردوں کی تعداد اور عورتوں کی مجموعی تعداد کیا ہے یہی جاننا کافی نہیں۔مفید و لازم تو یہ معلوم کرنا ہے کہ شادی کے قابل لڑکوں اور شادی کے قابل لڑکیوں کی اوسط کیا ہے؟ کیونکہ قابل شادی مردوں اور شادی کے قابل عورتوں کی تعداد ان کے مجموعی اوسط سے عموماً مختلف ہوگی۔اس کے سبب دو ہیں:

ا۔ لڑکیوں کے بلوغ کا زمانہ ،لڑکوں کے زمانہ بلوغ سے پہلے آتا ہے جب ہی تو دنیا بھر کے قوانین لڑکیوں کا قانونی سن لڑکوں کے قانونی سن سے کم ہے علمی طور پر دنیا کی اکثریت میں شادی کے وقت لڑکی کی عمر لڑکے سے کم از کم پانچ سال چھوٹی ہوتی ہے اور شوہر اوسطاً بیوی سے پانچ برس بڑے ہوتے ہیں۔

۲۔ سب سے اہم اور بنیادی علت یہ ہے کہ اگرچہ لڑکیوں کی پیدائش ،لڑکوں کی پیدائش سے زیادہ نہیں ۔۔ ہوسکتا ہے چند علاقوں میں تو لڑکوں کی

پیدائش کی شرح زیادہ ہوسکتی ہے۔لیکن ہمیشہ جنس ذکور کی موت کا اوسط جنس اناث سے زیادہ ہے۔اس سے شادی کی عمروں میں فرق پڑ جاتا ہے اور کبھی تو بہت زیادہ فرق نظر آنے لگتا ہے۔یوں شادی کے قابل عورتوں کی تعداد شادی کے قابل مردوں سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے لہٰذا ممکن ہے ایک ملک میں ذکور کی تعداد اناث کی مجموعی تعداد سے مساوی یا زیادہ ہو لیکن شادی کے قابل درجے میں یعنی شادی کے قانونی عمر تک پہنچتے پہنچتے صورت حال برعکس ہوجائے۔

مردم شماری کی رپورٹ 1964ء جو اقوام متحدہ کا اس بارے میں آخری نشریہ ہے۔(جب زیر نظر بحث لکھی گئی تھی)اس سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔

مثلاً اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق کوریا کی مجموعی آباد 26،277،635 تھی ان میں مردوں کی تعداد 13،145،289 تھی اور خواتین کی تعداد تھی 13،132،346 یعنی کل آبادی میں سے 12943 مرد ،عورتوں سے زیادہ تھے اس تعداد میں ایک سال سے کم عمر کے بچے ایک سال سے 4 برس تک اور پانچ برس سے نو برس تک اور بارہ برس سے چودہ، پندرہ سے انیس برس تک کی عمر کے بچے بھی شریک ہیں۔

شماریات بتاتے ہیں کہ ان عمروں میں ذکور کی تعداد اناث سے زیادہ ہے۔ لیکن بیس برس سے چوبیس برس تک کے ٹوٹل میں یہ نسبت بدل جاتی ہے۔اس سن میں 364-83-1 ذکور اور 1110051 عورتیں۔اور اس کے بعد قانونی شادی کے لئے زن و مرد کی عمروں کا حساب کریں تو عورتیں،مردوں سے زیادہ نکلتی ہیں۔

جمہوری کوریا کے شماریات استثنائی ہیں وہاں مردوں کی مجموعی تعداد، عورتوں سے زیادہ ہے۔اس کے برخلاف اکثر ممالک میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے یہ زیادتی شادی کی عمر کے حساب سے بھی برقرار رہتی ہے۔

روس کی مجموعی آباد 216،101،000 ہے اس میں مرد 97،84،000۔ عورتیں 118،261،000 ہیں، یہ فرق شادی سے پہلے کی عمر تک ہے شادی کی عمر یعنی بیس سال سے چوبیس سال اور پچیس سال سے انتیس، تیس سے چونتیس، نیز اسی برس سے چوراسی سال تک یہی نسبت برقرار رہتی ہے۔

انگلستان، فرانس، مغربی جرمنی، مشرقی جرمنی، چیکوسلواکیہ، پولینڈ، رومانیہ ہنگری، امریکہ اور جاپان میں یہی تناسب ہے۔ بعض علاقے ایسے ہیں جہاں اختلاف ہے مثلاً مشرقی و مغربی جرمنی میں فرق تناسب زیادہ نمایاں ہے۔

ہندوستان میں عام طور پر اور عمر ازدواج میں خاص طور پر مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہے۔ البتہ پچاس برس اور اس کے اوپر عورتیں زیادہ، مرد کم ہوجاتے ہیں، بظاہر عورتوں کی کمی کا سبب ہندوستان کی وہ قدیم رسم ہے کہ جس میں بیوہ کو معاشرے سے ختم کردیا جاتا ہے۔

گزشتہ سال ایران کی مردم شماری میں یہ بات سامنے آئی کہ ایران استثنائی ملک ہے جہاں مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہے اس رپورٹ کے مطابق ایران کی مجموعی آبادی 25،871،90 ہے اس میں سے مردوں کی تعداد 13،337،324 ہے اور عورتیں 12،443،756۔ ہیں۔ ٹوٹل میں 893،578 مرد عورتوں سے زیادہ ہیں۔

مجھے یاد ہے ان دونوں تعدداز دواج پر بحث کرنے والوں نے لکھا تھا۔ دیکھیے تعددازواج کے حامیوں کے دعوے کے خلاف ہمارے ملک میں مردوں کی تعداد، عورتوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ اس بنا پر قانون تعددازواج کو ختم کردینا چاہئے۔

مجھے ان دنوں تعجب ہوا تھا کہ یہ لکھنے والے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ پہلے تو قانون تعدداز دواج ایران ہی سے مخصوص نہیں۔ دوسرے یہ کہ موضوع سے مربوط

ومفید بات تو یہ ہے کہ آیا شادی کے قابل مردان عورتوں سے زیادہ ہیں جو شادی کے لائق ہیں، یا کم ہیں؟ فقط یہ کہنا کہ مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہے زیرِ نظر مقصد کیلئے کافی نہیں ہے۔ ابھی دیکھا ہے کہ جمہوری کوریا اور دوسرے ممالک میں بھی مرد زیادہ ہیں۔لیکن شادی کے قابل افراد کی نسبت سے مردم شماری کی رپورٹ دیکھی تو عورتوں کی تعداد زیادہ نکلی ۔ایران جیسے ممالک کی مردم شماری کے قابل اعتبار نہ ہونے سے قطع نظر ،اگر صرف ایران میں عورتوں کے رجحان پسر زائی کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایرانی عورت مردم شماری کے آدمیوں کے جواب میں لڑکی پیدا ہونے کی جگہ، یہی کہیں گی کہ ان کے یہاں لڑکا پیدا ہوا ہے اور وہ لڑکا ہی لکھوائیں گی۔ یہی بات ،مردم شماری کی رپورٹ سے اعتماد اٹھانے کیلئے کافی ہے۔ ملک میں ہر جگہ منگنیوں اور رشتہ مانگنے کی رسم جس کثرت سے ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں شادی کے قابل لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہے ،کیونکہ تعدادِ ازواج کی رسم اس ملک کے شہروں اور دیہاتوں حتیٰ کہ قبائل میں بھی عام تھی اور اب بھی ہے کبھی کسی نے یہ محسوس نہیں کیا کہ یہاں خواتین کم ہیں کبھی عورت کی بلیک مارکیٹ نہیں ہوئی، اس کے برعکس ہمیشہ رشتے کی خواہش کے چرچے عام رہے۔ لڑکیاں بیوہ خواتین ، یا کسی وجہ سے شادی سے محروم جوان عورتیں مجرد مردوں سے زیادہ موجود ہیں۔ بدصورت وغریب مرد بھی شادی کی طلب گاری کیلئے نکلے ہیں تو ناکام نہیں ہوئے مگر لڑکیوں کی صورت اس کے برعکس ہے اور بے چاری لڑکیاں مجبوراً بے شوہر کے رہ گئی ہیں۔ یہ بات اتنی عام اور ہر جگہ ہوتی ہے کہ ہر رپورٹ اور شماریات سے زیادہ یقینی ہے۔

''اشی لے مونٹیگیو'' نے ''زن جنسی برتر'' میں ایک بے معنی بحث ''عورت کا آرائش پسند ہونا سماجی مطالبہ کا نتیجہ ہے'' اور اسی ضمن میں اس نے کہا: پوری دنیا میں

ہمیشہ شادی کے قابل عورتوں کی تعداد زیادہ رہی ہے۔''

1950ء کی مردم شماری سے نشاندہی ہوتی ہے کہ امریکہ میں شادی کے قابل عورتوں کی تعداد اندازاً دس لاکھ تیس ہزار اور چارسو ہے۔ یہ تعداد مردوں سے زائد ہے۔(زن روزشمارہ 69 وصفحہ 71)

بریٹنڈرسل نے شادی واخلاق پر جو کتاب لکھی ہے اس میں بحث میں صفحہ 115 پر لکھا ہے:

''آج کے انگلستان میں بیس لاکھ سے زیادہ ایسی خواتین ہیں جو مردوں سے زیادہ ہیں اور روزمرہ کے مطابق ان کو ہمیشہ بے اولاد رہنا ہے۔ اور یہ ان کی بڑی محرومی ہے۔''

چند سال پہلے ایرانی اخبارات میں یہ خبر پڑھی تھی کہ جرمن میں جنگ عظیم دوم کے نتیجے میں بے شوہر عورتوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ قانونی شوہر اور گھریلو زندگی سے محرومی کے سبب ان عورتوں نے حکومت سے ''یک شوہری'' قانون کے خاتمے کا مطالبہ کیا تاکہ ایک شوہر کئی کئی شادیاں کر سکے۔ حکومت نے اسلامی دانشگاہ ''الازہر'' سے سرکاری طور پر کوئی فارمولا طلب کیا پھر ہم نے دریافت کیا تو اطلاع ملی کہ چرچ نے اس کی بڑی مخالفت کی، دراصل کلیسا کی نظر میں خواتین کی محرومی یا بدکاری کی فراوانی صرف اس لئے قابل قبول ہے کہ تعدداز واج ایک مشرقی واسلامی فارمولا ہے اور اسے کسی حالت میں قبول نہ کرنا چاہئے۔

شادی کے قابل عورتوں کی مردوں کے مقابلے میں عددی کثرت کے علل واسباب

کیا علت ہے؟ کیا وجہ ہے کہ لڑکوں کی شرح پیدائش لڑکیوں سے زیادہ ہونے کے باوجود شادی کے لائق عورتیں مردوں سے زیادہ ہیں؟

اس کی علت و وجہ ظاہر ہے ۔۔ مردوں کی شرح اموات عورتوں کی شرح اموات سے زیادہ ہے۔ جانی نقصانات کا زمانہ عموماً وہ عمر ہے جب مرد شادی کے قابل ہوتا ہے یا اس کے قریب ناگہانی حادثات پر غور کریں۔ اور حوادث پر نظر ڈالیں جنگ غرق ۔ بلندیوں سے گرنا۔ عمارتوں میں دبنا۔ ٹکر یا اکسیڈنٹ۔ جیسے حادات جنس ذکور سے زیادہ متعلق ہوتے ہیں۔

بہت کم ایسے حادثات میں عورت دکھائی دیتی ہے۔ انسان کا انسان سے مقابلہ ہو یا انسان کا فطری سے تصادم ہر جگہ نقصان مرد کا ہوتا ہے۔ فقط جنگ ہی کا مطالعہ کریں تو اول تاریخ بشریت سے آج تک کوئی زمانہ ایسا نہیں جب کسی نہ کسی علاقے میں جنگ نہ ہو اور مرد کو جانی نقصان نہ اٹھانا پڑیں۔ یہی بات ممکن جواب ہے کہ شادی کی عمر میں زن و مرد کا توازن کیوں باقی نہیں رہتا۔

صنعتی عہد میں جنگی نقصانات کا تناسب اس جنگ سے کئی سو گنا بڑھ گیا ہے جو زرعی اور شکاری دور میں ہوتی تھی۔ آخری دونوں عظیم جنگوں میں جنس ذکور کا جانی نقصان تقریباً سات کروڑ افراد تک پہنچا تھا۔ یہ تعداد کئی صدیوں پہلی بے شمار لڑائیوں کے برابر ہوگی۔ اب ان آخری برسوں میں ہونے والی لڑائیوں ہی کو دیکھئے جو مشرق بعید، مشرق وسطی افریقہ میں ہو رہی ہیں۔ وہاں جو کچھ گزر رہا ہے اس سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہوگی۔

ویل ڈیورانٹ کہتا ہے:

''تعدد ازدواج کی رسم کے زوال میں چند عوامل کا دخل ہے۔ کاشتکاری کی زندگی جس میں سکون و قرار رہے اس سے مردوں کی زندگی میں اضطراب وخطرات

وخلفشار کم ہوگیا۔اسی وجہ سے مرد وزن تقریباً مساوی ہو گئے۔''

ویل ڈیورانٹ کے قلم سے عجیب بات دیکھی، یعنی اگر مردوں کا جانی نقصان فقط فطرت سے ٹکرائے کی بنا پر تھا، جب تو شکاری زندگی اور کاشتکاری زندگی میں فرق تھا۔ کیونکہ جنس ذکور کونمایاں اختلاف جنگ سے ہوتا ہے۔اور یہ صوت کاشتکاری زندگی میں شکاری زندگی سے کم نہ تھا، دوسرے یہ کہ مرد ہمیشہ عورت کو اپنی نگہداشت میں رکھتا رہا اور جان جوکھوں کے کام خود انجام دیتا رہا ہے، بنابریں عہد کاشتکاری میں بھی اسی طرح غیر متوازن تھا، جیسے دور شکار میں تھا۔

ویل ڈیورانٹ مشینی دور کی بات صنعتی عہد کا نام نہیں لیتا، حالانکہ یہ عہد مردوں کی جان ضائع کرنے میں سب سے بڑھ کر ہے اور توازن کو نمایاں طور پر سامنے لاتا ہے۔

بیماریوں سے خواتین کی قوت مدافعت

مرد کی جانی اتلاف، عورت کے جان نقصان سے زیادہ ہونے، ایک سبب نئے علوم کی ترقی کے نتیجے میں دریافت ہوا ہے وہ موضوع یہ ہے کہ بیماریوں سے مرد کا مقابلہ عورت سے کمزور ہے، لہٰذا بیماریوں میں مرد زیادہ مرتے ہیں اور خواتین کم۔

دی ماہ 1335ھ ش (1956ء/1957ء) کے روزنامہ ''اطلاعات'' (تہران) میں تھا: ''ادارہ شماریات فرانس کے مطابق، فرانس میں لڑکوں کی شرح پیدائش لڑکیوں سے زیادہ ہوتے، یعنی سولڑکیوں کے مقابل ایک سو پانچ لڑکے پیدا ہونے کے باجود عورتوں کی تعداد سترہ لاکھ پینسٹھ ہرار نفر مردوں سے زیادہ ہے۔اس کا سبب یہ بتایا گیا کہ خواتیں مردوں سے زیادہ بیماریوں کا مقابلہ کرتی ہیں۔

رسال سخن، جلد6 شمارہ11 میں ایک مقالہ چھپا ہے۔۔

''زن درسیاست واجتماع'' یہ مضمون، یونیسکو کے باتصویر ماہنامے کے ایک مقالے کا ترجمہ ہے، ڈاکٹر زہرا خانلری نے ''اشلی مونتاک'' سے نقل کیا ہے:

''عملی نقطہ نظر سے عورت کی فطرت مرد کی فطرت پر فوقیت رکھتی ہے، x کروموزوم (Chromosome) جنس مادہ میں، کروموزوم، Y جنس نر سے زیادہ طاقت ور ہیں۔ اسی وجہ سے عورتوں کی عمر مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ خواتین کی اوسط عمر مردوں سے زیادہ ہے، عورت عام طور پر مرد سے زیادہ تندرست ہوتی ہے بہت سی بیماریاں وہ مردوں سے زیادہ مقابلہ کر کے جھیل جاتی ہے۔ علاج کا اثر بھی جلدی قبول کرتی ہے۔ عورت ایک گونگی اور مرد پانچ گونگے، رنگوں کی ایک نابینا عورت کے مقابلے، رنگوں کے سولہ اندھے مرد، دیکھے گئے ہیں۔ نزف ادم ''Haemorrhage'' ہیمرج کی تکلیف، تقریباً مردوں کو ہی ہوتی ہے۔ حادثات سے مقابلہ کرنے میں عورت زیادہ مضبوط ہے۔ آخری جنگ عظیم میں ہر جگہ دیکھا گیا ہے کہ ایک جیسے حالات میں، مرد سے بہتر عورتوں نے مقابلہ کیا ہے۔ محاصرہ۔ قید۔ قیدیوں کی کیمپ میں مردوں سے زیادہ۔۔۔ قریب قریب ہر ملک میں مردوں کی خودکشی عورتوں سے تگنی ہے۔۔''

''زن جنس برتر'' میں اشلی مونتاگ کا نظریہ اس سے زیادہ واضح ہوا ہے۔ جناب حسام الدین امامی کا ترجمہ شمارہ 70، رسالہ زن روز'' میں چھپ چکا ہے۔

بیماریوں کا زیادہ دلیری سے مقابلہ کرنے کی نسوانی قوت کا نتیجہ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک دن مرد قوت حاصل کر کے عورت سے انتقام لے۔ اور اسے خطرناک اور بھاری کاموں میں لگا دے جس سے وہ موت سے دوچار ہو، خصوصاً اسے میدان جنگ میں لے جا کر اس کے تن نازنین کو گولیوں کا نشانہ بنوا دے یوں اس کو ان کاموں کا مزہ چکھائے۔ اس کے بعد بھی بیماریوں سے مقابلے کی قوت مدافعت کی وجہ سے جنس زن ومرد کا توازن محفوظ نہ رہے گا۔

یہ سب باتیں، پہلی تمہید اور پہلے مقدمے سے متعلق تھیں، یعنی شادی کے قابل عورتوں کی نسبت مردوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ معلوم ہوا کہ واقعۃً، یہ بات حقیقت رکھتی ہے، اوراس کی علت بھی واضح ہوگی۔ اور یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ علت یا اسباب آغاز تاریخ بشر سے موجود تھے اور آج بھی ہیں۔

کئی بیویوں کی صورت میں عورت کا حق

رہی تمہید کی دوسری بات۔ یعنی شادی کے قابل عورتوں کی فراوانی اور شادی کے قابل مردوں کی کمی سے طبقہ خواتین کا ایک ''حق'' پیدا ہوتا ہے۔ یہ حق شادی شدہ عورت و مرد کے ذمے ہے:

انسانی حقوق میں عائلی زندگی کے فطری و حقیقی حق ہونے میں تو کوئی جائے حرف زدن نہیں ہے۔ زن و مرد میں سے ہر ایک کا عائلی زندگی بسر کرنا، ایک حق ہے۔ مرد ہے تو بیوی، عورت ہے تو شوہر و اولاد سے بہرہ ور ہونا ایسا ہی حق ہے جیسے مکان تعلیم وعلاج و معالجہ امن و آزادی کے حقوق ہیں۔

سماج کو اس معاملے کسی رکاوٹ ڈالنے کا حق نہیں بلکہ اس کی ذمہ دری ہے کہ وہ ان حقوق کو فراہم کرے۔

ہمارے نزدیک ''منشور حقوق انسانی'' میں ایک بہت بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں ''حق شادی'' پردھیان نہیں دیا گیا ہے۔ حق آزادی حق امن موثر قومی عدالتوں سے رجوع کا حق، حق قومیت، حق ترک قومیت، ہر مذہب وقوم سے شادی کرنے کا حق ، مالکیت کا حق، اتحادی ادارے بنانے کا حق، سکون وراحت کا حق، تعلیم و پرورش کا

حق ،تو یاد رکھے ہیں۔لیکن ''عائلی زندگی کے حق کا تذکرہ چھوڑ دیا ہے ۔یعنی خاندانی مرکزیت بنانے کا حق اور اس کے قانون بات ہی نہیں ہے ۔حالانکہ یہ حق عورت کی جہت سے بہت اہمیت رکھتا ہے عورت کو مرد سے زیادہ گھریلو مرکزیت کی ضرورت ہوتی ہے ۔مقالہ نمبر 27 میں کہہ چکا ہوں ،شادی ،مرد کیلئے مادی لحاظ سے اور عورت کے واسطے جذباتی ونفسیاتی لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔مرد اگر گھر کو چھوڑ دے تو عیاشی و یار بازی کے ذریعہ آدھے ضروریات پورے کرسکتا ہے۔مگر خاندان اور ''گھر'' کی اہمیت عورت کے لئے ان باتوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے۔عورت اگر عائلی قضا کھول بیٹھے تو عیاشی و یار بازی سے اپنے مادی ونفسیاتی ضروریات سے تھوڑا بہت بھی مطمئن نہیں ہوسکتی۔

عائلی زندگی کے حق کا مطلب مرد کے نزدیک ایک فطری خواہش کی آسودگی ،ایک ہمسر شریک زندگی اور یک دل ساتھی اور قانونی اولاد رکھنے کا حق ہے۔لیکن عائلی زندگی رکھنے کا مطلب ،عورت کی اصطلاح میں نام ہے، مذکورہ باتوں کے علاوہ ایک حامی وسرپرست رکھنے کا جذبات کی حمایت رکھنے کا:

ان دوتمہیدوں (مقدموں) کے اثبات کے بعد:

۱۔ عورتوں کا عددی تناسب مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

۲۔ عائلی زندگی انسانی فطری کا ایک حق ہے۔

نتیجہ ۔۔اگر ایک بیوی ہی کو شادی کی قانونی صورت دی جائے تو عورتوں کا بہت بڑا گروہ اپنے انسانی فطری حق ''عائلی زندگی'' سے محروم رہے گا۔خاص شرائط کے ساتھ،تعدد ازواج کا قانون ہی اس فطری حق کا احیا کرسکتا ہے۔

روشن فکر مسلمان خواتین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی حقیقی شخصیت کو پہنچانیں ۔اور خواتین کے برحق حقوق ، اخلاق ،نسل بشر کی حمایت کے عنوان سے انسان کے

سب سے اہم فطری حق کے بارے میں ،حقوق انسانی کے کمیشن کو''یو ان ،او'' میں قرارداد پیش کریں ،جس میں ان منطقی شرائط کے ساتھ تعدد ازواج کے جواز پر حقوق بشری میں سے ایک حق تسلیم کرنے پر زور دیا جائے، مطالبہ کریں کہ وہ اس تجویز کو قانونی طور پر تسلیم کرے۔ یہ خدمت خواتین اور اخلاق کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ فقط یہ بہانہ کہ مشرقی فارمولے کی اہل مغرب پیروی کریں، کوئی گناہ کی بات تو نہیں ہے۔

رسل کا نظریہ

ہم نے گزشتہ صفحات میں ''برٹرینڈ رسل'' کے بارے میں اشارہ کیا ہے کہ موصوف اس نکتے کو دھیان میں رکھتے تھے کہ اگر فقط ''ایک بیوی'' کے طریق کار کو قانونی حیثیت دی جائے تو اس سے عورتوں کا ایک بڑا گروہ قانونی شادی سے محروم رہے گا۔ لہٰذا انہوں نے راہ حل نکالی ،مگر کیا راہ حل؟ بڑی سادہ تجویز کہ اس قسم کی عورتوں کو اجازت دی جائے کہ وہ فرزند سے محروم نہ رہیں،وہ مردوں کا شکار کرکے بے پدر اولاد کو جنم دیں اور حاملہ ہونے یا گود میں بچہ ہونے کی حالت میں ان کو مالی امداد کی جو ضرورت پیش آتی ہے اور عام طور پر ایک بات جو نفقہ دیتا ہے، حکومت اس کی ذمہ داری بنے اور اس زاویے سے باپ کی جانشین ہو کر ایسی عورتوں کی امداد کرے۔

اس کے بعد رسل نے کہا:

''آج کے انگلستان میں مردوں سے دو ملیں (بیس لاکھ) عورتیں زائد ہیں رسم ''یک زوجہ'' کی وجہ سے یہ عورتیں ہمیشہ بے اولاد رہیں گی۔ یہ ان کی بڑی محرومی ہے۔''

پھر لکھتا ہے:

مکمل شادی ایک بیوی پر مبنی ہے مگر یہ قانون اس مفروضے پر ہے کہ زن

ومرد میں تقریباً یکسانیت ہے۔مگر جہاں برابری نہ ہو وہاں بڑی زیادی (قساوت) ہوگی کہ ریاضی کلیے کے مطابق دوسرے افراد مجرد رہیں۔ پھر اگر ہم قوم میں افرادی کثرت کی ضرورت بھی محسوس کریں تو یہ طریق کار خصوصی قساوت وسخت دلی سے بڑھ کر عام صورت میں جائز قرار نہیں دی جاسکتی۔

یہ تھا بیسویں صدی کے ایک فلسفی کا حال جو اس نے ایک معاشرتی مسئلے کی الجھن کیلئے پیش کیا اور وہ تھا اس مشکل کا حل جو اسلام نے تجویز کیا۔اسلام کہتا ہے۔۔ کہ یہ مشکل یوں حل کرو کہ ایک شخص جس میں مال، اخلاقی اور جسمانی صلاحیتیں ہوں اور وہ ایک بیوی سے زیادہ بیویوں کی کفالیت کرسکتا ہو تو وہ دوسری قانونی وشرعی بیوی قبول کرلے،مگر پہلی بیوی اور اس کی اولاد کے درمیان کسی قسم کا امتیاز روا نہ رکھے۔پہلی بیوی بھی ایک معاشرتی ذمہ دار سمجھ کر، اپنے حق اور اپنی فداکاری کے ذریعے شرکت کو تسلیم کرے، گویا ایک خاص قسم کا شوشلزم جو سوشلزم کے تمام اقسام میں سب سے اہم ہے،قبول کرے۔مگر بیسویں صدی کا یہ فلسفی کہتا ہے: محروم عورتیں دوسروں کے شوہروں پر ڈاکہ ماریں انہیں چرالیں ، بے پدر بچے جنیں اور حکومت سے کفالت حاصل کریں۔بیسوی صدی کے اس فیلسیوف کی نظر میں عورت کی ضرورت خانہ داری صرف نہیں زاویوں سے ہے۔

۱۔ جنسی زاویہ جو عیاری، دل ربائی کے ذریعے عورت حاصل کرسکتی ہے۔

۲۔ اولاد کے زاویہ سے بھی چوری، جس سے بچہ ہاتھ آئے۔

۳۔ اقتصادی زاویے سے ،دولت ملنا چاہیے ۔اس فیلسیوف کی نظر میں جس چیز کی ضرورت نہیں ہے وہ شوہر کے مخلصانہ جذبات ہیں، اور اس کی یہ ضرورت کہ ایک مرد (شوہر) اسے اپنی حمایت کے دامن میں لے اسے فقط جنسی

نظر سے نہ دیکھے۔اس فلسفی کے نزدیک ایک بات اور غیر اہم ہے اور وہ ہے نومولود کی حالت زار یہ بچہ اس نے جنا ہے۔ یہ بچہ اسے پریشان کرتا ہے۔ ہر بچہ بلکہ ہر انسان چاہتا ہے کہ وہ اپنے باپ اور اپنی ماں کے حوالے سے جانا پہنچانا جائے، ہر بچہ چاہتا ہے کہ ماں باپ کی سچی محبت اور مامتا پائے تجربہ گواہ ہے کہ جس ماں کا بچہ کوئی معین باپ نہ رکھتا ہو اس ماں کے دل میں اس بچے کی محبت کا چشمہ نہیں پھوٹتا جسے بچے کے باپ کی توجہ نصیب نہ ہو۔ وہ ایسے بچے سے بہت کم پیار کرتی ہے۔محبت کی یہ کمی کہاں سے پوری کی جائے؟ کیا حکومت اس کمی کو پورا کرسکتی ہے؟

جناب رسلؔ صاحب کو افسوس ہے، اگر ان کی تجویز نے ''قانونی شکل حاصل نہ کی تو بہت سی بے شوہر عورتیں بے اولاد رہ جائیں گی۔ لیکن خود رسل صاحب بہتر جانتے ہیں کہ انگلستان کی بے شوہر عورتیں ایسے قانون کا انتظار نہیں کرسکتی تھیں انہوں نے عملی طور پر خود ہی تنہائی، بے شوہری و بے اولادی کی حل نکال لیا ہے۔

''دس انگریزوں میں ایک ....''

اخبار اطلاعات، تہران 925، 38 (دسمبر 1959ء) میں ایک سرخی تھی۔ ''دس انگریزوں میں ایک حرام زادہ ہے''۔ نیچے تھا۔ ''لندن، رائٹر'' 16 دسمبر، فرانسیسی نیوز ایجنسی سے خبر دی ہے کہ ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ اسکاٹ، میڈیکل افیسر، لندن نے اپنی تیار کردہ رپورٹ میں خاطر نشان کیا ہے کہ گزشتہ سال لندن میں جو بچے پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر دس میں ایک ناجائز ہے۔ ڈاکٹر اسکاٹ نے زور دیکر کہا ہے کہ ناجائز بچوں کی شرح پیدائش مسلسل بڑھ رہی ہے۔ 1957ء میں 22838 سے بڑھ کر ایک سال میں 53433 تک پہنچ گئی ہے۔''

انگریز قوم نے جناب رسلؔ کی تجویز پر قانون بننے سے پہلے اپنا مسئلہ حل کرلیا ہے۔

تعدد ازواج ممنوع اور ہم جنس بازی کی اجازت

حکومت انگلستان نے جناب رسل کی رائے کے بالکل برعکس کام کیا اور بجائے بے شوہر عورتوں کی مشکل حل کرنے، اس کے مرد کے حریفوں کو قانونی طور پر تسلیم کرلیا۔ اسی طرح انہیں پہلے سے زیادہ محروم بنانے کی سعی کی حکومت نے ''ہم جنس بازی'' کا قانون منظور کرلیا۔ 14/4/46 شمسی مطابق 5/7/1966ء کے اطلاعات نے خبر دی۔

''لندن، برطانیہ کے دار العوام نے آٹھ گھنٹے کی طویل بحث کے بعد ''ہم جنس بازی کے مسودہ قانون کی منظور دیکر، قرارداد کا متن دارالامرا کو بھیج دیا۔''

24/4/46 ہجری شمسی مطابق 15/7/1966ء یعنی دس روز بعد اطلاع دی:

ہاس وآف لارڈز نے اپنی دوسری نشست میں ''ہم جنس بازی'' کے مسودہ قانون کی منظوری دیدی۔ اس مسودہ کو پہلے، انگلستان کا دارالعوم منظور کر چکا تھا۔ اس کے بعد یہ قانون ملکہ الزبتھ کے پاس جائے گا اور وہ بہت جلد دستخط کریں گی۔''

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ انگلستان میں تعدد ازواج ممنوع ہے لیکن۔ ''ہم جنس بازی'' صحیح ہے۔

ان عوام کی نظر میں اگر مرد اپنی بیوی کی ''سَوت'' عورت لے آئے تو قانوناً درست نہیں ہے۔ اس نے غیر انسانی کام کیا۔ لیکن اگر وہی نوعیت عورت کے بجائے لڑکے سے بدل جائے تو شریفانہ انسانی اور بیسویں صدی کے مطابق کام ہوگا۔ دوسری لفظوں میں انگلستان کے ارباب حل وعقد کے نزدیک اگر شوہر کے گھر میں اس کی بیوی کا شریک خانہ ڈاڑھی مونچھ والا ہو تو ''چند ازواجی'' (چند ہمسری) میں کوئی عیب نہیں۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ یورپ نے جنسی اور گھریلو جھگڑے حل کئے اب ہمیں بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ تو انہوں نے یہ مسائل اس طرح حل کئے ہیں جیسے آپ دیکھ رہے ہیں۔

یہ باتیں میرے لئے باعث تعجب نہیں ہیں۔

تعجب وافسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے عوام اپنی منطق اپنے ہاتھ سے دے بیٹھے؟ ہمارے جوان اور تعلیم یافتہ لوگ واقعات کے تجزیہ وتحلیل سے کیونکر ہاتھ دھو بیٹھے؟ انہوں نے اپنی شخصیت کیوں گم کردی ہے؟ ہاتھ کے قیمتی پتھر کو دنیا کی اس طرف کے لوگوں کے اخروٹ کہنے سے کیوں پھینک دیتے ہیں؟ کیوں بات مان لیتے ہیں۔ اور اگر غیر کے ہاتھ اخروٹ ہو اور ان سے کہا جائے کہ یہ قیمتی جوہر ہے تو اسے کیوں مان لیتے ہیں؟

کیا چند ازواجی مرد کی فطری ہے؟

یقیناً آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ یورپ کے ماہرین نفسیات وفلاسفہ معاشرت کا نظریہ یہ ہے۔ مرد چند ازواجی فطری لے کر پیدا ہوا ہے اور یک ازواجی خلاف فطرت انسانی ہے۔

ویل ڈیورانٹ ''لذات فلسفہ'' میں صفحہ 91 پر اس دور کی جنسی اخلاقی آوارگی پر تفصیلی بحث کے بعد لکھتا ہے:

''بلاشبہ ان میں سے بہت سی باتیں اصلاح ناپذیر ہیں اس کا سبب تنوع پسندی (ہر روز نئی چیز) اور فطرت ایک بیوی پر اکتفا نہیں کرتی۔''

آگے چل کر لکھتا ہے:

''مرد، فطرت میں ذاتی طور پر چند ازواجی واقع ہوا ہے۔ ایک بیوی پر اسے پابند کرنے والی مضبوط چیز ہے، اخلاقی پابندیاں، سخت محنت اور غربت کا معین معیار اور پہلی بیوی کی سخت نگہداشت۔''

''زن روز'' کے شمارہ 112 میں ایک مضمون تھا:

''کیا مرد فطرتاً خیانت کار ہے؟''

اس میں درج ہے کہ ایک جرمن پروفیسر آشمید (Schmidt) کہتا ہے:

''پوری تاریخ میں مرد ہمیشہ خیانت کار رہا ہے اور عورت خیانت میں اس کے پیچھے پیچھے، قرون وسطیٰ میں بھی مسلسل ایسے شواہد ملتے ہیں کو نوے فیصد جوانوں نے بار بار رفیقہ حیات بدلی ہے۔ اور پچاس فی صد مردوں نے اپنی بیویوں سے خیانت کی ہے۔۔رابرٹ کینی۔۔(Dr.Robert Kinsey) مشہور امریکی محقق تھا، اس نے ایک رپورٹ جو ''کینی رپورٹ'' سے شہرت پائی، میں لکھا ہے: امریکہ کے زن و مرنے بے وفائی و خیانت میں تمام قوموں کے ہاتھو پیٹھ کے پیچھے باندھ رکھے ہیں۔ کینی اپنی رپورٹ کے دوسرے حصہ میں لکھتا ہے: عورت مرد کے برخلاف عشق و لذت میں تنوع جوئی (ہر روز نئی یاری) سے بیزار ہے اسی وجہ سے بعض اوقات مرد کے رویے سے نہیں دیتی، لیکن مرد تنوع کو ایک قسم کی مہم سمجھتا ہے اور آسانی سے راستہ سے کاٹ جاتا ہے۔ اس کی نظر میں اہم ترین چیز ہے جسمانی لذت اسے یہ جذباتی لذلت سے دلچسپی ہے نہ روحانی سے۔ روحانی وجذباتی باتوں کا اظہار اس وقت تک کرتا ہے جب تک جسمانی چسکا نہیں لیتا ایک مشہور فزیشن نے مجھ سے کہا: مرد کا پالی گیمسٹ (Polygamist) ہونا، اور اس کی تنوع پسندی و تعدد خواہی اور عورت مونو گیمسٹ (Monogamist) ہونا، یعنی انحصار طلبی اور ایک پر اکتفا کرنے کا جذبہ صاف اور سامنے کی بات ہے۔ کیونکہ مرد میں ملینوں خلیے اسپرم کے پیدا ہوتے ہیں (Spermatozoa) جب کہ عورت میں آمادگی کے وقت تخمدان (رحم) میں صرف ایک تخم (Pregnant) ہی پیدا ہوتا ہے۔ کنیسی کے مفروضے سے قطع نظر ہم خود اپنی ذات سے پوچھیں کیا مرد کیلئے وفاداری مشکل ہے؟

فرانسیسی، ہنری ڈی مونتھرلان (Henri De Montherlan) نے اس سوال

کے جواب میں لکھا ہے:

''مرد کے لئے وفادار ہونا مشکل ہی نہیں، بلکہ غیر ممکن ہے۔ ایک عورت ایک مرد کیلئے پیدا ہوئی ہے اور ایک مرد زندگی اور تمام عورتوں کیلئے۔۔ مرد اگر اندھیر میں اڑتا اور اپنی بیوی سے خیانت کرتا ہے تو خود کوئی غلطی نہیں کرتا۔ کوتاہی اس کی خلقت وفطرت کی ہے جس نے اس کے اندر خیانت کو جنم دیا ہے۔''

اس رسالے کے شمارہ نمبر 120 میں ایک مضمون ہے۔ ''فرانسیسی عشق اور شادی کا اسٹائل'' اس ذیل میں تحریر ہے:

''فرانسیسی میاں بیویوں نے آپ میں ''بے وفائی کا مسئلہ'' حل کرلیا، انہوں نے اس بارے میں قاعدہ وقانون، حدوحدود مان لئے ہیں۔ اگر شوہر اس قانون کی سرحد سے آگے بڑھتا ہے تو اندھیرے کی طرف اس کی پیش قدمی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ کیا اصولاً ایک مرد دوسال عائلی زندگی بسر کرنے کے بعد وفادار رہ سکتا ہے؟ یقیناً نہیں رہ سکتا۔ یہ بات اس کی فطرت کے خلاف ہے لیکن خواتین کے معاملے میں ایک حد تک فرق ہوتا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ وہ اس فرق سے باخبر ہیں۔ فرانس میں اگر کوئی شوہر خیانت کرتا ہے تو اس کی بیوی ناراضگی محسوس نہیں کرتی، غصہ نہیں آتا، وہ اپنے دل میں سمجھاتی ہے۔ اس نے دوسری سے فقط جسمانی لمس کیا ہے روح اور جذبات اسے نہیں دیے، روح اور جذبات میری ملکیت ہے۔''

چند برس پہلے بیالوجی کے پروفیسر ڈاکٹر رسل لی (**Dr Russell Lee**) کا اس بارے میں نظریہ روزنامہ ''کیھان'' میں چھپا تھا اور ایرانی لکھنے والوں نے کچھ عرصے تک اس پر بحث جاری رکھی تھی۔ ڈاکٹر رسل لی کے نزدیک مرد کا ایک عورت پر قانع رہنا نسل سے خیانت کرنا ہے۔ فقط مقدار ہی نہیں، کیفیت کے لحاظ سے بھی برا ہے۔ کیونکہ ایک عورت پر اکتفا کرنے سے اس کی نسل کمزور ہوتی ہے۔ کئی بیویوں کی وجہ

سے نسل قوی اور طاقت ور پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے خیال میں مرد کی فطرت کا یہ تعارف ہے کسی طرح صحیح نہیں ہے، ان مفکروں کے نظریہ کی پیداوار ان کے معاشرتی ماحول کے سبب ہے۔ مرد کی حقیقت فطرت ایسی نہیں ہے۔

ہم ہرگز مدعی نہیں ہیں کہ عورت و مرد بیالوجی (زیست شناسی) کے زاویے سے مشابہ حیثیت کے مالک ہیں۔ ہم تو اس کے برعکس یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ زیست شناسی اور نفسیات کے زاویے سے مرد و عورت میں فرق ہے۔ اس اختلاف میں تخلیق کا ایک مقصد ہے اس بنا پر زن و مرد کے انسانی حقوق کی یکسانیت کو دونوں کے تمام حقوق کی اکائی قرار دینے کا بہانہ بنانا غلط ہے۔ ایک شوہر وزوجہ کی رسم میں بھی نفسیانی اعتبار سے زن و مرد کے نفسیات الگ الگ اور قطعاً مختلف ہوتے ہیں۔ عورت فطرتاً یک شوہر پسند ہے، ''چند شوہری'' رسم اس کی نفسیات کے خلاف ہے، ایک شوہر سے بیوی کی رنگا رنگ ''تمناؤں کی وابستگی'' کا چند شوہری نظام سے کوئی ربط نہیں لیکن مرد ایک بیوی کی رسم سے طبعاً ہم آہنگ نہیں ہے باین معنی کہ چند ازواجی زندگی اس سے نفسیات سے اختلاف نہیں رکھتی۔

ہم اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں رکھتے کہ مرد کے نفسیات ایک بیوی کی رسم سے ہم آہنگ نہیں۔ ہم اس نظریے کے منکر ہیں کہ جو کہا گیا ہے کہ:

''مرد تنوع پسندی کا رجحان اصلاح ناپذیر ہے۔''

ہم اس را کے خلاف ہیں کہ:

''مرد کیلئے وفاداری ناممکن ہے۔ اور ایک بیوی ایک شوہر کیلئے پیدا کی گئی ہے۔ اور ایک مرد تمام عورتوں کیلئے۔''

ہمارے خیال میں مرد کے اندر خیانت کاری، سماجی ماحول پیدا کرتا ہے

،خلقت وفطرت کی دین نہیں ہے۔ مرد کی خیانت کاری کی ذمہ داری خلقت پرنہیں ہے۔اس کی جواب دہ سماجی فضااور ماحول ہے ۔خیانت کاری کے اسباب ماحول پیدا کرتا ہے یہ ماحول عورت کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ اغوااوراجنبی مرد کو بے رہ کرنے میں ہرقسم کی عیاری استعمال کرے، ایک ہزارایک نیرنگ دکھائے اوراسے اپنی رہ پرلائے۔ادھرقانوں ازدواج کو''ایک بیوی'' میں منحصرومحدود کرکے ہزاروں ،لاکھوں ، بلکہ ملینوں شادی کے قابل عورت کوازدواج زندگی سے محروم کرتا ہے۔ پھران کومرد کے اغوا کرنے کی خاطر سماج میں دھکیل دیتا ہے۔

مغربی آداب کے عام ہونے سے پہلے اسلامی مشرقی علاقوں میں نوے فیصد''ایک بیوی'' ہی کارواج تھا۔نہ ایک شرعی بیوی کے علاوہ ان کے گھر میں کوئی اورہوتی نہ یارومحبوبہ سے عشق بازی ہوتی تھی،خصوصی روابط زن وشوہراپنے تمام مفہوم ومعنی کے ساتھ اکثریت وعمومی طور پرمسلمان خاندانوں میں حکمران تھی۔

چندازواجی نظام یک زوجہ نظام کی پائیدارکاسبب ہے

ہماری بات پرآپ کوتعجب ہوگا،اسلامی مشرق میں''چندازواجی نظام'' ہی یک زوجہ رسم کی قوت کاباعث وسبب ہوا۔ ہاں متعدد بیویاں رکھنے کی اجازت بہت بڑاسبب ہے کہ''ایک زوجہ'' کی رسم پائدارہوجائے،یعنی جن حالات میں تعددازواج کی ضرورت ہوتی ہے۔شادی کے قابل عورتیں شادی کے قابل مردوں سے زیادہ ہوں۔اگرعورتوں کی اس تعدادکوقانونی تحفظ نہ دیاجائے ،اورشرائط پوری کرنے والوں اخلاقی مالی اور جسمانی صلاحیت رکھنے والوں کوکئی بیویاں رکھنے کاحق نہ دیاجائے تویاری ومعشوقہ بازی قدم بڑھاکر''ایک بیوی'' کے نظام کوجڑوں سے خشک کردے۔

اسلامی مشرق میں ایک طرف تعدد ازدواج کی اجازت اور دوسری طرف ہیجان انگیز اور اغوا کے محرکات موجود نہ تھے، لہٰذا ایک ازدواجی نظام اکثر خاندانوں پر حکومت کرتا تھا اور عشق بازی کا کاروبار اتنا نہ تھا کہ اس کیلئے خاص فلسفہ وضع کیا جائے اور کہا جائے کہ مرد کی تخلیق کئی بیویوں کا تقاضا کرتی ہے اور ایک بیوی پر اکتفا کرنا مرد کیلئے محالات و ناممکنات عالم میں ہے۔

ممکن ہے آپ سوال کریں کہ ان دانشوروں کی رائے کے مطابق جو مرد کیلئے چند ازدواج کو مطابق فطرت بتاتے ہیں اور قانون معاشرت کے زاویے سے برا سمجھتے ہیں مرد کی ذمہ داران دو قانوں کے مابین کیا ہے؟

ان حضرات کے دبستان فکر میں مرد کی ذمہ داری واضح ہے۔ قانوناً ایک بیوی عملاً چند بیویاں۔ ایک بیوی تو قانونی و شرعی ہونا چاہئے۔ اس کے بعد یار و محبوبہ و معشوقہ جتنی چاہے بنالے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ان حضرات کی رائے میں یار بنانے ، معشوقہ ساتھ رکھنے کا حق مرد کو فطرت نے دیا یہ حق تسلیم شدہ ہے اور قانونی ہے۔ ساری زندگی ایک بیوی کے ساتھ گزر بسر کرنا ایک قسم کی نامردی ہے۔

بحث کی اصل صورت

میرا گمان ہے کہ اب وہ لمحہ آ گیا ہے جب ہمارے قارئین کرام توجہ کریں کہ انسان کیلئے ''چند ازواجی'' کا جو مسئلہ زیر بحث تھا اور اب بھی ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟

مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ایک بیوی کی رسم بہتر ہے یا چند بیویوں کی؟

ایک بیوی کی رسم کے اچھے ہونے میں تو کوئی تردید ہے ہی نہیں۔ ایک بیوی کے نظام کا مطلب ہے خاندانی لگاؤ ، یعنی میاں بیوی کے جسم وجان ایک ہوں

،ظاہر ہے کہ ازدواجی زندگی کی جان وحدت ویگانگت ہے۔اور یہ بات انفرادی صورت ہی میں کامل ومکمل طور پر جلوہ گر ہوسکتی ہے۔ دراصل آدم زاد اس دوراہے پر نہیں ہے کہ ''ایک بیوی'' کا نظام اختیار کرے یا ''کئی بیویوں'' کا مسئلہ تو یہ آن پڑا ہے کہ سماجی ضرورتوں کے پیش نظر، خصوصاً شادی کے قابل لڑکیوں کی فراوانی ان مردوں سے جو شادی کے قابل ہوں، ایک بیوی کا نظام عملی طور پر خطرے میں ہے ''فقط ایک بیوی'' کا نظام تمام خاندانوں میں نافذ ہو، ایک افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، دو میں سے ایک راستہ ہے۔

یا تعدد ازدواج کا قانون

یا معشوقہ بازی کا رواج

یوں کہتے کہ --یا- چند شادی شدہ افراد کئی بیویاں رکھیں جن کی تعداد یقیناً دس فیصد سے زیادہ نہ ہوگی۔اس سے بے شوہر خواتین گھر بار بناسکیں گی، زندگی کا کوئی سرپیر ہوسکے گا۔ یا پھر معشوقہ بازی کی راہیں کھول دی جائیں۔ چونکہ دوسری صورت میں ہر معشوقہ کئی مردوں سے تعلق پیدا کرلے گی لہٰذا تقریباً بیوی والوں کی اکثریت عملاً چند بیویوں والے ہوجائیں گے۔

''کئی بیویوں'' کے جواز وعدم جواز کی بات یوں پیدا ہوتی ہے اور یہی صحیح انداز مسئلہ ہے مگر یورپی پروپیگنڈا کرنے والے حقیقتاً شکار نہیں کرنا چاہتے یہ لوگ در اصل معشوقہ بازی ویار بازی کے حامی ہیں، قانونی وشرعی بیوی کو بار دوش اور راستے کی رکاوٹ جانتے ہیں۔ یہ تو ایک بھی زائد مانتے ہیں، دو، تین اور چار بیویوں کی تو بات ہی چھوڑئے۔اصل لذت تو پابند ازدواج سے آزادی میں سمجھتے ہیں۔مگر بات بیوں کرتے ہیں کہ جیسے وہ ''ایک بیوی'' کے نظام کے حامی ہیں۔وہ بڑی معصومیت سے کہتے ہیں ہم تو اس کے طرفدار ہیں کہ ایک شوہر اور ایک بیوی ہو، دونوں وفادار ہوں

۔کئی ہمسر بے وفا ہم نہیں مانتے۔

بیسویں صدی کے مرد کی نیرنگیاں

بیسویں صدی کا مرد عائلی حقوق سے متعلق بے شمار مسائل میں الٹی جوتی مارنا چاہتا ہے۔ وہ مساوات و آزادی کے خوبصورت ناموں سے عورت کو بہلا کر اس کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں کو کم کر کے، بے حساب انداز سے اپنے کام بنانے کی فکر میں رہتا ہے۔مگر تعدد ازواج کے سوا بہت مسائل میں کامیاب ہوسکا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ میں کبھی کبھی ایرانی مصنفین اور مضمون نگاروں کے یہاں ایسی چیزیں دیکھتا ہوں تو ایک شک سے دوچار ہوجاتا ہوں کہ یہ لوگ سادہ دل ہیں یا گرفتار غفلت؟!

''تعدد ازواج'' کے بارے میں ایک صاحب لکھتے ہیں:

''آج کل ترقی یافتہ ملکوں میں باہمی ذمہ داریوں کی بنیا پر میاں بیوی کے تعلقات استوار ہوتے ہیں۔لہٰذا تعدد ازواج کی قانونی حیثیت (دائمی نکاح ہونا منقطع) عورت کی طرف سے بھی ویسی ہی مشکل ہے، جیسے شوہر سے چاہیں کہ رقیبوں کو اپنی عائلی زندگی میں برداشت کرے۔

مجھے نہیں معلوم کہ ان حضرات کے ذہن میں واقعاً صورت معاملہ یہی ہے یا جوتا الٹا پہن رہے ہیں؟ (جلدی میں بات کچھ سے کچھ کہہ رہے ہیں)

کیا واقعاً ان لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ ''تعدد ازواج'' معاشرتی مشکل کی وجہ سے ہے۔اس مشکل کی ذمہ داری تمام شادی شدہ مرد و زن پر ایک بوجھ کی صورت میں اور اس کا سب سے اچھا حل ''تعدد ازواج'' ہی ہے؟ کیا یہ نہیں جانتے کہ آنکھیں بند کر کے نعرے لگانا ''یک زوجہ'' نظام زندہ باد۔ ''کئی ازواجی نظام مردہ باد''

بیماری کا علاج نہیں ہے؟

کیا انہیں معلوم نہیں کہ تعدد ازواج عورت کے حقوق کا ایک حصہ ہے مرد کا نہیں زن و مرد کے تقابلی حقوق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے؟

مضحکہ خیر بات ہے کہتے ہیں:

''تعدادوجات'' عورتوں کی طرف سے اتنا ہی مشکل کام ہے عورت بھی چاہتی ہے کہ ازدواجی زندگی کے دوران مرد بھی اپنے رقیبوں کو برداشت کرے۔ اس سے قطع نظر کہ دونوں باتوں کا قیاس غلط ہے۔ شائد وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ آج کی دنیا میں کچھ حضرات ہرنئی چیز کو آنکھ بند کر کے قبول کر لیتے ہیں اور ماجرے کی صحت میں کوئی شک وتردو صحیح نہیں سمجھتے آج کی دنیا مرد سے مطالبہ کرتی ہے کہ اپنی بیوی کے عشق کا احترام کرے اور تعلقات زن وشوہر کے ہوتے ہوئے اپنے رقیبوں کو سہے۔ آج کی دنیا ''نا قابل برداشت باتوں'' کو حسد تعصب اور فیٹزم جیسے ناموں سے ٹھکراتی ہے ۔ کاش ہمارے جوانوں کو یورپ میں اس کے ضمن میں ہونے والے واقعات کی تھوڑی سی بھی آگاہی ہوجاتی۔

تعدد ازواج مرد کی فطری مانگ نہیں یہ سماج سے ابھرنے والی ایک ضرورت ہے اگر اس نظریے سے دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ اگر کسی سماج میں شوہروں کی خواہشمند خواتین کی نسبت ان مردوں سے زیادہ نہ ہو جو ہمسر و رفیقہ حیات کے متلاشی ہوں تو ''کئی بیویوں'' کا دستور خود بخود یا تو بالکل ختم ہوجائے گا یا کمی آجائے گی۔ اور اگر ایسے حالات میں (کہ فرض کیجئے عورتیں عدد کثرت کی وجہ سے معاشرے سے خانہ آبادی چاہتی ہوں) قانون تعدد ازواج ختم کر دیا جائے تو فقط یہ اقدام نہ کافی ہوگا نہ صحیح ہوگا۔ اس کیلئے کچھ اور اقدامات ضروری ہوں گے:

ا۔ عدالت اجتماعی، ہر شخص کو روزگار مہیا کیا جائے ہر شخص کی اتنی

آمدنی رکھی جائے کہ جو شخص بھی شادی کی ضرورت محسوس کرے وہ گھریلو مرکزی زندگی حاصل کر سکے۔

۲۔ عورتوں کو ارادہ وانتخاب کی آزادی دی جائے کہ وہ شوہر خود منتخب کر سکے۔ باپ یا بھائی یا کسی اور رشتے دار کو حق نہ ہو کہ وہ شادی شدہ بیوی والے دولت مند مرد سے اس عورت کو بیاہ دے، ظاہر ہے کہ عورت آزاد خود مختار ہو، اور اپنے لئے ایک مجرد شوہر کو تلاش کر سکے تو وہ ہرگز ایسے مرد کا انتخاب نہیں کرے گی جس کے گھر میں پہلے سے بیوی موجود ہو اور یہ سوت بن کر اس کے سر پر سوار ہو۔ عورت کے سرپرستوں کا طریقہ ہے کہ پیسے کے لالچ میں، لڑکی یا بہن کو بیوی والے مردوں کے ہاتھ بیچ دیا کرتے ہیں۔

۳۔ ہیجان آفرین، اغوا اور خانہ خرابی کی تحریکیں اس فراوانی نہ ہونے دی جائیں جن کے دباؤ سے شوہر دار بیویاں، شوہر کے گھر سے نکل کر اجنبی کے گھر نہ جانے پائیں۔ بن بیاہی بے شوہر عورتوں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔

معاشرہ اگر واقعۃً اصلاح احوال چاہتا ہے اور ''ایک بیوی'' ہی کا نظام پسند کرتا ہے تو مذکورہ تینوں اسباب وعوامل کو بروئے کار لائے۔ ورنہ تعدد ازواج کے دستور پر پابندی لگانے سے صرف عیاشی کی راہیں ہی کھل سکیں گی اور کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

بے شوہر خواتین کی محرومی سے پیدا ہونے والا بحران

جس صورت میں مردوں کی طلب گار عورتوں کی فراوانی ہو اور ضرورمندان ازواج مرد کم ہوں تو اس حالت میں ''تعدد ازواج'' پر پابندی لگانا انسانیت سے خیانت ہے۔ کیونکہ اس سے فقط حقوق خواتین ہی پامال نہیں ہوتے۔ اگر چند عورتوں کا حق تلف ہوتا تو شاید اسے برداشت کر لیا جاتا۔ مسئلہ تو وہ بحران ہے جو اس اقدام

کے بعد معاشرے میں سر اٹھائے گا اور وہ بحران ہر چیز سے زیادہ خطرناک ہوگا جبکہ بال بچوں کا گھر ہر مرکز سے زیادہ مقدس ہے۔

چونکہ جو اپنے فطری حق سے محروم ہوتا ہے وہ ایک موجود زندہ ہے۔ایک موجود زندہ اپنے تمام عائلات کے ساتھ جو محرومی و ناکامی میں ردعمل دکھاتا ہے کیونکہ وہ انسان ہے۔ روحانی ونفسیاتی الجھنوں کی ناکامیوں کے تمام حالات میں عورت ہے۔ زنانہ نیر رنگیوں کے ساتھ حوا کی بیٹی ہے ''آدم فریبی'' کی مکمل دست رس کے ساتھ۔

وہ جو اور گیہوں نہیں ہے کہ استعمال سے بچے تو سمندر میں پھینک دیں ،یا ''قحط سالی'' کے ڈر سے گودام میں رکھ دیں۔ وہ گھر اور کمرہ نہیں کہ ضرورت نہ ہوتو قفل ڈال دیں ہاں ،وہ ایک زندہ موجود ہے ایک انسان ہے ایک عورت ہے، وہ اپنی حیرت انگیز قوت کا مظاہرہ کرے گی اور معاشرے کے چھکے چھڑا دے گی۔ وہ برملا کہے گی:

سخن درست بگویم نمی توانم دید
کہ می خورند حریفان ومن نظارہ کنم

غالب نے اس کا مفہوم یوں ادا کیا ہے۔

غرلیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

یہی ''نمی توانم دید'' میں نہیں دیکھ سکتی، بہت کام کرے گی گھر اور خاندان ویران کریگی دشمنیاں اور کینے پیدا ہوں گے وہ دن انسان کیلئے کس قدر تباہ کن ہوگا جب انسانی جبلت اور قلبی گرھیں آپس میں متحد ہوجائیں۔

گھر سے محروم خواتین اس مرد کو اغوا کرنے کی کوشش کریں گی جس کے قدم کہیں بھی اتنی جلدی نہیں پھسلتے جتنی جلدی یہاں لڑکھڑاتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ

جب پھسلن زیادہ ہوتی ہے تو ہاتھی پھسل جاتے ہیں (چوگل بسیار شد پیلان بلغزند) افسوس تو یہ ہے کہ یہ پھسلن اگر تھوڑی بھی ہو تو اس ہاتھ کے پھسلنے کیلئے کافی ہے۔

پھر کیا بات یہیں ختم ہو جائے گی؟ نہیں۔ گھر بار والیوں کی باری اس کے بعد آئی گی، وہ بیویاں جو اپنے شوہروں کی خیانت کرتے دیکھیں گی وہ انتقام وخیانت کیلئے آگے آئیں گی وہ بھی شوہر کی خیانت کا پیچھا کریں گی۔ آخری نتیجہ کیا ہوگا؟

اس کا آخری نتیجہ ''کنیسی کی رپورٹ'' میں درج ہے اور وہ بھی ایک جملے میں:

''امریکہ کے مرد وعورت فساد وکج روی وخیانت میں اقوام عالم کے ہاتھ پشت پر باندھ چکے ہیں۔''

ملاحظہ فرمایئے کہ فقط مرد کی کج روی اور فساد ہی پر قصہ تمام نہیں ہوتا، اس آگ کا شعلہ خانہ نشین، بال بچوں والیوں کے دامن تک پہنچتا ہے۔

عورتوں کی فراوانی میں مختلف ردعمل

انسانی زندگی میں عورتوں کی عددی افزائش ہمیشہ رہی ہے اس کی وجہ سے اصل چیز اس کے ردعمل ہیں جو معاشرے میں کبھی ایک جیسے نہیں رہے۔ جن قوموں کے مزاج تقوی اور پاک دامنی سب سے وابستہ رہے وہ بڑے بڑے آسمانی ادیان کے وسیلے سے اس مشکل کو تعدد ازواج کے طور پر حل کرتی رہیں جن قوموں کا مزاج خوف خدا اور پاک دامنی سے زیادہ سازگار نہ تھا انہوں نے اس مشکل کا حل عیاشی سے نکالا۔

''تعدد ازواج'' نہ مشرق میں اسلام کی پیداوار ہے نہ اس کے چھوڑنے میں یورپ کے دین مسیح کا کوئی ہاتھ ہے۔ مشرق میں یہ دستور اسلام سے پہلے بھی تھا، یہاں کے مذاہب نے اس کی اجازت دی تھی، خود اصل دین مسیح ؑ میں بھی اس کی

ممانعت پر کوئی صریح حکم موجود نہیں۔ وہاں جو کچھ ہے وہ خود مغربی اقوام کے رسم ورواج کی بنا پر ہے، دین مسیح کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

جن قوموں نے عیاشی کا رویہ اپنایا ہے وہ ان قوموں سے زیادہ ہیں جن کا رویہ تعدد زوجات ہے اور انہوں نے ''یک ہمسری'' پر مضبوط چوٹ لگائی ہے۔

ڈاکٹر محمد حسین ہیکل، مصنف ''زندگانی محمدؐ'' تعدد ازواج کے بارے میں قرآن مجید کی آیتیں لکھنے کے بعد کہتے ہیں:

''یہ آیتیں ایک بیوی پر اکتفا کرنے کو بہتر قرار دیتی ہیں، اور ان کا مطلب ہے کہ اگر تم ڈرتے ہو کہ عدل کا رویہ نہ رکھ سکو گے تو بس ایک بیوی کرو۔ فوراً ہی اصرار کیا ہے کہ تم انصاف نہ رکھ سکو گے۔ اس صورت حال کے باوجود ممکن ہے کہ معاشرتی زندگی میں ایسے حادثے پیش آجائیں کہ تعدد ازواج کی ضرورت پڑے تو بشرط، عدالت اس کو جائز بھی قرار دیا ہے۔

جنگ کے دنوں میں جب مسلمانوں کے گروہ شہادت حاصل کرتے تھے اور فطرتاً بیوہ عورتیں رہ جاتی تھیں اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی دستور دیا تھا۔ کیا واقعی طور پر آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ لڑائیوں اور وباء اور شورشوں کے بعد جن میں ملینوں مرد ہلاک ہوتے ہیں اور بے شمار عورتوں بے شوہر رہ جاتی ہیں۔ اس وقت بھی چند بیویوں کے بجائے ایک بیوی پر اکتفاد کرنا بہتر ہے؟ جب کہ چند بیویوں کی اجازت، عدل وانصاف کے رویے کے ساتھ دی گئی ہے اور بطور استثنا ہے؟

کیا یورپ کے عوام دعویٰ کر سکتے ہیں کہ جنگ عظیم کے بعد ایک بیوی پر اکتفاد کا قانون جس طرح موجود تھا، عملاً بھی اسی طرح نافذ تھا؟

چندازواجی کے مشکلات وعیوب

خوشی۔ سعادت۔ برکت۔ خوش حالی۔ خلوص۔ درگزر۔جاں نثاری۔ وحدت ویگانگت غرض سب کچھ ایک گھراور بیوی ایک میاں کو نصیب ہوتا ہے۔ چندازواج زندگی میں یہ سب باتیں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔

دومائیں رکھنے والے بچوں کی تباہ حالی سے قطع نظر،خود شوہر کی ذمے داریاں کئی بیویوں کے ساتھ اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ وہ ان میں ٹوٹ پھوٹ کررہ جاتا ہے۔ان مشکلات کا سامنا دراصل مسرت وآسودگی کو پس پشت ڈالنے کی برابر ہے۔

تعدد ازواج سے خوش ومطمئن لوگوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جوعملی طور پر اپنی شرعی واخلاقی ذمہ داریاں پوری نہیں کرتے۔ایک بیوی سے زیادہ محبت کرتے اوردوسری کونظرانداز کردیتے ہیں۔قرآن مجیداس بدنصیب کی ''تعبیر کا معلقہ'' سے کرتا ہے شوہر اسے ہوا میں معلق چھوڑ دیتے ہیں۔اس قسم کے لوگ جب تعدد ازواج کا نام لیتے ہیں تو دراصل ان کا مقصد''ایک بیوی'' ہوتی ہے بہ ضمیمہ ظلم وستم،جرم وبیدادگری۔

ایک بازاری محاورہ لوگوں کی زبان ہے:''ایک خداایک بیوی''۔

اکثر لوگوں کا خیال یہی تھا اوراب بھی یہی ہے۔ اور حقیقت میں اگر خوشی ومسرت کو معیار سمجھا جائے اور مسئلے کا انفرادی اور شخصی زاویے سے جائز لیں تو یہ خیال بالکل ٹھیک ہے۔ ممکن ہے سب شوہروں کے بارے میں صحیح نہ ہو، اکثریت کیلئے تو بہر حال ٹھیک ہے۔

اگرکوئی شوہر تمام شرعی واخلاقی ذمہ داریاں قبول کرنے کے بعد بھی تعدد ازواج کو اپنے لئے مفید سمجھتا اورتن آسانی چاہتا ہے تو یقیناً اسے بڑی غلط فہمی ہے ''ایک بیوی'' خوشیوں اور راحتوں کی ضمانت کے لحاظ سے ''کئی بیویوں'' پر بہر حال اور مسلم طور پر بہتر و برتر ہے لیکن ....

تحقیق کا صحیح راستہ

تعدد ازواج جیسے مسائل کے صحیح اور غلط ہونے کی چھان بین کا یہ طریقہ صحیح نہیں ہے، یہ مسئلہ شخصی اور سماجی مسئلہ ہے۔ اس کا قیاس ''ایک بیوی'' کے مسئلہ سے غلط ہے۔

اس قسم کے مسائل کا حل اس بات سے وابستہ ہے کہ ایک طرف تو ہم ایسے علل واسباب کو دیکھیں جن سے یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر یہ غور کریں کہ ان سے بے توجہی کے خطرناک نتائج کیا ہیں۔ دوسری طرف اس پر دھیان دیں کہ خود اس مسئلے یا مسائل سے کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ پھر دونوں زاویوں سے جو آثار ونتائج سامنے آئیں ان کا جائزہ لیں۔ ان مسائل پر گفتگو اور ان کے واقعی حل کا تنہا یہی ایک راستہ ہے، جس سے تحقیق کرنا چاہیے۔ وضاحت کیلئے ایک مثال:

فرض کریں ۔ جبری فوجی بھرتی کی رائے ہے۔ اگر اس مسئلے کو فقط نفع اور جس گھر سے اس سپاہی کا تعلق ہے اس خاندان کے رجحانات کے زاویے سے

دیکھیں تو قانون کا یہ اقدام اچھا نہیں۔ کس قدر اچھا ہوتا اگر سپاہی بھرتی ہونے کا یہ قانون نہ ہوتا اور خاندان کا مجبور فرزندان کی گود سے دور نہ ہوتا، میدان جنگ میں جا کر خاک وخون میں نہ نہاتا۔

لیکن مسئلے کی تحقیق کا یہ صحیح انداز نہیں ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ کسی خاندان سے ایک جوان بیٹے کا جدا ہونا، نیز ممکن حد تک گھر والوں کیلئے غم نصیبی کو سامنے رکھنے کے بعد ملک کے دفاع میں سپاہیوں کی عدم موجودگی سے پیدا ہونے والے بدترین نتائج پر غور کریں، پھر منطقی اور معقول بات معلوم ہوگی کہ فرزندان وطن کا ایک گروہ ''سپاہی'' کے نام سے ملک اور ملت پر جان نثاری کیلئے موجود ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلے سے خاندان کو رنج برداشت کرنا چاہئے۔

ہم گزشتہ مقالات میں شخصی اور سماجی ضرورتوں کی تعدد ازواج کی وجہ جواز بتایا ہے۔ اب ہم تعدد ازواج سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہیں۔ اس طرح ایک مجموعی حساب کا راستہ ہموار ہو سکے گا۔ نیز اسی سلسلے میں یہ بھی واضح ہوجائیگا کہ ہم تعدد ازواج کی خرابیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ اگرچہ بہت سے اعتراضات تسلیم بھی نہیں کرتے جیسا کہ عنقریب عیاں ہوگا۔ تعدد ازواج کی بہت سی خرابیاں بیان ہوسکتی ہیں اور ہم مختلف پہلوؤں سے بحث شروع کررہے ہیں۔ ان اعتراضات اور خرابیوں کا بیان یہ ہے:

روحانی زاویہ نظر

زن وشوہر کا رشتہ فقط مادی وجسمانی ہی نہیں ہے یہی نہیں کہ یہ تعلق بدنی لمس اور مالی امداد کا ہو۔ اگر یہی بات ہوتی تو کئی بیویوں کا نظام ایک تاویل رکھ سکتا تھا۔ کیونکہ مادی وجسمانی معاملات کو متعدد افراد میں تقسیم کیا جاسکتا تھا اور ہر ایک کا ایک

حصہ ہوتا۔

میاں بیوی کے رشتے میں عمدہ اور ساسی بات روحانی اور حقیقی معاملات ہیں ۔عشق وہ جذبہ ہے۔۔شادی کی مرکزیت دودلوں کوجھوڑنے کا سبب ہے ہر اندرونی حسن کی طرح عشق واحساسات قابل تجزیہ وتقسیم نہیں ہیں۔انہیں توڑ پھوڑ کرڈھیریاں لگا کرر آدمیوں میں بانٹانہیں جاسکتا۔بھلاممکن ہے کہ دل کے دوٹکڑے کردیے جائیں یاایک دل دوجگہ رہن رکھا جاسکتا ہے؟ کیاایک دل دوآدمیوں کو دیناممکن ہے؟عشق وپرستش یکتائی چاہتی ہے،اس میں شریک ورقیب کی گنجائش نہیں ہے۔گندم اور جونہیں کہ پیمانے میں ناپ ناپ کر ہرایک کواس کا حصہ دیاجاسکے۔اس کے جذبات کنٹرول میں نہیں آسکتے،لہٰذاروح ازدواج اورانسانی پہلو،دوانسانوں کاتعلق،دوجانوروں کی طرح فقط شہوت اورجنسی نہیں ہے۔ یہ تعلق ناقابل تقسیم ہے نالائق انضباط ۔لہٰذاتعدادزواج بری چیز ہے۔

ہمارے خیال میں اس گفتگو میں کچھ زیادہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ٹھیک ہےشادی کی روح جذبات واحساسات ہیں۔یہ بھی ٹھیک ہے کہ قلبی احساسات آدمی کے اختیار میں نہیں ہوتے۔مگر۔جذبات واحساسات قابل تقسیم نہیں۔یہ شاعرانہ تخیل ہے، یہ مغالطہ ہے۔اس میں تو بحث نہیں کہ خاص احساسات کسی حسہ جسم کے مانند دونہیں کیے جاسکتے اور ہرشخص کواس کا حصہ نہیں دیاجاسکتا۔جس پر یہ نتیجہ چسپان ہوا کہ روحانی اورنفسیاتی امور بھی قابل تقسیم نہیں ہیں۔بحث روح بشر کی گنجائش میں ہے،طے شدہ بات ہے کہ آدمی کی روح میں اتنی تنگی نہیں ہے کہ دو رشتے اس میں نہ سماسکیں۔ایک باپ دس بیٹوں کو پرستش کی حدتک محبوب رکھتا ہے۔ہرایک پرجان بھی قربان کرتا ہے۔

ہاں ایک بات ضرور ہے کہ کثرت کی وجہ سے محبت وہ عروج نہیں پاتی

جو وحدت کی صورت میں ہوسکتی ہے۔عشق وجذبات کی آخری معراج کثرت سے جوڑ نہیں کھاتی۔اور عشق کیا،عشق و منطق بھی اس سے ہم آہنگ نہیں۔

رسل نے شادی اور اخلاق پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بہت سے افراد،آج کا عشق کو احساسات وجذبات کا منصفانہ تبادلہ جانتے ہیں۔تعدد ازدواج کو مسترد کرنے کیلئے دوسری دلیلوں کو چھوڑ کر یہی دلیل کافی ہے۔''

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ''جذبات کی منصفانہ تقسیم کی جائے،تو دلیل اسی میں منحصر کیوں ہے؟ آخر باپ اپنی تمام اولاد سے محبت نہیں کرتا، اور وہ سب باپ کو نہیں چاہتے یہاں،جذبات کا منصفانہ تبادلہ نہیں ہوتا؟ اتفاق دیکھئے کہ اولاد کی تعداد کافی ہو، باپ کا رشتہ الفت ہر ایک سے ایسا ہوتا ہے کہ اولاد کے فرداً فرداً جذبہ الفت پر غالب آتا ہے۔

حیرت ہے۔بات وہ کر رہا ہے جو ہمیشہ شوہروں کو سمجھاتا ہے کہ بیوی کے عشق کو بیگانی عورت کے مقابلے میں قابل احترام سمجھیں اور ان کے غیر سے معاشقہ کو نہ روکیں، پھر بیویوں کو بھی یہی نصیحت کرتا ہے۔کیا واقعاً رسل کے نزدیک میاں بیوی کے جذبات کا منصفانہ تبادلہ ہوسکتا ہے؟

تربیتی نقطہ نظر

سوت کا وجود، نااتفاقی کا مشہور ذریعہ ہے۔بیوی کی نظر میں سوت سے بڑا دشمن کوئی نہیں''تعدد ازدواج'' بیویوں کی آپس میں اور کبھی شوہر کے خلاف آدمی جنگ بلکہ میدان جنگ میں لانے کا ایک طریقہ ہے۔ایک بیوی بچے والے گھر کو خلوص اور محبت کی ٹھنڈک سے پرسکون ہونا چاہئے۔ماؤوں کی دشمنیاں اور انتقام طلبی کی دھکتی

آگ بچوں میں دوڑ جاتی ہے، دو، دو۔ تین، تین گروہ بن جاتے ہیں۔ گھر کا ماحول جیسے بچوں کا پہلا مدرسہ تعلیم وتربیت روح ہونا چاہے، جہاں نیکی ورحم ومحبت کا سبق ملنا چاہئے وہاں نفاق اور غیر شریفانہ باتیں سکھائی جانے لگتی ہیں۔

تعدد ازواج سے اس قسم کے نامناسب تربیتی نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں ہے لیکن ایک بات یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ نتائج کتنے تعدد ازواج کے خمیر سے پیدا ہوتے ہیں اور کتنے اس کج روی کی وجہ سے جنم لیتے ہیں جو میاں اور دوسری بیوی کے رویے میں آجاتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ بے چینیاں سب کی سب تعدد ازواج کے خمیر کی پیدا کردہ نہیں ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر باہمی رویوں کی پیداوار ہیں۔

ایک میاں بیوی باہم زندگی بسر کرتے ہیں دونوں کی زندگی اپنی اپنی ڈگر پر چلتی رہتی ہے۔ اسی اثنا میں مرد ایک اتفاقی حادثہ کے طور پر دوسری عورت پر فریضتہ ہوجاتا ہے، اس کے دماغ میں ''چند ہم سری'' کا سودا سماجاتا ہے وہ خفیہ طور پر قول قرار کرلیتا ہے، ناگہاں دوسری بیوی آسمان سے آنے والی موت بن کر، پہلی بیوی کے آشیانے یا گھر میں نازل ہوجاتی ہے۔ اس کے شوہر اور خود اس کے ساتھ رفیق وشفیق بن بیٹھتی ہے اس کی زندگی پر شب خوں مارتی ہے۔ صاف سی بات ہے کہ اس پہلی بیوی کا ردعمل کینہ وانتقام کے علاوہ اور کیا ہو۔ بیوی کیلئے سب سے زیادہ پریشاں کن بات یہ ہے کہ اس کا شوہر اسے حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ عورت کی سب سے بڑی شکست یہ ہے کہ یہ سمجھ لے کہ میں اپنے شوہر کا دل نہ بچاسکی۔ اب وہ کسی اور کو دوست بنا رہا ہے جب مرد خودسری وہوس رانی کی راہ غلط پر آتا اور دوسری بیوی شب خون کرنے لگتی ہے۔ تو پھر پہلی بیوی سے تحمل وبرداشت کی توقع فضول ہے۔

ہاں اگر پہلی بیوی کو شوہر کے اس عمل کی وجہ جواز معلوم ہو۔ مثلاً وہ سیر

نہیں ہوا۔ اور تعدد ازواج سے وہ اسے پیٹھ نہیں دکھانا چاہتا۔ مرد بھی ہوس رانی کا غلط راستہ اور خودسری چھوڑ دے۔ پہلی بیوی کے ساتھ جذبات واحترامات کا رشتہ برقرار رکھے، دوسری بھی دھیان رکھے کہ پہلی کے حقوق ہیں۔ وہ حقوق قابل احترام بھی ہیں ان پر دست درازی جائز نہیں ہے۔ خصوصاً سب مل کر ایک سماجی مشکل کو حل کرنے کی فکر میں رہیں، تو یقیناً اندرونی بے چینیاں کم ہو جائیں۔

قانون تعدد ازواج، سماجی مشکل کا ایک ترقی پسندانہ حل ہے۔ اس قانون کو نافذ کرنے والے کو بھی ذرا اونچی سطح سے دیکھنا چاہیے۔ اس اعلیٰ درجے کی اسلامی تربیت سے آراستہ ہونے کی ضرورت ہے۔

تجربہ نے بتایا ہے۔ جب اور جہاں مرد نے خودسری و ہوس رانی کے غلط رویے سے دامن بچایا اور بیوی نے واقعاً محسوس کیا کہ اس کے شوہر کو دوسری بیوی کی ضرورت ہے تو وہ خود آگے بڑھی اور دوسری بیوی کو اپنے شوہر کے گھر میں لائی ہے اور مذکورہ بالا برائیوں میں سے کوئی بھی برائی دیکھنے میں نہیں آئی۔ اکثر بے چینیوں کا سبب مرد کا وہ غیر انسانی رویہ ہوتا ہے جو وہ اس قانون کے اجرا میں اختیار کرتا ہے۔

اخلاقی زاویہ نظر

کہتے ہیں تعدد ازدواج کی اجازت، گھٹیا حرص اور شہوت رانی کی اجازت ہے۔ مرد کو ہوس پرستی کی اجازت دی گئی ہے۔ اخلاق کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی شہوت کو ممکن حد تک کم سے کم کرتا جائے کیونکہ آدمی کا مزاج ایسا ہے کہ جس قدر شہوت کے راستے کھلے رکھے گا اس قدر اس کی رغبت اور اس کا شوق بڑھتا جائے گا، ہوس کی آگ بڑھکتی جائے گی۔

مان ٹسکو نے ''روح القوانین'' ص334 پر کئی بیویوں پر یہ رائے دی ہے:

''شاہ مراکش کے حرم میں سفید وزرد وسیاہ پوست، ہر نسل وقوم کی عورتیں ہیں۔ یہ شخص اگران سے دوگنی عورتیں بھی حاصل کرلے جب بھی ایک نئی نویلی دلہن کا طلب گار رہے گا۔ کیونکہ ہوس پرستی، خست کی طرح بڑھنے والی چیز ہے۔ دولت جس قدر بڑھتی جائے ......تعدد ازواج گھٹیا درجے کی عشق بازی ہے اور خلاف فطری (ہم جنس بازی) کو بھی تجربے میں لاتی اور معاشرے میں پھیلاتی ہے۔ شہوت رانی کی راہ میں جو عمل بھی حد سے باہر ہوگا، مزید بے قاعدگی کا سبب بنے گا جب اسلامیوں میں شورش ہوگئی تو اس وقت بادشاہ کے محل میں ایک بیوی بھی نہ تھی، حکمران صاحب خلاف فطرت عشق بازی میں دن رات گزار رہے تھے۔''

یہ اعتراض دو پہلوؤں سے بحث ونظر کا طلب ہے۔

ا۔ پاکیزگی اخلاق، افعال شہوت کے خلاف ہے، پاکیزگی نفس کیلئے شہوت کو کم سے کم تر کیا جائے۔

۲۔ انسانی نفسیات کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی جس قدر فطرت کے ساتھ چلے گا سرکشی بڑھتی جائے گی اور جس قدر اس کی مخالفت کرے گا اسی قدر اس میں ٹھہراؤ آئے گا۔

پہلا زاویہ، افسوس ہے کہ یہ ایک غلط تعلیم ہے اور اس مسیحیت پر قائم ہے جس کی اساس ''ریاضیت'' ہے اس ہندو، بدھ اور........... جیسے نظریات و مذاہب کی اسی پر چھاپ ہے اسلامی اخلاق کی اساس کچھ اور ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے یہ نہیں کہ

شہوت کو جس قدر کم کیا جائے اخلاق سے زیادہ قریب ہے۔ اور اگر صفر پر پہنچ جائے تو سو فیصد اخلاقی ہے۔ اسلام کی نظر میں شہوت رانی میں افراط اصول اخلاق کے خلاف ہے۔

تعدد ازواج، افراطی عمل ہے، یا نہیں؟ تو یہ دیکھیں کہ فطرت نے مرد کیلئے ''یک ہم سری'' ہی رکھی ہے اور چند ہم سری کو انحرافی و افراطی عمل قرار دیا ہے۔

اکتیس ویں (31) مقالے میں معلوم ہوا کہ آج کل شاید کوئی بھی پیدا نہ ہو جائے جو مرد کی فطرت کی ''یک ہم سری'' کا قائل ہو اور چند ہمسری کی خلاف فطرت مانتا ہو بلکہ اس کے برعکس بعض کی رائے یہ ہے کہ مرد کی فطرت چند ہمسری سے زیادہ مناسب ہے اور ایک ہمسری مجرد کی طرح خلاف فطری ہے ہم اس نظریے کے اگرچہ مخالف ہیں لیکن مرد کی فطرت ایک ہم سری کے قابل بھی نہیں۔

مان ٹسکو کی طرح جن لوگوں نے تعدد ازواج کو شہوت پرستی کے ہم پلے مانا ہے ان کی نظر حرم سرا بازی خلفاء بنی عباس و بنی عثمان پر ہے۔ اسلام، سب سے آگے اور سب سے زیادہ اس کردار کے خلاف ہے۔ اسلام نے تعدد ازواج پر جو حدو قید لگائی ہے اس سے ہوس رانی و آزادی مرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

رہا بحث کا دوسرا تمہیدی پہلو'' آدمی کی طبیعت جس قدر راضی رکھی جائے اتنی ہی سرکش ہوتی جاتی ہے اور جس قدر مخالفت کی جائے اسی قدر ٹھنڈی رہتی ہے۔''۔۔ یہ نظریہ بالکل فرائیڈ کے نظریہ کے مقابلے میں ہے کہ آج بھی فرائیڈ کے ماننے والے اس کا پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں۔

فرائیڈ ازم والے کہتے ہیں۔ طبیعت کو جس قدر مطمئن کیا جائے سکون اور جتنا دبایا جائے اتنا ہی منہ زور ہوتی ہے، سرکشی دکھاتی ہے، لہٰذا ان لوگوں کا شمار اس گروہ میں جو سو فیصد آزادی اور رسم ورواج، ادب وآداب کو درہم برہم کرنے والا گروہ

ہے۔خاص کر جنسی معاملات میں ۔۔کاش ،مان ٹسکو زندہ ہوتا۔اور دیکھتا کہ اس کے نظریات فرائیڈ اوراس کے پرستاروں نے کس طرح استعمال کئے ہیں۔اس کی فرضیوں کا کتنا مذاق اڑایا ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے دونوں خیال غلط ہیں کیونکہ طبیعت وفطرت کے کچھ حقوق وحدود ہی ان حقوق وحدود کو سمجھنا اور پہچاننا ضروری ہے۔طبیعت (فطرت) دو چیزوں کے نتیجے میں سرکشی کرتی اور سکون کو درہم وبرہم کرڈالتی ہے۔ایک محرومی وناکامی ،دوسرے اس کے سامنے لگی ہوئی ہر حدوقید سے مکمل آزادی۔

بہرحال تعدداز واج ضدومخالف اخلاق نہیں نہ اس سے پاکیزگی نفس اورروح کا سکون متاثر ہوتا ہے، جو مان ٹسکو کا خیال ہے۔نہ ایک یا چند شرعی بیویوں پر قناعت واکتفا خلاف اخلاق ہے۔جیسے فرائیڈ اوراس کے ماننے والے جن کا ہروقت عملی مظاہرہ اسی نظام کے تحت چاہتے ہیں۔

قانونی نقطہ نظر

عقدازدواج کے بموجب میاں بیوی دونوں ایک دوسرے سے وابستہ اورایک دوسرے کے قبضے میں آجاتے ہیں ایک دوسرے سے لذت اندوزی کا جو ربط پیدا ہوتا ہے۔اس کا سبب شادی کے منافع کی ملکیت ہے جو عقدازدواج کے بموجب ہے ۔لہٰذا تعددزوجات کی صورت میں صاحب حق پہلی زوجہ ہے۔اس کے بعد جو معاملہ بھی شوہراور کسی غیر عورت کے درمیان طے ہوتا ہے وہ دراصل ''فضولی'' ہے۔ (قانونی حیثیت سے کمزور ہے) دلیل یہ ہے کہ مرد کے منافع زن وشوہراب سے پہلے زوجہ اول کے ہاتھ بک چکے ہیں۔ اوروہی ان کی مالک سمجھی جاتی ہے اس بنا پر اولیت اسی کو حاصل ہے اوراس کی طرف توجہ رہنا چاہیے۔اس سے اجازت لینا

چاہیے اس کے بعد اگر تعدد ازواج کی اجازت دی جائے تو اسے پہلی بیوی کی رضا مندی کے حوالے سے ہونا چاہیے۔ دراصل پہلی بیوی ہی اپنے شوہر کے بارے میں فیصلہ کرسکتی ہے کہ وہ دوسری شادی کرلے یا نہ کرے۔

تو دوسری، تیسری اور چوتھی شادی کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ایک مرتبہ اپنا مال بیچ ڈالے پھراسی بکے ہوئے مال کو دوسری تیسری اور چوتھی مرتبہ الگ الگ خریداروں کے ہاتھ بیچے۔ اگر بیچنے والا وہی مال بعد والوں کے قبضے میں دیدے تو مستحق سزا ہے۔

یہ اعتراض اس نکتے پر اٹھ سکتا ہے کہ ''فطرت حقوق ازدواج'' کی منافع کا تبادلہ فرض کیا جائے۔ یعنی میاں بیوی کو ''زن وشوہر کے منافع'' کو ہر دوسرے فریق کو مالک مانا جائے۔ ہم سردست اس بات سے بحث نہیں کرتے کہ یہ نکتہ اعتراض و تنقیح طلب ہے یا نہیں۔ فرض کریں کہ ازدواج کی قانونی فطرت یہی ہو۔ جب بھی اعتراض اس صورت میں ہو تو ممکن ہے کہ مرد کی طرف سے نئی چیز اور تنوع پسندی کا پہلو پایا جاتا ہو۔ تو پھر ماننا پڑے گا ازدواج کی قانونی حیثیت ''زن وشو'' (میاں بیوی) کے منافع کا تبادلہ ہی کی ہوگی۔ اور بیوی ہر لحاظ سے بالا دست ہوگی اسے شوہر کے مفادات کا لحاظ کرنا ہوگا اور شوہر کیلئے کوئی وجہ جواز نہ ہوگی کہ کئی بیویاں خود سے کرسکے لیکن جس صورت میں مرد کا جذبہ تنوع پسندی نہ ہو بلکہ گزشتہ مقالات میں بیان کردہ اسباب میں سے کوئی اور داعی ہو، اس وقت تو یہ اعتراض بے محل ہو جائے گا۔ مثلاً بیوی بانجھ ہو، یا اس عمر کی ہو جب بچہ نہیں ہوا کرتا (یائسہ ہو) اور مرد اولاد کا محتاج ہو۔ یا بیوی مریض ہو اور شوہر اس سے لذت نہیں حاصل کرسکتا۔ یہ ایسے مقالات ہیں جہاں بیوی کو کئی بیویاں کرنے سے روکنے کا حق نہیں ہوسکتا۔

یہ صورت حال وہ تھی جہاں تعدد ازواج کی وجہ جواز، انفرادی پہلو اور وہ بھی

شوہر کی ذات سے متعلق ہو، لیکن اگر اس معاملے میں معاشرتی قدم بھی آ جائے اور تعدد ازواج کی بنیاد عورتوں کی فراوانی اور مردوں کی کمی ہو۔ یا۔ معاشرے کو افرادی قوت درکار ہو اور تعدد ازواج اس مقصد کیلئے تجویز کیا جائے ،تو پھر صورت مسئلہ کچھ اور ہو گی ،ان مقالات پر تعدد ازواج قانونی فرض اور باصطلاح فقہ ''واجب کفائی '' ہوگا۔ معاشرے سے عیاشی واوباشی کے خاتمے ، یا معاشرے میں افراد کی عددی افزائش کی خاطر یہ ذمے داری تو اٹھانا پڑے گی۔ بدیہی بات ہے کہ جب ذمہ داری اور سماج کی طرف سے فریضہ عائد ہو جائے تو اجازت و رضامندی وقبول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرض کریں۔ معاشرہ واقعاً عورتوں کی فراوانی میں مبتلا ہے یا اسے افراد کی عددی کثرت کی ضرورت ہے تو شرعی ذمہ داری اور واجب کفائی کا حکم تمام بال بچے والے میاں بیوی پر نافذ ہوگا۔ گھر والی خواتین کو فداکاری و جاں نثاری کا وہی مظاہرہ کرنا ہو گا جو لڑکے کے فوج میں داخل ہونے کے وقت کیا جاتا ہے۔ کہ معاشرے کے تحفظ کیلئے محاذ جنگ پر جا سکے۔ ان مقامات پر ایک یا کئی افراد کی رضامندی کا حوالہ غلط ہوگا۔

جو لوگ زور دیتے کہ حق وعدالت کا تقاضہ ہے کہ تعدد ازواج پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر نہ ہو ان کی نظر فقط مرد کی تنوع طلبی پر رہی ہے، وہ انفرادی ومعاشرتی ضرورتوں کو بھلا بیٹھے ہیں۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ اگر انفرادی یا معاشرتی ضرورت موجود نہ ہو تو کئی بیویوں کا جواز ہی قابل قبول نہ ہوگا اس میں پہلی بیوی کی اجازت کے ہونے نہ ہونے کی بات ہی کیا رہ جاتی ہے۔

فلسفی نقطہ نظر

مساوات حقوق زن و مرد ،فلسفی اصول ہے۔ اس کی بنیاد ہے کہ دونوں

انسانیت میں برابر ہیں لہٰذا قانون تعدداز واج خلاف اصول فلسفی ہے۔ چونکہ زن ومرد دومتساوی الحقوق انسان ہیں اس لئے یا دونوں کوحق دیا جائے کہ متعدد ہم سر رکھ سکیں یا کسی کو اجازت نہ ہو، مرد کوئی بیویوں کا حق ہواور عورت کو چند شوہر رکھنے سے محروم رکھنا طبقہ پرستی ومردنوازی ہے۔

مرد کو چار بیویاں کرنے کا حق دینے کا مطلب یہ ہے کہ ایک عورت کی ویلیو مرد کے ۱/۴ (چوتھے حصے) کے برابر ہے عورت کی یہ بہت بڑی توہین ہے۔حتیٰ کہ اسلام نے بھی میراث اور گواہی میں عورت کو مرد کے نصف کے مساوی مانا اور دوعورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر قرار دی ہے۔لیکن قانون تعدداز دواج اس کے بھی منافی ہے۔

تعدداز واج پر یہ اعتراض سب سے زیادہ حقیر ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ معترض کو بالکل معلوم نہیں کہ تعدداز واج کے فرد ومعاشرتی زاویے سے موجبات وعلل واسباب کیا ہیں؟ اس طرح معترض کی ذراسی توجہ نہیں ہے معترض کا خیال ہے کہ موضوع زیر بحث ۔۔ ہوس ہے۔ جب ہی تو کہا ہے کہ مرد کی ہوس کو تو دیکھا گیا اور عورتوں کی ہوس نظرانداز کردی۔

گزشتہ صفحات میں تعدداز واج کے علل وموجبات ومجوزات واسباب پر گفتگو ہو چکی، خصوصاً یہ اہمیت بھی یاد دلائی جا چکی کہ جب نے شوہر عورتیں شادی شدہ مردوں سے زیادہ ہوں تو بیاہتا جوڑوں میں میاں بیوی دونوں پر یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ ایسی خواتین کو گھروں میں بسائیں اب اس پر زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتا۔

اس مرحلے میں اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ اگر تعدداز واج ومیراث وشہادت میں اسلام کے فلسفے کی بنیاد حقوق خواتین کی توہین اوران سے بے توجہی ہوتی اوراسلام انسانیت کی سطح پر پیدا ہونے والے حقوق میں اختلاف وفرق مراتب کا قائل ہوتا تو

ہر مسئلہ میں حکم کی نوعیت یکساں ہوتی ۔ کیونکہ یہ فلسفہ ہر جگہ یکساں اطلاق پذیر قرار پاتا۔ اسلام نے کہیں یہ نہیں کہا کہ ایک عورت کی میراث ایک مرد کی نصف میراث کے برابر ہے اور کہیں یہ کہا کہ ایک عورت کو مرد کے برابر ترکے میں حصے ملے گا اور کہیں بھی ہر مسئلے کا حکم الگ ہے۔ ان باتوں سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ اسلام کی نظر کچھ اور فلسفوں پر ہے اور اس کی قانون سازی کی سائنس اور ہے ہم میرث کے بارے میں گزشتہ مباحث میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ ایک اور مقالے میں یہ بھی بتا چکے ہیں کہ انسانیت میں زن و مرد کی مساوات اور انسانیت کی بنیاد پر پیدا ہونے والے حقوق زن و مرد کا احترام، اسلام کی نظر میں حقوق انسانی کی الف نے کا درجہ رکھتا ہے۔ اسلام زن و مرد کے حقوق مساوات کے درجے سے بلند رکھتا ہے اس بات کا گہری نظر سے مطالعہ ضروری ہے۔ اور ان کا نفاذ بھی لازم ہے۔

چند ازواجی دستور میں اسلام کا کردار

اسلام نے یہ تو چند ازواجی دستور کو ایجاد کیا نہ اسے منسوخ کیا اسلام سے صدیوں پہلے یہ نظام دنیا میں موجود تھا اور اب معاشرے میں ایسے مشکلات پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا حل صرف تعدد ازواج ہی میں اسلام اسی کا حامی ہے۔

لیکن اسلام نے چند ازواجی دستور میں اصلاحات ضرور کیے ہیں۔

محدودیت

پہلی اصلاح۔۔ اسلام نے تعدد ازواج کی رسم میں ایک اقدام یہ کیا کہ اسے محدود کر دیا۔ اسلام سے پہلے ''چند ازواجی'' دستور لامحدود تھا، ایک مرد سینکڑوں عورتیں رکھ سکتا تھا۔ یوں حرم سرائی پیدا ہوئی۔ اسلام نے زیادہ سے زیادہ کی حد مقرر کر دی۔ ایک آدمی کو چار شادیاں کرنے اور چار بیویوں سے زیادہ بیویاں رکھنے سے روک دیا۔ آغاز اسلام میں ایسے افراد تھے، حکایات وروایات میں ان لوگوں کے نام موجود ہیں جو اسلام لائے اور ان کے گھروں میں چار سے زیادہ بیویاں تھیں، اسلام نے ان سے مطالبہ کیا اور انہوں نے زائد بیویوں کو رخصت کر دیا۔ غلیان ابن اسلمہ کی دس بیویاں تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ چھ بیویوں کو رخصت کر دے۔

شیعہ روایات میں ہے کہ۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے میں ایک ایرانی مجوسی نے اسلام قبول کیا اس کے گھر میں اس کی سات بیویاں تھیں امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس بارے میں دریافت کیا گیا، یہ شخص اسلام قبول کر چکا ہے ان سات بیویوں کے بارے میں یہ شخص کیا کرے امامؑ نے فرمایا:

تین بیویوں کو بہر حال رخصت کر دے۔

عدالت

دوسری اصلاح۔۔اسلام نے عدالت کی قید لگا دی اس نے اجازت نہ دی کہ بیویوں یا ان کی اولاد میں کسی قسم کی درجہ بندی ہو۔قرآن کریم نے صاف صاف کہا:

فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَةً

اگر تمہیں عدالت نہ کر سکنے کا خوف ہو تو پھر صرف ایک بیوی پر اکتفا کرو۔

اسلام کی آمد سے پہلے دنیا میں اصول عدالت کا خیال ہی نہ تھا، نہ بیویوں کے معاملات میں انصاف تھا نہ ان کی اولاد میں ۔مقالہ نمبر 7 2 میں کرسٹن سن اور دوسروں کی رائے نقل کی جا چکی کہ ایران کے ساسانی دور میں تعدد ازواج کی رسم عام تھی۔بیویوں اور بچوں کی درجہ بندی ہوتی تھی، ایک یا کئی بیویوں کو ''ممتاز محل'' کہا جاتا اور ''پادشاہ زن'' سے موسوم ہوتی تھیں۔انہیں تمام حقوق حاصل تھے ۔دوسری بیویاں نوکر سمجھی جاتی تھیں۔ انہیں قانونی حق بھی بہت کم نصیب تھے ۔نوکر بیویوں کی اولاد میں لڑکے قبول تھے ۔لڑکیاں باپ سے منسوب نہیں کی جا سکتی تھیں۔

اسلام نے اس رسم کو منسوخ کیا اسلام نے کسی بیوی اور اس کی اولاد کے قانونی حقوق میں کمتری و فرق کو مسترد کیا۔

ویل ڈیورانٹ نے ،تاریخ تمدن ،جلداول میں تعدداز واج پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

آہستہ آہستہ ایک ایک فرد کے پاس اچھا خاصہ سرمایہ جمع ہوتا گیا اسے فکر ہوئی کہ اگر اس کی دولت زیادہ حصہ داروں میں تقسیم کی گئی تو اس کی ہر اولاد کو بہت کم حصہ ملے گا ،اس کو فکر ہوئی پہلی بیوی اور دوسری بیوی ، نیز دوسری ہم خواب عورتوں میں فرق رکھے تاکہ میراث اصلی بیوی کی اولاد کو ملے۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ قدیم زمانے میں بیوی اور اولادوں کے درمیان فرق مراتب رائج تھا ،تعجب ہے کہ ویل ڈیورانٹ اپنی بات کہتے کہتے یہاں تک پہنچا: ''موجودہ نسل تک براعظم ایشیا میں یہ سلسلہ جاری رہا ،آہستہ آہستہ بیوی ایک ہی رہ گئی ، دوسری بیویاں یا محبوب عورتیں خفیہ ہوگئیں یا بالکل ختم ہوگئیں۔

ویل ڈیورانٹ نے یا تو خیال نہ کیا ، یا توجہ نہ کرنا چاہی کہ موجودہ صدیاں گزر گئیں ایشیا میں دین مقدس اسلام نے اولاد میں فرق مراتب ختم کردیا ہے ایک اصلی بیوی اور چند نجی محبوبائیں رکھنے کی رسم یورپ کی رسم ہے ایشیا کی نہیں آخری میں یہ دستور یورپ سے ایشیا میں آیا اور پھیلا ہے۔

بہرحال اسلام نے تعدداز واج کے بارے میں دوسری اصلاح یہ کی ہے کہ فرق مراتب کو مہمل قرار دیا ،سب بیویوں اور ان کی اولاد کو ایک درجہ دیا۔

اسلام کے نزدیک رنڈی بازی کسی شکل صورت میں جائز نہیں ،علماء اسلام تقریباً سب ہی متفق ہیں کہ بیویوں میں فرق مراتب ناجائز ہے ،ایک آدھ فقہی دبستان میں بیوی کے حق کی تشریح یوں کی گئی ہے جس سے بوئے فرق آتی ہے۔ میرے نزدیک

یہ بات قابل تردید ہے کہ قرآن کریم اس کے خلاف ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں عدل نہ برتے ایک بیوی کی طرف زیادہ جھکاؤ ظاہر کرے تو قیامت میں یوں محشور ہوگا کہ آدھا بدن زمین پر کھینچ کر چلے گا آخرکار جہنم میں داخل ہوجائے گا۔''

عدالت انسانی فضائل میں بہترین فضیلت ہے۔شرط عدالت کا مطلب سے بلندترین اخلاقی قوت کا مالک ہونا۔چونکہ عموماً شوہر کے جذبات تمام بیویوں کیلئے یکساں اور برابر نہیں ہوسکتے ،اس لئے عدالت کی نگہداشت اوران کی فرق نہ کرنا، مشکل ترین مرحلہ ہے جوشوہر کے ذمے ہے۔

سب کومعلوم ہے رسول اکرم ﷺ مدینے کے آخری دس برس میں جولڑائیوں کے دن تھے بے شوہر عورتیں مسلمانوں میں بکثرت موجود تھیں آنحضرتؐ نے جن سے شادیاں کیں وہ بیوہ اور بڑی عمر کی عورتیں تھیں اور اکثر کے پاس دوسرے شوہروں سے اولاد بھی تھی ایک اکیلی دوشیزہ حضرت عائشہؓ تھیں جس سے آپ نے شادی کی،حضرت عائشہؓ اس پر فخر کرتی تھیں کہ میں اکیلی بیوی ہوں جس نے آنحضرتؐ کے علاوہ کسی دوسرے مرد کا بدن لمس نہیں کیا۔

رسول اکرم ﷺ ازواج کے معاملات میں انتہائی عدالت کا برتاؤ کرتے تھے،ذرہ برابر فرق نہ برتتے تھے۔عروہ ابن زبیر حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے، انہوں نے اپنی خالہ سے آنحضرتؐ کی سیرت کے بارے میں کچھ سوال کیے۔حضرت عائشہ نے کہا: آنحضرتؐ اپنی سیرت کے مطابق ہم میں سے کسی کودوسری پر ترجیح نہ دیتے تھے۔سب کے ساتھ عدالت و یکسانیت کا برتاؤ کرتے تھے،بہت کم ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ اپنی تمام ازواج کے گھر نہ جائیں سب کی مزاج پرستی فرماتے حالات سے باخبر

رہتے تھے ۔جس خاتون کا دن ہوتا اس کے یہاں رہتے مگر دوسریوں سے غافل نہ ہوتے خیریت طلبی ضرور کرتے ۔رات باری والی بی بی ہی کے یہاں گزارتے تھے اور اگر اتفاقاً کسی ایسی اہلیہ کے یہاں شب گزارنا چاہتے جس کی باری نہ ہوتی تو خود ان اہلیہ کے گھر جاتے اور اس رات کی اجازت طلب فرماتے تھے، اگر وہ اجازت دیتی تھیں تو دوسری کے یہاں شب باش ہوتے تھے ۔اگر وہ اجازت نہ دیتی تھیں تو آپ دوسری کے یہاں نہ جاتے تھے۔خود بھی ایسے موقع پر آنحضرتؐ کو اجازت نہیں دیتی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس علالت میں جو انتقال تک رہی ،جب چلنا پھرنا چھوڑ دیا اس وقت بھی انصاف وعدالت کی نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے اور اپنا بستر اس حجرے سے اس حجرے میں منتقل کرتے تھے۔آخر ایک دن سب کو جمع کر کے ایک حجرے میں رہنے کی اجازت لی ۔اور حجرہ حضرت عائشہؓ میں رہنے لگے۔

حضرت علیؑ ابن ابیطالب علیہ السلام کے گھر میں جب دو بیویاں تھیں تو امام اس قدر عدل کا خیال فرماتے تھے کہ اگر ایک معظّمہ کی باری ہوتی تو دوسری کے یہاں وضو کرنے بھی نہ جاتے تھے۔

اسلام بجائے خود اس قدر عدالت کا قائل ہے کہ مرد اور اس کی دوسری بیوی کو یہ حق نہیں دیتا کہ شادی کے لیے یہ معاہدہ کرلیں کہ دوسری بیوی پہلی بیوی سے کچھ فرق حقوق کے ساتھ گھر میں رہے گی ۔یعنی اسلام کے نزدیک عدالت،شوہر پر واجب شرعی ہے۔شوہر کسی قبل از وقت شرط کے ذریعے اپنی اصل ذمہ داری سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا ۔عورت ومرد دونوں میں سے کسی کو اس قسم کی شرط متن عقد میں رکھنے کی اجازت نہیں ۔دوسری بیوی صرف عملی طور پر اپنے حق سے دست بردار تو ہوسکتی ہے مگر یہ شرط کرسکتی کہ وہ پہلی بیوی کے برابر حقوق نہ رکھے گی ۔اس طرح پہلی بیوی عملی طور پر اپنی رضا ورغبت سے اپنے حقوق سے دست بردار ہوجائے تو ہوجائے لیکن

قانونی طور پر اپنے حقوق کے بارے میں کوئی ایسا قول وقرار نہیں کرسکتی جس کی رو سے وہ قانوناً محروم ہوجائے۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا گیا:

کیا، مرد اپنی بیوی سے یہ شرط کرسکتا ہے کہ فقط دن کو اس کے یہاں آسکے گا یامہینے میں ایک بار یا ہفتے میں ایک بار رہے گا۔ یا شرط کرلے کہ پورا نفقہ یا فلاں بیوی کے برابر نفقہ اسے نہ دے گا۔ اور یہ بیوی ان شرائط یا ان میں سے کسی ایک شرط کو مان لے؟ کیا حکم ہے؟

حضرتؑ نے فرمایا: نہیں، ایسی شرطیں صحیح نہیں ہیں۔ ہر بیوی عقد ازواج کے بموجب خود بخود ایک زوجہ کے تمام حقوق حاصل کرلیتی ہے البتہ عقد اور حصول حقوق کے بعد ہر بیوی، شوہر کی توجہ اپنی طرف مائل کرنے کے لئے اور یہ کہ اسے طلاق نہ دے، یا کسی اور مقصد کی خاطر اپنے کچھ حقوق شوہر کو ھبہ کرسکتی ہے۔''

ان اخلاقی شرائط کے بعد تعدد ازواج ذریعہ ہوس رانی کے بجائے فرائض وحقوق کی شکل وصورت اختیار کرلیتا ہے۔ شہوت رانی وہوس پرستی کا مطلب ہی مکمل آزادی اور آرزوے دل پوری کرنا ہے۔ ہوس پرستی اس فوقت وجود پذیر ہوتی ہے ،جب آدمی دل کے قابو میں آجائے اور جو دل چاہے وہ کرے ۔۔اور دل پر خواہشات کا قبضہ ہو۔ دل اور خواہشات دل دلیل وحساب قبول نہیں کرتے۔ جہاں نظم وضبط ،قانون قاعدہ فرض کی انجام دہی اور عدل وانصاف کی بات آجائے وہاں ،ہوس آزور اور آزادی خیال کا قدم نہیں آسکتا۔ اس وجہ سے اسلامی پابندیوں کے ساتھ ''تعدد ازواج'' کو ذریعہ ہوس رانی کہنا درست نہیں۔

جو لوگ تعدد ازواج کو ہوس رانی کا ذریعہ مانتے ہیں وہ ایک ناجائز کام کیلئے اسلامی قانون کو بہانہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ معاشرے کو ان کے محاسبے

اور اس غلط بہانے پر سزا دینے کا حق ہے۔

عدل و انصاف کا خوف

انصاف کی بات کرنا چاہیے، تعدد ازواج کی صورت میں اسلامی پابندیوں کے مطابق کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ فقہ اسلام کہتی ہے۔

''اگر ڈرتے ہو کہ پانی کا استعمال جس کو نقصان پہنچا جائے گا تو وضو نہ کرو۔''

اگر خوف ہو کہ روزہ تمہارے لئے ضرر کا باعث ہوگا تو روزہ نہ رکھو۔

فقہ میں یہ دونوں حکم موجود ہیں آپ کو بہت سے ایسے لوگ ملیں گے جو پوچھتے ہیں ۔۔ جناب، پانی کا استعمال مجھے نقصان پہنچاتا ہے میں وضو کروں یا نہ کروں؟ روزے سے خوف ضرر ہے، روزہ رکھوں یا نہ رکھوں؟ یقیناً یہ سوال درست اور برمحل ہیں ایسے اشخاص واقعاً وضو نہ کریں ایسے آدمی ہرگز روزہ نہ رکھیں۔

قرآن مجید کے الفاظ ہیں:

فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَةً

اگر تم کو خوف ہو کہ بیویوں میں انصاف نہ کرسکو گے تو ایک سے زیادہ بیوی نہ رکھو۔ (سورہ نساء۔3)

اس صورت حال میں آپ نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی سے سنا ہے کہ اس نے پوچھا ہو۔ ''میں دوسری شادی کرنا چاہتا اور دوسری بیوی لانا چاہتا ہوں، مگر ڈرتا ہوں کہ برابری وعدالت نہ برت سکوں گا، شادی کروں یا نہ کروں؟ میں نے تو یہ سوال نہیں سنا۔ آپ نے بھی یقیناً یہ بات کسی سے نہ سنی ہوگی۔ ہمارے عوام بیویوں میں عدل و مساوات قائم نہ رکھنے کی نیت کے بعد بھی اگر اسلام اور احکام اسلام کی آڑ

میں کئی شادیاں کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں ۔تو بات صاف ہے۔ یہ لوگ اپنی بدکرادری سے اسلام کو بدنام کرتے ہیں۔

جو لوگ کم از کم اسی ایک پابندی کو پوری طرح نبھا سکتے ہوں تو بلاشبہ وہ تعدداز واج پر عمل کر سکتے ہیں اوران پر کوئی اعتراض بھی نہ ہو سکے گا۔

حرم سرائیں

تعدداز واج کی بنیاد پر اسلام کے خلاف گفتگو کا ایک سبب گزشتہ خلفاء وسلاطین کی حرم سرائیں تھیں عیسائی مشنیر یوں اور کچھ مصنفین نے اسلامی اجازت تعدداز دواج کو ان رسوا کن حرم سراؤں سے جوڑ دیا جہاں کے ظلم وستم کی کہانیوں کا پروپیگنڈا کیا اور اسے اسلام کے سر منڈھ دیا۔

ہمارے مصنفین بھی ان کے ترجمان بن گئے اوران کی تحریروں میں وہی صدائے بازگشت آنے لگی ،وہی الفاظ ،وہی افکار ،اوروہی مقاصد کہ تعدداز واج کا دوسرا نام حرم سرا ہے۔اتنی آزادی فکر بھی انہیں حاصل نہیں کہ تعدداز واج وحرم سرا کا فرق بتا سکیں۔

دوسرے شرائط ولوازمات

عدل وانصاف سے قطع نظر کچھ اور ذمہ داریاں کچھ اورلوازم وفرائض بھی مرد پر عائد ہوتے ہیں۔ بیوی کے حقوق کا ایک سلسلہ اپنی جگہ پھر شوہر سے فائدہ حاصل کرنے کا جواز سب جانتے ہیں۔اس کے بعد اگر اکوئی مرد چند شادی کرسکتا ہے اس کا حوصلہ اور مالی امکانات اسے اجازت دیتے ہیں تو اعتراض کیوں ہے آخر ایک بیوی کیلئے بھی توامکانات مالی پر نظر رکھی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ جسمانی اور طبیعی امکانات بجائے خود ایک شرط لازم ہیں۔

''کافی''اور''وسائل الشیعہ''میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے۔امام نے فرمایا:

جو شخص عورتوں کو جمع کر لے اور انہیں جنسی طور پر مطمئن نہ کر سکے اور وہ عورتیں بدکرداری میں مبتلا ہوں تو اس کا گناہ اس شوہر کی گردن پر ہے۔

حرم سراؤں کی تاریخ اور ان کے بارے میں داستانوں کا چرچا ایسی عورتوں کی نشان دہی کرتی ہیں جو نوجواں اور اپنی جنسی دباؤ میں گرفتار تھیں، وہی بدکرداری کرتی اور بسا اوقات جنگ و جدال کا سبب بنتی تھیں۔

محترم قارئین!

ان سات مقالوں میں ''چنداز دواجی'' کے مسئلے پر جو کچھ میں نے لکھا، اس میں اسباب وعلل اور تعدد ازواج کی بنیاد واضح کی ہے۔اور یہ بات عرض کیا ہے کہ اسلام نے اس دستور کو منسوخ کیوں نہ کیا؟ تعدد ازواج کے شرائط وحدود، دستور اور پابندیاں بیان کی ہیں جن کے بعد یہ دستور منظور کی۔

آپ پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ اسلام نے تعدد ازواج کی منظور میں عورت کی توہین نہیں کی بلکہ اس طریقے سے اس نے جنس خواتین کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔شادی کے قابل عورتوں کی فراوانی اوران مردوں سے زیادتی کی نسبت جو مرد شادی کے قابل ہوں۔۔اور یہ تناسب دنیا میں پہلے بھی اور اب بھی ہے۔ اگر اس معاشرتی مسئلے کو یونہی چھوڑ دیا جاتا تو عورت مرد کیلئے ایک بدترین کھلونا بن کے رہ جاتی۔مرد کا اس کے ساتھ ایک لونڈی سے بھی بدتر سلوک ہوتا۔کیونکہ انسان ایک لونڈی کیلئے بھی کم ازکم قسم کا معاہدہ ایک قسم کی ذمہ داری تو بہرحال رکھتا ہے اس کی اولاد کو اپنی اولاد دوَمانتا ہے۔لیکن معشوقہ اور فرینڈ گرلز سے یہ سلوک بھی نہیں ہوتا۔

آج کا مرد اور تعدد ازواج

آج کا مرد تعدداز واج سے روگردان ہے۔ کیونکہ؟ کیا، اس کا مقصد اپنی پہلی بیوی سے وفاداری ہے۔ یا اس کی خواہش ہے کہ وہ ایک بیوی کے پردے ہر روز نیا مزہ چکھے اور اپنی اس حس کو نہ ختم ہونے والے گناہوں سے آسودگی بخشے؟ آج کل تعدداز واج کی خانہ پری وفاداری و پاک دامنی کے بجائے عیاشی و گناہ گاری نے کر دی اور اسی خاطر آج کا مرد تعدداز واج کی ذمہ داری سے نکل بھاگتا ہے کہ اس میں پابندی اور جواب دہی کا بوجھ ہے اسے کیوں اٹھائے وہ اس سے نفرت کرتا ہے کل کا مرد اگر ہوس رانی کرنا چاہتا تھا تو گناہ کی راہیں اتنی کھلی نہ تھیں، وہ مجبوراً تعدداز واج کے بہانے اپنی خواہش پوری کرنے کی سعی کرتا ہوگا ممکن ہے کہ وہ گھٹیا مقصد ہی شادیاں کرتا ہو اور قانونی ومالی اور اخلاقی پابندیوں سے بچتا بھی ہو، لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ ایک ذمہ داری ضرور اٹھاتا تھا، وہ ان بیویوں کی اولاد کو اپنی اولاد ضرور مانتا تھا۔ آج کا مرد اپنی عیش پرستی کے بعد عوت کی کوئی ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہیں اس کا فائدہ اسی میں ہے کہ تعدداز واج کے خلاف مہم چلائے۔

آج کا مرد سیکرٹیری ،اٹا ئپسٹ ،جیسے ناموں اور کاموں کیلئے خواتین کو جمع کر کے اس سے بیوی کا کام لے۔ پھر مزہ یہ ہے کہ اس کی اجرت اور اخراجات ،حکومت یا کمپنی کی جیب سے ادا کرتا ہے۔ خود اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی صرف نہیں کرتا۔

آج کا مرد مہر و نان ونفقہ کی زحمت وتکلیفات اٹھائے بغیر روزانہ صبح سویرے طلاق کی ضرورت پیش آئے بغیر اپنی محبوبہ بدل لیتا ہے۔ موسیٰ چومبہ ،تعدداز واج کے خلاف ہے۔ اور ہونا بھی چاہئے آخر اس کی نوجواں سیکریٹری ''موبوؑ'' اس کی پہلونشین ہے سال بھر بعد اسے بدل لے ایسے مکانات کے بعد تعدداز واج کی ضرورت بھی کیا ہے؟

تعدداز دواج کے بڑے سخت مخالف ، برٹرینڈ رسل کی سوانح عمری میں پڑھا کہ ۔۔اس کی زندگی کے ابتدائی عہد پر اس کی بڑی ماں کے علاوہ دوسری دوعورتوں کی بڑی چھاپ تھی ایک ''الیس'' (Alys) اس کی پہلی بیوی دوسرے اس کی

دوست ''آٹولین مورل''(Ottolne Morell)مورل اس دور کی مشہور عورت تھی ،بیسویں صدی کے آغاز میں وہ بہت سے لکھنے والوں کی دوست تھی۔مسلماً ایسا شخص ''تعدد ازواج'' کے ساتھ اتفاق نہیں کرتا۔

یہی یار بازیاں تھیں جن کے سائے میں رسل نے اپنی اکیلی بیوی ''الیس ''(Alys)کے ساتھ زندگی تباہ دی۔رسلؔ نے اپنی زبان سے خود اقرار کیا ہے:

کچھ دن بعد سائیکل پر سوار دوپہر کو شہر کے قریب ایک ٹھنڈی بستی جا رہا تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا؟

اب مجھے ''الیس ''(Alys)سے محبت نہیں رہی۔

❁❁❁❁❁❁

ISLAMICMOBILITY.COM
IN THE AGE OF INFORMATION
IGNORANCE IS A CHOICE

"Wisdom is the lost property of the Believer,

let him claim it wherever he finds it"

Imam Ali (as)